Duplicate

سیاست

جلد ۵ | ستمبر ۱۹۴۴ء | شمارہ ۳

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی معاشیات کے چند فقہی اور قانونی ابواب

سراف۔ میرے نزدیک صرف دولت میں مندرجہ بالا اصولی مشورہ کے حدود سے آگے بڑھنا اسراف ہے۔ خواہ "العفو" کے قاعدہ کی خلاف ورزی وہ لوگ یں جن کی آمدنیوں کا ذریعہ "اصل" وسرمایہ ہو یا "قوام" کی راہ چھوڑکر "کل البسط" (اندھادند بچ) کی راہ وہ اختیار کریں جن کو اپنے مصارف میں حکم دیا گیا تھا کہ اعتدال کو حتی الوسع اپنے تمد سے نہ چھوڑیں۔ اور "تبذیر" سے یہ بالکل ایک جداگانہ معاشی قانون ہے۔ تبذیر کے تعلق قرآن سے بتایا جاچکا کہ وہ شیطان کی برادری میں داخل ہونا اور اس کی صفت کفورت بں حصہ دار ہونا ہے۔ اور "اسراف" سے بھی اسلام گو منع کرتا ہے لیکن اس کا نتیجہ اس نے وہ نہیں بتایا جو تبذیر کا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کا انجام یہی ہے جس کا اظہار آن نے

فتقعد ملوما محسورا ۔ پس بیٹھ جاؤگے ملامت زدہ درماندہ ہوکر

سے کیا ہے یعنے وہ تھکا ہارا اور درایا ہوا مایوس اور ماندہ بن کر مسرف بیٹھ جاتا ہے ۔ اور یہ ایک واقعہ ہے جس کا ظہور اسی زندگی میں اور جس کا تجربہ اسی "الحیوۃ الدنیا" میں قریب قریب ہر مسرف کو ہوتا رہتا ہے "العفو" کے قانون کا بھی جہاں قرآن میں ذکر ہے وہاں یہ فرما کر

کذلک یبین اللہ لکم الایات	یوں ہی خدا تمھارے سامنے نشانیوں کو
لعلکم تتفکرون فی الدنیا والآخرۃ	کھولتا ہے تاکہ دنیا اور آخرت میں سوچ بچار کرسکو ۔

ادھر اشارہ کیا گیا کہ قانون "العفو" ایک دنیاوی قانون اور معاشی استحکام کا ایک ذریعہ ہے ۔

یہاں خصوصاً "العفو" کا جو مطلب میں نے بیان کیا ہے اس سے ایک خاص اعتراض کا بھی ازالہ ہوتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ بعض حدیثی روایتوں میں بیان کیا گیا ہے

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لئے
لم یکن یدخر شیاءً لغدٍ	کوئی چیز بسینت کر نہیں رکھتے تھے ۔

اسی طرح بعض تاریخی بیانوں سے معلوم ہوتا ہے

قد کان کثیر من فضلاً الصحابۃ	بڑے بڑے صحابیوں میں بکثرت ایسے حضرات
ینفقون فی سبیل اللہ جمیع	تھے جو اللہ کی راہ میں اپنے سارے مملوکات خرچ
املاکھم ولم ینعھم النبی	کر ڈالتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
صلی اللہ علیہ وسلم	کبھی ان کے اس فعل پر تنبیہ نہیں فرمائی ۔

مثلاً اکثر وعظ کی مجلسوں میں سُنایا جاتا ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ اپنا کل مال چندہ میں لاکر حاضر کر دیا ، جب پوچھا گیا کہ گھر میں کیا چھوڑا بولے اللہ اس کا رسولؐ (او کما یقول القصصہ والوعاظ) ۔ قانون اسراف کی قرآن میں جو مذمت کی گئی ہے اس کو دیکھ کر لوگوں کو شبہہ ہوا اور ہونا چاہئے تھا ، عموماً اس کا جواب یہ

یا گیا ہے کہ

ھذا خطاب لغیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم	یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں
(الجصاص)	سے خطاب ہے یعنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
	اسراف کے قانون سے مستثنٰی تھے (اور بعض صحابہؓ بھی)۔

ے بڑے طویل صفحات میں اس پر جو بحث کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ اسرافی قوانین کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو توکل تام اور خدا پر کامل بھروسہ کرنے کی قوت اپنے اندر نہ رکھتے ہوں، باقی جو اس طاقت سے سرفراز ہیں وہ اپنا سارا مال چاہیں تو لٹا سکتے ہیں۔

مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور فضلاء صحابہؓ کے متعلق سب کچھ خرچ کر دیئے کا جو دعوٰی کیا گیا ہے اس کے سمجھنے میں لوگوں نے ذرا تامل سے کام نہیں لیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ " لا یدخر لغدٍ " (یعنے ل کے لئے بچا کر نہ رکھتے تھے) اور پھر حدیث ہی کی کتابوں میں ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جائداد کو جسے یہودیوں کا قبیلہ بنی النضیر مدینہ کے قریب چھوڑ کر جلا وطن ہو گیا تھا

کان للنبی صلی اللہ علیہ وسلم	یہ جائداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خالصہ
خاصتہ ینفق علی اھلہ نفقۃ	جائداد میں شمار ہوتی تھی جس سے اپنے اہل و
سنۃ ویحبس لاھلہ قوت	عیال کے لئے سال بھر کے خرچ کی تکمیل فرماتے
سنتھم وما بقی جعلہ فی الکراع	اور ایک سال کا خرچ روک رکھتے تھے اور
والسلاح عدۃ فی سبیل اللہ	جو باقی بچ جاتا اس کو جہاد کی سواریوں اور
(صحاح ستہ)	ہتھیاروں میں صرف فرماتے اور اللہ کی راہ
	میں جو جنگ ہوتی اس کا ساز و سامان تیار فرماتے۔

اسی طرح فتح خیبر کے بعد جو حصہ آپ کو خیبر سے ملا تھا، اگرچہ بند و بست تو آپ نے یہودیوں ہی کے ساتھ کر دیا تھا لیکن سالانہ جو آمدنی اس سے ہوتی تھی۔ بخاری میں ہے کہ

کان یعطی ازواجہ مائۃ وسق	اپنی بیویوں کو آپ سو وسق عطا فرماتے تھے
ثمانون وسق تمر وعشرون	جن میں اسّی وسق کھجوریں ہوتی تھیں اور بیس
وسق تمر	وسق جو۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جب خیبر کے یہودیوں کا اخراج عمل میں آیا تب حضرتؓ نے ازواج مطہرات سے کہلا بھیجا کہ آیا وہ زمین اور پانی چاہتی ہیں، یا جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کھجور اور غلّہ ملتا تھا، وہی لیتی رہیں گی۔

فمنھن من اختار الارض والماءُ	پھر ان میں بعضوں نے زمین اور پانی کو اختیار
منھن عائشۃؓ وحفصۃؓ واختار	فرمالیا جن میں حضرت عائشہ اور حفصہ
بعضھن الوسق	رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تھیں، اور بعضوں نے
(بخاری ومسلم)	اپنے لئے الوسق (مقررہ پیمانہ کے حساب سے
	غلّہ ہی مقرر کرالیا)۔

ان روایات کے رہتے ہوئے "ماید خرلغد" کا یہ مطلب قرار دینا کہ "جمیع املاک یعنی ہر قسم کی جائداد اور مملوکات کو آپ ختم کردیتے تھے اور کل کے لئے نہیں چھوڑتے تھے" یقیناً صحیح نہیں ہوسکتا۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ ان جائدادوں یا "اصل" سے جو آمدنی ہوتی اسی "فضل المال" یا "العفو" کو آپ اس حد تک خرچ کردیتے تھے کہ کل کے لئے مثلاً کچھ نہ رہ جاتا تھا تو روایات کی توثیق کی بھی صحیح شکل ہوسکتی ہے اور یہی کلیہ ان صحابیوں کے متعلق قرار دینا چاہئے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اپنا سب کچھ لے کر چلے آئے تھے یعنی "آ" اور "فضل المال" کے سلسلہ میں جو کچھ ان کے پاس اس وقت تھا اسے لاکر حاضر کردیتے تھے نہ کہ اپنے باغات، مکانات، زمینوں یا تجارتی پونجی سب کو ختم کردیا کرتے تھے اس قاعدہ کو مان لینے کے بعد تمام روایتوں میں تطبیق ہو جاتی ہے خواہ مخواہ قرآن

لہ۔ وسق ایک عربی پیمانہ ساٹھ صاع کا، اور صاع تقریباً تین سیر کے برابر ہوتا ہے ۱۲

قانون اسراف کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ اس پر نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا اور نہ فضلاء صحابہؓ نے۔

بہرحال "شغل اصل" کی آمدنی والوں کے لئے "العفو" اور بغیر "اصل" کے کمانے والوں کے لئے "قوام" یہی دونوں حدیں "معاشی اعتدال" اور "توازن" کو باقی رکھنے کی اسلامی تدبیریں ہیں۔

چونکہ "قوام" کی واقعی حدبندی مشکل تھی اس لئے اس کے حدود کی تعیین ہر شخص کے اختیارِ تمیزی کے سپرد کردی گئی، لیکن باوجود اس کے جہاں تک میں سمجھتا ہوں بعض ایسی خواہشیں جن کی تکمیل کی اسلام نے مزاحمت نہیں کی ہے ان کی بعض شکلوں کے متعلق اندیشہ تھا کہ عموماً لوگ اختیار تمیزی کو صحیح طور پر استعمال نہ کرسکیں گے اور "قوام" کی حد سے باہر ہو جائینگے اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان جزئیات کو اسلام نے بجائے لوگوں کے سپرد کرنے کے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ کھانے پینے پہننے رہنے سہنے الغرض ان تمام معاشی راہوں میں بعض ایسے معین احکام اسلام میں ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "اسراف" کے قانون کو ان مسائل کی حد تک اسلام نے کچھ حدود بھی متعین کر دیئے ہیں مثلاً شراب ہی کا پینا ہے، یہ صحیح ہے کہ شراب کی ممانعت میں معاشی وجوہ سے زیادہ اخلاقی و اجتماعی اسباب کو دخل ہے۔ قرآن نے خود ہی بعض اسباب کو بیان کیا ہے لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ شراب ہی نہیں بلکہ اس قسم کی تمام نشہ اور چیزوں میں جہاں اور خرابیاں ہیں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ جس کی تعبیر فقہاء

قلیلہ یدعو الی کثیرہ اس کی تھوڑی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے یعنے اس کا مقدمہ بن جاتی ہے۔

سے کرتے ہیں۔ آدمی ابتداءً ان کی قلیل مقدار استعمال کرتا ہے لیکن دن بدن ان کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی چلی جاتی ہے اور بالآخر وہ اشخاص اور خاندانوں کے لئے ایک معاشی دشواری کا سبب بن جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ شریعت اسلامی میں شراب اور شراب جیسی دوسری چیزوں مثلاً سیندھی، بھانگ، گانجہ، افیون وغیرہ کے کھانے پینے کو جو ناجائز ٹھہرایا گیا ہے ان میں علاوہ دیگر اخلاقی و اجتماعی مصالح کے اس معاشی دشواری کو بھی دخل ہے۔ آج دنیا کے تجربات بتا رہے ہیں کہ جن ممالک و اقوام نے ان منحوس چیزوں کو ترک کیا تو تھوڑے دنوں میں ان کی معاشی مصیبتوں میں کمی ہونی شروع ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ظاہر ہے کہ اسلام "لباس" اور "زی" کے مسئلہ میں زینت تک کی اجازت دیئے ہوئے ہے۔ ستر پوشی کے سوا خود قرآن نے "وریشاً" کے لفظ سے نیز "خذوا زینتکم[1] (وای لباسکم) عند کل مسجد" وغیرہ میں لباس کی بڑی غرض زینت ہی رکھی ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ نئے جوڑوں کو پہننے کے بعد فرماتے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے یہ لباس پہنایا جس سے منجملہ اور فوائد کے "اتجمل فی حیاتی" (جمال حاصل کرتا ہوں میں اپنی زندگی میں) مگر لباس کے سلسلہ میں مردوں کے لئے جہاں سونے چاندی کے زیورات حرام کئے گئے ہیں ان ہی کے ساتھ "القسی"[2] "لبس الحریر" کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شائد ان کپڑوں کی ممانعت میں اس نقطہ نظر کو بھی دخل ہو کہ مردوں میں ان چیزوں کے استعمال سے ایک قسم کی نسوانیت اور بیجا نزاکت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر مسلمانوں کا صنف کرخت اپنی کرختگی کی خصوصیت کو باقی رکھتے ہوئے لباس کے اس حصہ سے بچ جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس مذہبی عمل کا اثر ان کے معاشی حال پر بھی

ل۔ ہر سجدہ گاہ کے پاس اپنی زینت کو اختیار کرو، یعنے عربوں کا دستور تھا کہ غیر قریشیوں کو کعبہ کا طواف کپڑوں سے کرنے نہیں دیتے تھے، حق تعالیٰ حکم دیا کہ باضابطہ ڈریس کے ساتھ مساجد میں آیا کرو۔ ۱۲

ع۔ یمن کے ایک ریشمی کپڑے کا نام تھا، اور حریر تو ظاہر ہی ہے اسلام میں مردوں کو ان کپڑوں کے استعمال کی اجازت نہیں۔ ۱۲

نہیں پڑے گا۔ لباس ہی کے سلسلہ میں بعض حدیثوں میں جو یہ آیا ہے

نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم — منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ

ان تستر الجدار — دیواروں پر پردے ڈالے جائیں۔

یعنی "خواہ مخواہ" جیسے آدمی کپڑے پہنتے ہیں دیواروں کو بھی کپڑے پہنائے جائیں جیسا کہ لوگ بے ضرورت پردوں کی بھرمار اپنے مکانوں میں کرتے ہیں اور عرب میں تو اب تک دستور ہے کہ دیواروں کو غالیچوں اور مخملی کپڑوں سے ڈھانک دیتے ہیں گویا غلاف کعبہ کی نقل کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل پر مختلف اوقات میں ناراضی کا اظہار فرمایا۔ ایک واقعہ اس موقعہ پر یاد آیا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے یہاں شادی کی تقریب تھی عورتوں نے شادی والے مکان میں سبز رنگ کے کپڑوں کا غلاف مختلف مقامات پر چڑھایا تھا مہمانوں میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، دیواروں کے اس ڈریس کو دیکھ کر ابن عمرؓ سے آپ نے فرمایا

یا عبد اللہ اتسترون الجدار — عبداللہ کیا تم دیواروں کو بھی کپڑے پہناتے ہو۔

حضرت سالم بن عبد اللہ جن کی یہ شادی تھی ان ہی کا بیان ہے کہ

فقال ابی واستحیا غلبتنا نساءنا ابا ایوب — میرے والد نے فرمایا اور شرمائے ہوئے تھے ابوایوب عورتیں ہم پر (اس معاملہ میں) غالب آگئیں۔

جواب میں حضرت ابوایوب نے فرمایا

من خشیت ان یغلبنہ فلم اخش ان یغلبنک — مجھے اگر کسی کے متعلق اگر یہ اندیشہ تھا کہ عورتیں اس پر غالب آجائیں گی تو مجھے اس کا اندیشہ نہ تھا کہ عورتیں تم پر بھی غالب آجائیں گی۔

اور یہ فرما کر حضرت ابوایوبؓ

لا اطعم طعاماً ولا ادخل لکم بیتاً — میں نہ تمھارا کھانا ہی کھاؤں گا اور نہ تمھارے گھر میں قدم رکھوں گا۔

فرماتے ہوئے واپس چلے گئے۔ اثرم کے حوالہ سے مغنی میں یہ روایت منقول ہے، میں نے قصداً اس کو اس لئے درج کیا کہ ہندوستان میں بھی تقریبات کے تکلفات میں زیادہ دخل عورتوں کے غلبہ ہی کو ہوتا ہے "عورتیں نہیں مانتیں گویا یا قدیم تاریخی فقرہ ہے۔

اسی طرح مکانوں کو تصویروں وغیرہ سے آراستہ کرنے کی اسلام میں جو ممانعت ہے کاش اگر دنیا "تصویر کشی" کے مسئلہ میں اسلام کے مشورہ کو مان لیتی تو علاوہ ان اعتقادی و اخلاقی مصائب کے جو تصویروں کی راہ سے دنیا پر نازل ہوئے یا نازل ہو رہے ہیں ایک بڑا زبردست ذریعہ معاشی بچت کا بھی نکل سکتا تھا۔ آج ان ہی تصویروں کی لعنت ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ کی دولت کا پانچواں حصہ صرف سینما بازی کے نذر ہو رہا ہے اور وہ تو خیر سودخوار ساہوکاروں کا ملک ہے۔ غلام ہندوستان باوجود اپنی فاقہ مستیوں کے آج جتنی دولت تصاویر بینی پر برباد کر رہا ہے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ دیندار نہیں بلکہ دنیا دار حکومتیں اس معاشی غارت گری کی پشت پناہ بنی ہوئی ہیں۔ بخاری و مسلم میں ہے

ان اشدّ الناس عذابا یوم القیمة المصورون — قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب میں مبتلا ہونے والے تصویر کشوں کی جماعت ہوگی۔

اس کے بعد انسداد تصویر کشی کے لئے اور کیا کہا جاتا۔ قلم سے تصویر کھینچی جائے یا کھینچنے کے کسی اور آلہ سے۔ تعجب ہے کہ اس زمانہ میں بعض لوگ فوٹو اور قلم کی تصویر میں فرق کرتے ہیں، حالانکہ قلم والی تصویروں سے وہ معاشی بربادیاں قطعاً بنی آدم پر عائد نہیں ہوئی ہیں جو اس جدید آلہ کی تصویروں سے عائد ہو رہی ہیں۔ اسی سلسلہ کی "چیز" مکان کا مسئلہ بھی ہے۔ قرآنی آیت

استعمرکم فیھا — اور اللہ تعالیٰ نے اسے آدم کے بچو اس زمین میں

تم کو آبادی کا حکم دیا۔

کے متعلق امام ابو بکر جصاص نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں زمین کی عمارت و آبادکاری کا مطالبہ کیا گیا ہے اس لئے "عمارت" کا شمار مطالبات واجبہ میں ہے لیکن کیا اس کی بھی کوئی حد ہے؟ قرآن مجید میں

تتخذون مصانع لعلکم تخلدون	تم ایسی عمارتیں بنا رہے ہو، تاکہ تم اس میں ہمیشہ رہو۔

یا

اتبنون بکل ریع ایۃ تعبثون	تم ہر ٹیلے پر نشانیاں بغیر کسی مقصد کے فضول کھڑی کرتے ہو۔

قوم ثمود و عاد کے ذکر میں

وتنحتون من الجبال بیوتاً فرھین	اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو خوش باشی کرتے ہو۔

وغیرہ کے ذریعہ سے "تعمیری حدود" کی طرف اشارے کئے گئے گویا ایسے مکانات جن سے معلوم ہو کہ بنانے والے شائد ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لئے اسے بنا رہے ہیں جیسا کہ پہلی آیت کا اقتضا ہے یا ایسی عمارتیں یا عمارتوں کے اجزا جن کا کوئی فائدہ نہ ہو اسلام کی نگاہ میں بظاہر ناپسندیدہ نظر آتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مختلف اقوال اسی باب میں پائے جاتے ہیں مثلاً ارشاد ہے

ان المسلم لیوجر فی کل شی ینفقہ	مسلمان جس چیز میں جو کچھ خرچ کرتا ہے
الا فی شی یجعلہ فی التراب	اس میں ثواب ملتا ہے لیکن صرف وہ
(کنز العمال بحوالہ بخاری)	خرچ جو وہ مٹی میں خرچ کرتا ہے۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے

اذا لم یبارک الرجل فی مالہ	جب اللہ کسی کے مال میں برکت نہیں دیتا تو

جعلہ فی الطین والتراب — اس کے مال کو کیچڑ اور مٹی میں خرچ کراتا ہے۔

(کنز) (بیہقی)

کبھی فرمایا جاتا

من جمع مالا من غیر حقہ سلطہ اللہ علی الماء والطین۔ — جو ناجائز ذرائع سے مال اکٹھا کرتا ہے، تو خدا اس کی دولت کو پانی اور کیچڑ میں خرچ کرا دیتا ہے۔ (کنز)

ان تمام روایتوں سے بہر حال تعمیری سلسلہ میں بھی ایک نقطہ نظر اسلام کا معلوم ہوتا ہے کہ حتی الوسع ایک مرنے والے آدمی کو اسی قسم کا مکان بنانا چاہیئے جس سے اس کا جنازہ نکلنے والا ہے باقی اپنی آیندہ نسل کا حیلہ بنا کر لق و دق محلات بنانے والے کیا اتنا خیال نہیں کرتے کہ آخر کتنی پشتوں تک بلکہ زیادہ تر تو بنانے والے کے بعد ہی ورثہ کے ہاتھ کا وہ ایک جوتہ بن جاتا ہے۔ ماسوا اس کے مکان میں "تفاخر" کے جذبات کی کارفرمائی زیادہ موثر انداز میں شروع ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب مدینہ منورہ میں ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مکان میں کچھ کنگروں کا اضافہ فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ادھر گزر ہوئی دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ فلاں صاحب کی یہ جدت ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہو گئے، صحابیؓ جب آئے تو ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی ان کو محسوس ہوا معلوم ہوا کہ تمھارے مکان کی ان جدت طرازیوں کو دیکھ کر حضورؐ کو تنغض ہوا ہے۔ صحابیؓ اسی وقت اُٹھے اور جا کر گرا دیا۔ دوبارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے جب گزر ہوا اور مکان کی اس حالت کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ انھوں نے اس کو گرا دیا تو ان کی آپ نے تحسین فرمائی۔ مقصد یہ تھا کہ اگر مکانوں میں جدت طرازیوں کا یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر کہیں رہ کر اں ندار د۔ واقعہ یہ ہے کہ جس ملک و قوم، شہر و دیہات میں یہ عارضہ پھیلا ہے اس نے بالآخر شہریوں کو بدترین معاشی پیچیدگیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

صحابہ کرام اور بعد کو علماء اسلام نے بھی اس باب میں اس حد تک غلو کیا ہے کہ

مساجد تک میں تزخرف اور رنگ سازی اصفرار واحمرار یعنے زرد وسرخ سے رنگنے تک کو ناپسند کیا۔ حتیٰ کہ حکومت کے روپے کو قدر ضرورت سے زیادہ مسجدوں میں لگانے کی بعض فقہاء نے ممانعت کردی تھی کہ وہ مسلمانوں کا حق ہے لیکن بعد کو علماء نے "شوکتِ اسلام" کے نقطۂ نظر کو قایم کرکے خصوصاً جب امراء کے مکانات بڑے بڑے بننے لگے اور قرآن کی آیت "فی بیوت اذن اللہ ان ترفع" کے تحت اس کی اجازت دیدی ہے[1] حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب مسجد نبوی میں نقش و نگار والے پتھروں اور ہندوستانی ساگوان کی شہتیریں پہلی دفعہ استعمال کیں تو اس کا صحابہؓ میں بڑا چرچا ہوا بخاری میں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اس حدیث سے جس میں ہے کہ جیسی مسجد آدمی دنیا میں بنائے گا۔ اسی کی مثل جنت میں اس کو عمارت ملے گی، لوگوں کی تسلی کی کہ اگر معمولی حیثیت کی مسجد بنے گی تو اسی حیثیت کا مکان جنت میں ملے گا۔ بہرحال کچھ بھی ہو اس زمانے میں خواہ اس کو ارتقاء تمدن اور عروج عمران کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہو لیکن میرے خیال میں عام باشندوں کی معاشی حالت کا اندازہ کرکے اسلام نے مکان کے مسئلہ میں لوگوں کی بہت کم ہمت افزائی کی ہے۔ اگرچہ مسلمانوں نے اسلام کے اس معاشی "مشورہ" پر زیادہ توجہ نہ کی۔ اور ہوا جو کچھ ہوا۔

---

[1] آیت قرآنی سورۂ نور سے منقول ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ان گھروں میں اللہ کے جن کے متعلق اللہ نے اجازت دی ہے کہ وہ بلند کئے جائیں۔"

[2] علامہ ابن المنیر فرماتے ہیں لما شید الناس بیوتھم و زخرفوھا ناسب ان یصنع ذلک بالمساجد صونا لھا عن الا ستھانۃ (یعنے جب لوگوں نے اپنے گھروں کو پرشوکت اور آراستہ پیراستہ کرنا شروع کیا تو مناسب معلوم ہوا کہ بے عزتی اور ذلت سے بچانے کے لئے مساجد کے ساتھ بھی اسی طرز عمل کو روا رکھا جائے) فتح الباری صفحہ ۴۶۳ ج ۔

یہاں ایک بات قابل ذکر یہ ضرور ہے کہ تعمیرات کے متعلق با وجود اس نقطۂ نظر رکھنے کے پھر بھی اسلام اس کا حامی ہے کہ جتنی بھی عمارت بنائی جائے صرف استحکام واستواری ہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ جمالیاتی حیثیت سے خواہ مخواہ اس کی ضرورت نہیں کہ بلا وجہ مکان کی شکل بھونڈی بنادی جائے یا اینٹ، چونے، پتھر، گارے کے استعمال میں قصداً بدسلیقگی برتی جائے۔مسجد نبوی حالانکہ تکلفات سے پاک کرکے بن رہی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص کرکے اس کے لئے اینٹیں ڈھلوائیں جن سے مسجد بھی بنی، اور حجرات مبارک کی تعمیر بھی ان ہی اینٹوں سے ہوئی۔ مسجد نبوی جس وقت بن رہی تھی تو طلق بن علی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو یمامہ (نجد) کے رہنے والے تھے جہاں کی تعمیری حالت حجاز سے بلند تھی، وہ بھی کام کرنے والوں میں شریک تھے۔ ان کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فرماتے

قربوا الیمامی من الطین فانه احسنکم له مسّا واشدکم له سبکا (مسند احمد)

اس یمامی کے پاس گارا لے جاؤ، کیوں کہ وہ ملنے دلنے اور ڈھالنے میں سب سے اچھا ہے۔

طلق کہتے ہیں کہ میں کدال لے کر مٹی اور پانی سے گارا بنا رہا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے طرز عمل کو دیکھتے اور فرماتے کہ

دعوا الحنفی والطین فانه اضبطکم للطین (رواہ ابن حبان)

گارے کے معاملہ کو اور اس حنفی (بنی حنیفہ سے چونکہ تعلق تھا) چھوڑ دو کیونکہ گارا بنانے میں یہ سب سے زیادہ استوار و ہوشیار ہے۔

طلق نے پھر چاہا کہ دوسرے صحابیوں کے ساتھ اینٹوں کے ڈھونے میں شرکت کریں۔ اجازت چاہی ارشاد ہوا

لا اخلط لهم الطین (ابن حبان)

نہیں تم تو گارا بناتے چلے جاؤ۔

یہاں ایک خیال یہ بھی گزرتا ہے کہ "اسلام" میں "مقابر" کے متعلق جو یہ حکم پایا جاتا ہے یعنے

نھی رسول اللّٰہ صلی علیہ وسلم	منع فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
عن تجصیص القبور والبناء	قبروں کو گچ کرنے سے اور یہ کہ ان پر
علیھا (صحیح مسلم)	مکان بنایا جائے ۔

علماء اسلام اگرچہ اس امتناعی حکم کی مصلحت عموماً یہی لکھتے ہیں جس کی طرف وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مشہور فقرہ

لعن اللّٰہ الیھود والنصاریٰ	یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو،
اتخذوا قبور انبیاء ھم	انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو
مساجد (بخاری)	سجدہ گاہیں بنالیں ۔

میں اشارہ فرمایا تھا لیکن اسی کے ساتھ اگر مسلمان اس حکم کو تعمیری کاروبار کے سلسلہ کا ایک معاشی مشورہ بھی قرار دیتے تو خدا ہی جانتا ہے کہ ان کی کمائی ہوئی دولت کی کتنی بڑی مقدار ایک ایسے کام میں صرف ہونے سے بچ جاتی جس سے نہ زندوں کو نفع پہنچا اور نہ بیچارے دفن ہونے والوں ہی کا اس میں کچھ فائدہ ہوا بلکہ پختہ عمارتوں اور سنگین قبروں کی وجہ سے خدا کی زمین کا آج جتنا بڑا حصہ بے کار رکا ہوا ہے غالباً اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء مبارک کی تعمیل کی صورت میں واقعہ کی یہ نوعیت بہت کچھ بدلی ہوئی ہوتی ۔

گر باوجود اس حکم کے اسلام کا جمالیاتی نقطہ نظر جیساکہ پہلے بھی ذکر ہوچکا ہے قبروں تک میں باقی رہا ہے ۔ پہلے بھی چند حدیثیں اس باب میں درج ہوچکی ہیں، ایک اور حدیث جو قریب قریب ان ہی حدیثوں کے ہم معنی ہے یہاں بھی تبرکاً درج کرتا ہوں ۔ روایت یہ ہے کہ کسی قبر میں جو لبن (کچی اینٹیں) لگائی گئی تھیں درمیان میں کچھ خلا باقی رہ گیا تھا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ

مسد داخلال اللبن اما ان — اینٹ کے درمیان جو شگاف رہ گیا ہے اسے
ھذا لیس بشیٔ ولکنہ یطیب بنفس — بند کر دو، اگرچہ یہ ہے تو کچھ نہیں، لیکن زندہ
الحی (کنز العمال) — کے نفس کو اس سے راحت ہوتی ہے۔

"یطیب بنفس الحی" کا یہی مطلب ہے کہ زندوں کے جی کو بھلا معلوم ہوتا ہے اور یہی تو جمالیات کی روح ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ عہد تنزل دنیا ہی میں بھی اسلامی گھرانوں میں مختلف ذرائع سے جو آمدنیاں آتی ہیں اگر اس دولت کے صرف کرنے میں مسلمان تبذیر اور ریاءالناس جیسے مذموم فعل سے بچتے ہوئے مسلمانوں کے "اصل دار" "العفو" کے قانون پر اور محنت و مزدوری کرنے والے "قوام" کے نظریہ پر تھوڑا بہت بھی عمل پیرا ہوں اور ساتھ ہی مرد اپنے اوپر سونے چاندی کی چیزوں کو ریشمین لباس کو اور تیسری مقابلہ بازیوں کو ترک کرکے اگر اب بھی اپنے آپ کو حد اعتدال میں رکھیں تو عموماً ذرائع معاش سے محروم ہونے کے باوجود قوموں کے درمیان اتنے ہلکے نظر نہ آتے جتنے اب نظر آتے ہیں۔

اگرچہ انصاف کی ایک بات کا مجھے پھر بھی اعتراف ہی کرنا چاہیئے کہ "اسلام" کے دیئے ہوئے پروگرام سے مسلمانوں کا اتنے دُور ہونے کے باوجود عہد تنزل و انحطاط میں بھی زندگی کے معاشی شعبوں میں ایک خاص حال ہے جس کا اندازہ قوموں سے مقابلہ کرنے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت قابل لحاظ دنیا میں تین ہی قسم کے تمدن ہیں ایک یورپ والوں کا ہے اس کے مقابلہ میں ایک تمدن وہ بھی ہے جو خاص مظاہر و آثار کے ساتھ ہمارے ملک کی ایک بڑی آبادی پر طاری ہے یعنے ہم جسے ہندوستانی تمدن کہہ سکتے ہیں، اور تیسرا تمدن مسلمانوں کا ہے ان تینوں تمدنوں کا جب بطور مقابلہ کے موازنہ کیا جائے تو ایک عجیب بات یہ نظر آتی ہے کہ باوجود انتہائی بے اعتدالیوں کے پھر بھی نقطۂ اعتدال سے اگر کچھ قریب ہیں تو مسلمان ہی ہیں۔ تفصیل کا تو موقع نہیں لیکن

چند مثالوں سے اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے ۔

کھانے ہی کے مسئلہ کو لیجئے، ایک مغربی ڈنر کے لئے آپ کو آلو کی ایک ایک قاش اور گوشت کے ہر ہر تکے کے لئے الگ الگ پلیٹوں کی ضرورت ہے۔ گویا ایک اوسط درجہ کا ڈنر جس میں آٹھ دس آدمی سے زیادہ کھانے والے نہ ہوں، جہاں تک میرا خیال ہے کم از کم پندرہ بیس پلیٹوں اور اسی مقدار میں چھری کانٹوں و دیگر لوازم دست شوئی وغیرہ کی ضرورت ہے، اس کے مقابلہ میں ایک اور قوم اسی ملک میں پائی جاتی ہے جو بیسویں صدی عیسوی میں بھی صرف کیلے اور ڈھاک کے پتوں کو اپنی رسوئی جمانے کے لئے کافی سمجھتی ہے ۔ شاذ و نادر شکل میں نہیں بلکہ اب بھی بڑی بڑی تقریبوں میں رسوئی پتوں پر جمائی جاتی ہے اور یہ تو اعلیٰ اور متوسط طبقہ کا حال ہے باقی ادنیٰ طبقوں میں تو یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ زمین میں گڑھا کھود کر اس میں دال سالن ڈال دیا جاتا ہے اور بخوشی ہاتھ کے چمچوں سے ان کو نکال کر نوش جان کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اگر ان استثنائی قوانین پر نظر ڈالی جائے جن کی وجہ سے لحمیات و تندیات (پیاز، لہسن) وغیرہ کے مصارف سے یہ بے نیاز ہیں یہی حال رہنے سہنے کے مکانوں کا ہے ۔ ایک مغربی جوڑے کے لئے کم از کم چھوٹے سے چھوٹے مکان میں اتنی گنجائش ہونی چاہیئے اور اتنے کمرے نکلنے چاہئیں تاکہ ڈرائنگ روم، بڈ روم، باتھ روم اور بھی چند روموں اور ان کے ساتھ کچن، اوٹ ہوسنر کی ضرورت ہے، گویا آٹھ دس کمروں کے بغیر انسانوں کا ایک جوڑا بھی کسی طرح گذر نہیں کر سکتا۔ اسی کے مقابلہ میں ایک قوم وہ بھی ہے جو افلاس و غربت کی وجہ سے نہیں کیونکہ غربت و افلاس میں آج مسلمانوں کا مدمقابل کون ہو سکتا ہے بلکہ اپنے قومی خصوصیات کی بنیاد پر ان کی اکثریت چند خاندانوں کے ساتھ جسے (اجمالی خاندان) کہتے ہیں ایک ایسے مکان میں بآسانی گزر کرتے ہیں جن میں بمشکل دو تین کمرے بھی رہنے کے قابل ہوں ۔ دیوار کا کام زیادہ تر رات کی تاریکی سے لیا جاتا ہے، ایک ایک تخت پر پورا خاندان میاں، بیوی، بہو، بیٹے، داماد اور بیٹی کے ساتھ بسر کرتے ہیں ۔

لباس میں مغربی اقوام کی اگر یہ حالت ہے کہ ہر وقت اور ہر قسم کی تقریب کے لئے خاص وضع خاص قطع اور خاص رنگ کے سوٹ کی ضرورت ہے۔ ایک ایک شخص کے ٹرنک میں اسی لئے پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ جوڑے مختلف اوقات و تقریبات کے لئے محفوظ رہتے ہیں۔ صرف جوتے خانوں میں مختلف شکلوں، رنگوں کے جوتوں کی قطار اندر قطار نظر آتی ہے۔ چھڑیوں کے گٹھے کونوں میں رکھے ہوتے ہیں۔ مغرب کے مقابلہ میں مشرق کی مدمقابل قوم کا حال اسی سے ظاہر ہے کہ نوے فی صدی اس قوم کے افراد جوتوں سے بے نیاز ہیں۔ لباس میں بمشکل چند کرتے، دھوتیاں زیادہ تر ایک سے بمشکل زیادہ۔ اچھے اچھوں، کھاتے پیتوں کے پاس آپ کو ملیں گی۔ بیسویں صدی میں اب تک سلائی اور کتر بیونت کے جھگڑوں سے ان کی اکثریت بے نیاز ہے۔ بستر سے میں توشک، تکیہ، چادر کی ضرورت حذف کردی گئی ہے، کوئی معمولی دری یا کمبل ان تمام ضرورتوں کی قائم مقامی کے لئے موجود ہے جو گرمی، برسات، جاڑے میں کسی انسان کو پیش آسکتی ہیں۔

الغرض خوراک، مکان، لباس صرف ان ہی چند شعبوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو بلا مبالغہ ان میں ایک قوم ثریٰ میں اور دوسری ثریا، یا ایک آکاش اور دوسری پاتال میں کھڑی نظر آتی ہے۔ اب ان ہی دونوں کے ساتھ مشرق و مغرب کے مختلف علاقوں میں ایک وہ قوم بھی رہتی ہے جو اپنے پیغمبر کی زبان مبارک سے "اُمت وسطاً" کے آسمانی لقب سے ملقب ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا اس "وسطیت" کا مغز تو مدت ہوئی اس قوم سے نکل چکا ہے لیکن اس وقت تک جو چھلکا اس تعلیم کا ان کی زندگی کے مختلف قالبوں پر چڑھا ہوا ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کھانا ہو یا پینا، پہننا ہو یا رہنا زندگی کے ان تمام معاشی شعبوں میں ہر منصف مزاج آدمی کو مختلف جہات سے اب بھی نسبتاً وسط ہی میں یہ قوم کھڑی نظر آسکتی ہے، نہ مسلمانوں کو ایک ایک معمولی ڈنر کے لئے چالیس چالیس پلیٹوں اور ساٹھ ساٹھ، ستر ستر چھری کانٹوں کی ضرورت ہے اور نہ وہ اتنے پست ہیں کہ پتوں میں کھاتے ہوں۔ پیتل کی جو تھالی وا دانے چھوڑی ہو اسی میں پوتے کی بھی رسوئی جھتی ہو نہ ہر کام

کہ نہ ان کو الگ الگ مکان اور مرصع کمرہ کی ضرورت ہے اور نہ ان کا یہ حال ہے کہ ایک ایک کوٹھری میں تین تین پشت تک پیدا ہوتے اور مرتے چلے جاتے ہیں، نہ ہر وقت اور ہر تقریب کے لئے ان کو الگ ٹائی الگ کوٹ علحدہ پتلون، نئے قسم کے جوتے کی ضرورت ہے" اور نہ وہ ایک ایک جوڑے، بن سلی دھوتی میں پورا سال بسر کرنے کے عادی ہیں۔ نہ وہ شراب اور دستور کی چربی کھا کھا کر اعصابی ہیجانوں کو اپنے قابو میں رکھنے سے عاجز ہیں" اور نہ صرف دال بھات اور گھاس پات کھا کھا کر انسانیت کے بعض قیمتی عناصر کو ضائع کر رہے ہیں۔ میں نے یہ چند مثالیں صرف تفہیم کے لئے دی ہیں ورنہ میرا دعویٰ ہے کہ اتنے دُور ہو جانے کے باوجود بھی بحمد اللہ مسلمان اپنے "دین وسط" کے بچے کھچے اثرات کے نتائج سے اب بھی خالی نہیں ہیں۔ اس سے توقع پیدا ہوتی ہے کہ اگر معاشیات کے صحیح نظام کو موجودہ زمانہ کی تعبیروں میں ان کے سامنے پیش کیا جائے جو ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو وراثت میں ملا ہے اور بجائے سینوں کے اب صرف سفینوں میں باقی رہ گیا ہے" اور وہ بھی ایسے لباس میں کہ تعبیرات کی تبدیلیاں ان کی حقیقی قیمتوں تک نگاہوں کے پہنچنے میں مزاحم ہوتی ہیں۔ تو غالباً جتنی آسانی کے ساتھ اس قالب میں آپ کو وہ ڈھال سکتے ہیں دوسری قوموں سے کامیابی کے ساتھ اتنی توقع نہیں کی جا سکتی

ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً   شاید اس کے بعد حق تعالیٰ کوئی نئی بات پیدا کریں۔

"صرف دولت" کی بحث جس کے تذکرہ میں عمداً مجھے انتہائی اجمال سے کام لینا پڑا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو اب مقالہ مقالہ نہیں کتاب بن جاتی، اب اسی نقطہ پر اس کو ختم کرتا ہوں لیکن ختم کرنے سے پہلے اسی "صرف دولت" کے ایک قرآنی قانون کا تذکرہ اس سلسلہ میں ضروری معلوم ہوتا ہے اور اسی مسئلہ پر سے اس مقالہ کا انشاء اللہ خاتمہ ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا دولت کمانے کے متعلق اسلام نے جہاں چند قیود و شرائط عائد

گئے ہیں "صرف دولت" کے متعلق بھی اس نے کچھ حدود اور نشانات مقرر کر دیئے ہیں ان ہی حدود و نشانات کی تعبیر تبذیر و اسراف، "قانون العفو" "قانون قوام" مسئلہ ریا الناس وغیرہ سے بظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں صرف دولت کے ان قوانین کی حیثیت صرف دینی مسائل کی ہے، یعنی جو ان کی پابندی کرے گا خدا کی خوشنودی حاصل کرکے آخرت میں مستحق ثواب واجر ہوگا، جو خلاف ورزی کرے گا خدا کے عتاب اور عتاب کی مجازاتی دمکافاتی نتائج میں مبتلا ہوگا گویا خدا اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے۔ دوسروں کو یا حکومت کو مال اور صاحب مال کے متعلق کسی دخل اندازی کا حق نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو وعظ و پند کے ذریعہ سے روکا جائے یعنی نہی عن المنکر کے عام قانون کے تحت اگر کوئی تعرض کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام اسی پر قناعت کرلیتا تو دوسرے مذاہب و دیانات کے جو رجحانات دنیا اور دولت دنیا کے متعلق عام طور سے پائے جاتے ہیں: مثلاً

دولت مند کا آسمانی بادشاہی میں داخل ہونا
مشکل ہے۔ متی باب $\frac{19}{23}$

اور صرف مشکل ہی نہیں بلکہ

تم سے پھر کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے
میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند
خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔ متی باب $\frac{19}{24}$

اور غلط سمجھا گیا یا صحیح لیکن باور یہی کرایا گیا کہ جہاں تک روپے پیسے کے سانپ بچھوؤں کو اپنے گھر سے باہر کوئی نکال سکتا ہو نکالے اور مایہ کے اس جنجال کو جتنی قوت کے ساتھ توڑ سکتا ہو توڑے مایہ ہی سے نہیں بلکہ اپنے اندر سے بھی جو مال و دولت کی تمنا اور آرزو کو نکالے گا وہی "نروانا" کا مستحق ہوسکتا ہے[1]۔ مشرقی و مغربی مذاہب وادیان میں جب عام طور سے دولت

---

[1] مذکورہ بالا نظریات مسیحیت (دین مغربی) ویدک دھرم بودھ ازم (مشرقی مذاہب) کے اساسی نظریات کی طرف اشارہ ہے ۱۲

کے متعلق یہ خیال مسلما تھا اس وقت قرآن کا دولت کی حفاظت اور صحیح استعمال کے لئے اجمالی ہی نہیں بلکہ تفصیلی رنگ میں ایک مستقل نظام پیش کرنا اس کی تعلیم کی اختصاصی بلندیوں کے ثبوت کے لئے کافی تھا۔

مگر جو دین اپنی کاملیت کا مدعی ہے اور اپنے بعد اس نے دنیا کو آئندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کسی جدید پیغام اور نئے نظام کے پیش ہونے سے مایوس کر دیا ہو اس کے تکمیلی و اختتامی کام کو صرف اسی نقطہ پر ٹھہرنا نہ چاہیئے تھا اور یہی واقعہ بھی ہے کہ وہ نہیں ٹھہرا ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح بہت سے اخلاقی اور اجتماعی جرائم کو دینی حیثیت سے گناہ یا حرام قرار دیتے ہوئے اس کو حکومت کا جرم بھی قرار دیا ہے اور ان پر دار وگیر اسلامی حکومت کا فریضہ ٹھہرایا ہے، مثلاً زنا، چوری، قتل کے لئے اس نے باضابطہ قانونی سزائیں مقرر کی ہیں اور یہ چیز اسلام کی خصوصیت نہیں ہے لیکن حیرت اس پر ہے کہ ان اخلاقی و اجتماعی جرائم کے ساتھ غالباً اسلام ہی پہلا مذہب ہے جس نے معاشی جرائم کو بھی حکومت کا جرم قرار دے کر باضابطہ اس کے لئے قانونی سزا تجویز کی ہے۔ اسلام میں معاشیات اور معاشیاتی مسائل کو کتنی اہمیت حاصل ہے منجملہ دیگر شواہد کے ایک بڑی دلیل اس کا یہ طرز عمل بھی ہو سکتا ہے۔

فقہ یا حدیث میں نہیں بلکہ باضابطہ قرآن مجید میں اس کے متعلق ایک "قانون" عطا کیا گیا اور یہ وہی قانون ہے جسے ہم "سورہ النساء" کی اس آیت میں پاتے ہیں۔ ارشاد ہے

ولا تؤتوا السفهاء اموالكم التي — اور کم عقلوں کو اپنے اموال حوالہ نہ کرو جن میں

جعل الله لكم قياماً — خدا تمہارے تھاؤ کی قوت رکھی ہے۔

بظاہر مندرجہ بالا آیت میں مسلمانوں کو اسی طریقہ سے خطاب کیا گیا ہے جس طرح "سرقہ" کی سزا کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا گیا

السارق والسارقة فاقطعوا ايديهما — چور اور چورنی، پس کاٹ دو ان کے دونوں ہاتھ۔

یا زنا کے متعلق

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما — زنا کرنے والی، زنا کرنے والے پس کوڑے مارو ان میں ہر ایک کو۔

وغیرہ میں خطاب گو عام مسلمانوں کو ہے لیکن عملی تکلیف مسلمانوں کی اس سیاسی اور اجتماعی قوت کو ہے جو تعزیر و حدود و قصاص کو نافذ کر سکتی ہو یعنی مسلمانوں کی حکومت مخاطب ہے۔ ٹھیک اسی طریقہ سے مندرجہ بالا آیت میں حکم دیا گیا۔

کہ اموال خواہ وہ انفرادی طور پر کسی کی ملک میں ہوں لیکن جب ملک کی وہ دولت ہے تو سارے باشندگان ملک کا وہ مال اس لحاظ سے ہے کہ اس کی حفاظت و نگرانی کی جائے اور اس لئے حکم دیا گیا کہ اس مال کو ایسے لوگوں کے حوالہ نہ کرو جو "السفھاء" ہوں "السفھاء" سفیہ کی جمع ہے۔ سفیہ کا مادہ سفہ ہے سفہ کی تعریف اسلامی قانون میں یہ کی گئی ہے

السفہ نوعان احدھما لخفۃ فی العقل وکان بسببہ التقلب لا یھتدی الی التصرفات — سفاہت کی دو قسمیں ہیں، ان میں ایک قسم تو وہ ہے کہ کسی کی عقل میں ضعف اور ہلکا پن ہو، اور اس کی وجہ سے اس کا دل صحیح تصرفات کی طرف راہنمائی نہ کرتا ہو۔

(تکملہ بحر الرائق ج ۸ ص ۶)

یہ تو سفہ کی پہلی قسم ہوئی

والثانی ان یکون سفیھا مضیعا لمالہ اما فی الشر بان یجمع اھل الشر والفساد فی دارہ یطعمھم ویسقیھم یصرف باب الجائزۃ والعطاء علیھم — دوسری قسم وہ ہے کہ وہ ایسا سفیہ و نادان ہو جو اپنا مال برباد کرتا ہو خواہ پینے پلانے میں مثلاً پاجی بدمعاش لوگوں کو اپنے گھر میں جمع کرے انھیں کھلائے پلائے اور انعام و اکرام کے دروازے ان پر کھولے۔

(تکملہ بحر الرائق ج ۸ ص ۶)

گویا پہلی صورت "اسراف" کی ہوئی اور دوسری صورت "تبذیر" کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا یہ حکم ہے کہ ملک کا جو باشندہ مندرجہ بالا معاشی عوارض میں مبتلا ہو جائے اور تصرف دولت کے مقررہ قوانین سے تجاوز کر رہا ہو تو ان کے اختیار سے ان کا مال لے لیا جائے لیکن کون لے اور لینے کے بعد پھر ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے چونکہ اس حکم کی مخاطب حکومت ہے اس لئے اس کا فقہاء اسلام نے یہی مطلب لیا ہے کہ حکومت محکمۂ عدالت یعنی محکمۂ قضاء کے ذریعہ ان کے مال کو اپنے چارج میں لے لے اور ان پر نگرانی قائم کر دے۔ اصطلاحاً حکومت کے اس فعل کو اسلامی قانون میں "الحجر" کا قانون کہتے ہیں بحرالرائق میں ہے کہ مذکورہ بالا صفات جس شخص میں پائے جائیں

فیحجر علیہ القاضی — اس پر حجر کا قانون عائد کر دے۔

(ص۹۱)

لغت میں "حجر" کے معنی روکنے کے ہیں لیکن قانونی اصطلاح میں حکومت کے اس حکم کی تعبیر ہے جس کے بعد "قولی و فعلی تصرفات" اور کاروبار پر کسی کے قانونی روک عائد کی جائے "السفہا" پر حجر کا قانون جب نافذ کیا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ

فلا ینفذ بیعہ و شراءہ و ہبتہ و	اس کی خرید و فروخت، لین دین، ہبہ صدقہ
صدقتہ وما اشبہ ذلک من	اور ایسے سارے تصرفات جن میں شکست و
التصرفات التی تحتمل النقض	فسخ کی گنجائش ہو، نافذ نہیں ہوتے۔

والفسخ بدائع ج ۷ ص ۱۷۱

ایسا آدمی فقہی اصطلاح میں "محجور" کہلاتا ہے "سفاہت" کی جو تعریف پہلے بیان کی گئی اگر ان ہی صفات کے ساتھ کوئی سن بلوغ کو پہنچ جائے اور سفاہت کے صفات پھر بھی اس میں پائے جاتے ہوں تو تمام آئمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ حکومت اس پر "حجر" کا قانون عائد کر کے اس کے مال اور جائداد کو اپنی نگرانی میں لے لے اور جب تک "رشد" کا احساس اس سے نہ ہو مال پر تصرف نہ عطا کیا جائے۔

صاحب بحرالرائق لکھتے ہیں

وهذا عند الامام وعندهما لا يرفع اليه ماله حتى يونس منه الرشد ولا يجوز التصرف منه ابداً ص۱۲۔	یہ امام صاحب کا مذہب ہے اور ان کے دونوں تلامذہ (محمد و ابو یوسف) کا خیال ہے کہ جب تک رشد کا احساس اس سے نہ ہو اس کا مال اس کے تصرف میں نہ دیا جائے اور نہ تصرفات کی اس کے جائز ہوں گے۔

اور یہ ضابطہ قرآن کی آیت

حتیٰ آنستم منهم رشداً	جب تک ان سے "رشد" کے آثار تم پر ظاہر نہ ہوں۔

سے ماخوذ ہے البتہ "رشد" کے معنی میں اختلاف ہے۔ لغوی معنی اس کے تو "سوجھ بوجھ" کے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ عمر کے ساتھ اس کو وابستہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

يمنع عنه ماله الى خمس و عشرين سنته (بدائع)	اپنے مال سے وہ پچیس سال کی عمر تک روکا جائے گا۔

لیکن ان کے دونوں "تلامذہ" قاضی ابو یوسف امام محمد بن حسن بجائے عمر اور سن کے "رشد" کے واقعی علامات پر "قانون حجر" کے ارتفاع کو مبنی سمجھتے ہیں یعنی خواہ اس کی عمر کتنی ہی کچھ ہوگئی ہو لیکن جب تک سفاہت کے علامات اس میں پائے جائیں گے "حکومت" "حجر" کو باقی رکھے گی اور مال و جائداد اس کے سپرد نہیں کی جائے گی۔ ہدایہ میں ہے

وقالا لا يدفع اليه ماله ابداً حتى يونس رشده، ولا يجوز تصرفه فيه (کتاب الحجر)	دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مال اسے کبھی نہ حوالہ کیا جائے گا جب تک اس سے رشد کے آثار کا پتہ نہ چلے، اور نہ اس کے تصرفات جائز ہوں گے۔

یہ تو اس وقت ہے جب سفاہت کی صفات کے ساتھ کوئی بالغ ہوا ہو لیکن بالغ جس وقت

ہوا تھا اگر اس وقت اس کی حالت اچھی تھی پھر بُری صحبتوں یا کسی اور وجہ سے سفاہت کے کام کرنے لگا تو اس وقت امام ابوحنیفہ اگرچہ "حجر" کی ضرورت محسوس نہیں کرتے لیکن ان کے دونوں شاگرد محمد بن حسن و قاضی ابویوسف، امام شافعی سب کے سب قائل ہیں کہ "حجر" کے تحت بزور لایا جائے گا، ہدایہ کا متن ہے

قال ابویوسف ومحمد وهو قول الشافعی الحجر علی السفیه ویمنع من التصرف فی ماله	قاضی ابویوسف، امام محمد اور یہی امام شافعی کا قول ہے کہ اس قسم کے سفیہ پر بھی حجر کا قانون لگایا جائے اور اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دیا جائے گا۔

تکملہ بحر الرائق میں فتاوی بزازیہ سے نقل کیا ہے کہ حجر کے تحت

السفیه والمغفل والمدیون علی قولهما وعلیه الفتوی کما فی البزازیه ص۸۹	اسفیہ اور مغفل (بدحواس) اور مقروض سب پر حجر کا قانون امام محمد و ابویوسف کی رائے کے مطابق عائد کیا جائے گا اسی پر فتوی ہے جیساکہ فتاوی بزازیہ میں ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ ہر قسم کے "سفیہ" پر "حجر" کا قانون اس وقت تک حکومت کو عائد کئے رہنا چاہیے جب تک اس میں سفاہت کے صفات بالا پائے جاتے ہوں۔ علامہ طوری نے سچ لکھا ہے کہ گو "حجر" سزا کی صورت ہے لیکن واقع میں

فی الحجر شفقة علی خلق الله وهی احد طرفی الدیانة والاخر التعظیم لامر الله (ج ۸، ص۸۸ تکملہ بحر)	حجر اللہ کی مخلوق پر مہربانی ہے اور خلق خدا پر مہربانی مذہب کا بڑا حصہ ہے۔ نیز حق تعالیٰ کے احکام (متعلقہ بہ مال) کا احترام ہے۔

مالی تصرفات کی سفاہت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بُرے کام ہی میں اپنا مال برباد کرتا ہو بلکہ فقہاء نے یہاں تک تصریح کردی ہے کہ اگر وہ اپنا مال برباد کرتا ہو

فی الخیرات بان جمع مالہ فی بناء مسجد واشباھہ فیحجر (القاضی : ص۹۱)

نیک کاموں میں بایں طور کہ اپنے کل مال کو جمع کرکے مسجد بنانے لگے یا اسی قسم کی کوئی اچھی بات تو قاضی اس پر بھی حجر کرے گا۔

جو لوگ قرآنی آیت "قل العفو" کی تفسیر کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ اپنے اور اپنے بال بچوں کے ضروری مصارف پر خرچ کرنے کے بعد جو کچھ بچ جائے اس کو خرچ کر دینے کا اس میں حکم ہے ان کو اسلامی قانون کے اس دفعہ پر غور کرنا چاہیئے کہ مسجد تک کے بنانے پر بھی اگر کوئی اپنا سارا مال صرف کر دے گا تو قانون حجر کی رو سے معاشی مجرم قرار پاکر حکومت کی نگرانی میں چلا جائے گا۔ اگر یہ قانون صحیح ہے تو قرآن کے "العفو" پر عمل کرنے والے کو ٹھہار مجرم کیوں قرار دیتے ہیں اور کیسا مجرم جس کے مال و جائداد کو حکومت اس کے قبضہ سے چھین کر اپنی نگرانی میں لے لے اور تمام ملک میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ آئندہ سے اس شخص کے مالی تصرفات مثلاً خرید و فروخت، صدقہ، ہبہ وغیرہ سب ناجائز قرار دیئے جاتے ہیں جو ان سے ایسا معاملہ کرے گا وہ نقصان اٹھائے گا۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مالی تصرفات میں سفاہت کے ارتکاب کرنے والوں پر حکومت کی دراندازی اس پر موقوف نہیں ہے کہ کوئی ان کی سفاہت کے متعلق حکومت میں دعویٰ دائر کرے بلکہ اس دعوے کی مدعی خود حکومت ہوتی ہے۔ محیط سے طوری نے نقل کیا ہے کہ

القضاء بالحجر لیس بقضاء بل فتوی بعدم شرائط القضاء وھی الدعوی والانکار (ص۹۱)

"حجر" کا حکم جو کسی پر دیا جاتا ہے تو یہ قضاء اور فیصلہ نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت فتویٰ کی ہے کیونکہ قضاء کے لئے تو دعویٰ اور انکار دعویٰ کی ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ملک کے باشندوں میں جو شخص بھی صرف دولت کے متعلق سفاہت کے

معاشی جرم میں مبتلا نظر آئے حکومت کا فرض ہے کہ فوراً اس کو طلب کر کے واقعات کی تحقیق کے بعد اس کی جائداد اور اموال کو اپنے قبضہ میں لے لے اور اس شخص کے متعلق عام اعلان کر دیا جائے کہ تمام مالی تصرفات اس کے غیر قانونی ہیں البتہ خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے مصارف کے لئے حکومت اپنے صوابدید سے کچھ معینہ رقم معین کر دے۔ طوری لکھتے ہیں

وینفق علیه وعلی ولده وعلی	حکومت (اسی کی جائداد) سے خود اس پر
زوجته ومن تجب... النفقه	اس کے بچوں پر بیوی پر اور جن رشتہ داروں کا
من ذوی ارحامه من ماله	نفقہ اس پر واجب ہوا خرچ کرے گی کیونکہ
لان احیاء ولده وزوجته	اس کے بچوں اور بیوی کا زندہ رکھنا اسکی
من حوائجه الاصلیه والانفاق	حقیقی ضرورتوں میں سے ہے اور رشتہ داروں پر
علی ذوی الارحام واجب	خرچ کرنا اس کی قرابت کی وجہ سے واجب
علیه حقا لقرابته والسفه لا	ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "سفاہت" سے نہ انسانوں
یبطل حقوق الناس ولا حقوق	کے حقوق باطل ہوتے ہیں اور نہ خدا کے۔
الله تعالی (تکملہ ج ۸ ص ۹۳)	

اور یہ دفعہ دراصل قرآن کے الفاظ

وارزقوهم فیها واکسوهم	اور کھلاؤ ان کو اور پہناؤ (اسی مال سے
وقولوا لهم قولا معروفا۔	اور ان کو اچھی بات کے ساتھ خطاب
(النساء)	کیا کرو۔

کی تفسیر و تشریح ہے "فقہاء" نے اس کی بڑی تفصیل کی ہے کہ علاج ومعالجہ سیر و تفریح و زیارت وخیر و خیرات وغیرہ کے سلسلہ میں اس کو دیا جائے یا نہ دیا جائے ویا جائے تو کتنا دیا جائے اور کس ذریعہ سے دیا جائے براہ راست دیا جائے یا کسی معتبر نگران کے حوالہ کیا جائے کہ حسب ضرورت اس پر صرف کرے۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

بہر حال چونکہ قرآن نے "السفہاء" کے لئے "حجر" کا حکم حکومت کو دیا اور سفاہت میں زیادہ دخل بدعقلی ہی کو ہوتی ہے اس لئے فقہاء اسلام نے علاوہ ان معاشی مجرموں کے اسی لئے کہ ان میں بھی مالی تصرفات کے لئے جس عقل و شعور کی ضرورت ہے نہیں ہوتی اس قانون کو رعایا کے اور چند طبقات کے لئے بھی عام کر دیا ہے۔ یعنی جیسے جنون ہو، مغلوب الحال ہو، مدہوش ہو، فاسد العقل ہو، معتوہ ہو، معتوہ دراصل ایک قسم کے مجنون ہی کو کہتے ہیں۔ یعنی

قلیل الفهم فاسد التدبیر	کم سمجھ اور الٹی طبی تدبیریں کرنے والا تو وہ
الا انه لا یضرد لا یشتم	ہے لیکن نہ ضرر پہنچاتا ہے اور نہ گالی گلوچ کرتا
(ص ۸۹)	ہے۔

اسی طرح جو نابالغ ہو اور اس کا ولی نہ ہو تو حکومت اس کی جائداد کو بھی بلوغ تک اپنی نگرانی میں لے لے گی۔ یوں ہی باوجود استطاعت کے جو لوگوں کے قرض ادا کرنے سے گریز کرتا ہو یا قرض خواہوں کو جس کے متعلق اندیشہ ہو کہ اگر اس کو اپنے مال میں تصرف کی اجازت دی جائے گی تو ہمارا قرض ممکن ہے کہ ڈوب جائے یا اندیشہ ہو کہ مال کو دوسرے کے نام منتقل کر دے گا یا مقروض ہوا ور قرض خواہ حکومت میں درخواست دیں کہ اس کی جائداد سے ہمارے قرض کی ادائی کا سامان کیا جائے۔ ان تمام صورتوں میں کبھی دعوی کے بعد اور کبھی بغیر دعوی کے حکومت کو "حجر" کا اختیار ہے جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں سینکڑوں دفعات کے ذیل میں کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی حضرت معاذ بن جبل صحابی رضی اللہ تعالی عنہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ قرض میں ان کی ساری جائداد مستغرق ہوئی، قرض خواہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کی جائداد سے ہمارا قرض ادا کر دیا جائے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ

انه علیه السلام حجر علی معاذ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ پر

وقسم ماله لغرمائه — حجر کا قانون نافذ کر دیا اور ان کے مال
(تکملہ ج ۲ ص ۳۳) — ان کے قرض خواہوں میں بانٹ دیا۔

گویا حکومت کو اس قسم کے اختیارات دوسرے کے اموال پر خاص حالات میں حاصل ہیں اس کا یہ عملی ثبوت تھا۔

اب میرا یہ مضمون ختم ہوتا ہے۔ آج یورپ "کورٹ آف وارڈس" کے نام سے ایک قسم کے جدید محکمہ کے اضافہ کے ساتھ ہمارے ملک میں ظاہر ہوا ہے عموماً سمجھا جاتا ہے کہ یہ بھی مغرب کے تحائف جدیدہ میں کوئی جدید سوغات ہے لیکن یہ سب اسی وقت ہمیں سمجھایا گیا اور یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے جب اپنا جو کچھ تھا سب بھلا دیا گیا۔ جامعات سے ہمارے علوم مذہب کے نام سے موسوم کر کے خارج کر دیئے گئے اور اس علم کے جاننے کے جرم میں رزق کے دروازے ان پر مسدود ہوئے ایسی حالت میں جو کچھ بھی نہ سمجھایا جائے اور ہم جو کچھ نہ سمجھ لیں سب ہی کا کافی موقعہ ہے۔ مگر گذشتہ چند صفحات میں جس قانون کا مجمل ترین خلاصہ پیش کیا گیا ہے کیا انصاف کرنے والے کہہ سکتے ہیں کہ واقعی "کورٹ آف وارڈز" کے محکمے یورپ کے اختراعات میں سے ہیں۔

میں آخر میں تبرکاً وتیمناً اپنے اس بیان کو بخاری شریف کی اس حدیث پر ختم کرتا ہوں

عن مغيرة بن شعبة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ	مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ
عن رسول الله صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا نے تم پر
قال ان الله حرم عليكم عقوق الامهات	حرام کیا ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ
ووأد البنات ومنع وهات وكره لكم	درگور کرنا اور خود نہ دینا اور دوسروں سے کہنا
ثلاثا قيل وقال وكثرة السوال و	کہ "لائے جاؤ" اور ناپسند کیا اللہ نے تمہارے لئے
"اضاعة المال" (رواه البخاری ومسلم)	تین باتیں قیل وقال کو کثرت سوال کو اور مال کو برباد کرنا"

والله يقول الحق وهو يهدى السبيل وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

برطانوی دستور میں ہاؤس آف کامنز کی اہمیت

(بسلسلۂ گذشتہ)

ملک کے نظم ونسق کے لئے جن اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے ان کا مہیا کرنا ہاؤس آف کامنز کا خاص حق ہے جس سے اس ایوان کا قدیم مدمقابل ہاؤس آف لارڈز محروم کردیا گیا ہے۔ لیکن اس حق کو رکھنے کے باوجود ہاؤس آف کامنز کو عملی طور پر مالیاتی معاملات میں زیادہ دخل حاصل نہیں ہے بلکہ اس کے مالی اختیارات کو کابینہ استعمال کرتی ہے۔ اصولی طور پر سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہاؤس آف کامنز میں کسی ایسی مالیاتی تجویز پر غور نہیں کیا جاسکتا جو کابینہ کی طرف سے پیش نہ کی گئی ہو۔ پچھلے زمانے میں ہاؤس آف کامنز کو مالیات کے معاملوں میں جو دخل حاصل تھا اس کو وہ عاملہ کی روک تھام کے لئے استعمال کیا کرتا تھا لیکن اب حالت یہ ہے کہ ہر سال کروڑوں پونڈ کی منظوری ہاؤس آف کامنز میں بغیر کسی بحث وتنقید کے ہو جاتی ہے۔ مالیات کے متعلق جملہ تجاویز ٹریژری کی جانب سے پیش کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کابینہ جب بجٹ تیار کرتی ہے تو وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہاؤس آف کامنز میں وہ منظور نہ ہو جائے۔ بغیر ہاؤس آف کامنز کی منظوری کے کابینہ کوئی محصول عاید کرنے، قرض لینے یا اخراجات منظور کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ سالانہ بجٹ کی منظوری یا اس کے علاوہ دوسری مالیاتی تجاویز جب تک ہاؤس آف کامنز میں منظور نہ ہولیں ملک کے نظم ونسق کی مشین نہیں چلائی جاسکتی۔ جب بجٹ پیش ہوتا ہے تو ہاؤس آف کامنز کے ارکان اس کے پوری طرح مجاز ہیں کہ وہ متعلقہ وزیر مال سے

دیکھتی ہیں کہ ان کے محکموں کے اخراجات کے لئے اتنی رقم کیوں درکار ہے! ہر محکمے کے اخراجات کی باقاعدہ سرکاری تنقیح کی جاتی ہے تاکہ اس امر کا تعین ہو سکے کہ پارلیمنٹ کی منظور کی ہوئی رقوم بے جا طور پر تو نہیں خرچ کی گئیں۔ اس غرض کے لئے صدر محاسب (آڈیٹر جنرل) کا مستقل محکمہ موجود ہے اور جس کا عہدہ ججوں کی طرح بڑی حد تک حکومت کے اثر سے آزاد رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ماسوا ہاؤس آف کامنز کے ۱۵ ارکان کی ایک کمیٹی ہر سال مقرر کی جاتی ہے جس کے ذمہ حسابات کی تنقیح ہوتی ہے۔ اس کمیٹی کا صدر اس جماعت کا رکن نہیں ہوتا جو برسراقتدار ہے اور جس کو ہاؤس آف کامنز میں اکثریت حاصل ہے بلکہ وہ مخالف جماعت کا کوئی ذی وجاہت رکن ہوتا ہے۔ اس کمیٹی کو کمیٹی آف پبلک اکاؤنٹس کہتے ہیں۔

یہ کام حکومت وقت کا ہے کہ وہ اس امر کا تعین کرے کہ سال رواں کے لئے اس کو کس قدر رقم ملکی نظم و نسق کو چلانے کے لئے درکار ہوگی۔ چنانچہ اسی کے مطابق حکومت اس کا تعین کرتی ہے کہ کن کن ذرائع سے کتنی کتنی رقم حاصل کی جائے تاکہ نظم و نسق کے جملہ اخراجات کی کفالت ہو سکے۔ تمام سرکاری اخراجات کا تخمینہ ہر سال نئے سرے سے نہیں بنایا جاتا۔ بعض اخراجات مستقل حیثیت رکھتے ہیں جیسے شاہی اخراجات، ججوں کی تنخواہیں اور پنشنیں، قومی قرضہ کا سود وغیرہ۔ ان کے علاوہ فوج، بحریہ، فضائی بیڑا اور سول سروس کی تنخواہیں بھی مستقل اخراجات میں شمار ہوتی ہیں اگرچہ ان کے تخمینہ میں سال بہ سال حالات و ضروریات کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جب سال بھر کے اخراجات کا تخمینہ تیار کیا جاتا ہے تو جس محکمہ کو نئے اخراجات کرنا ہوتے ہیں اس کے نمائندے ٹریژری کے نمائندوں سے ملتے ہیں اور تفصیلات اور اپنی تجاویز کے متعلقات پر بحث کر لیتے ہیں۔ بعض اہم مسائل جیسے تعمیر مکانات کی کوئی نئی اسکیم یا بین الاقوامی صورت حال کے بگڑنے کے سبب سے اسلحہ جنگ کی تیاری اور مزید فوج بھرتی کرنے کے لئے نئے اخراجات کی منظوری ایسے معاملے ہیں جن کا تصفیہ کابینہ کرتی ہے۔ معمولاً ٹریژری حکومت کے ہر محکمہ کو گشتی چٹھی بھیجتی ہے اور اس کے مطالبات کا تخمینہ طلب کرتی ہے۔ اس امر کی محکموں کو تاکید کی جاتی

ہے کہ وہ سال گزشتہ کے اخراجات و اعداد کو بعینہ قائم رکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ اپنی ضروریات کے مطابق نئے تخمینے تیار کریں ۔ اگر گزشتہ سال کے تخمینے میں کوئی خاص تبدیلیاں کی جارہی ہوں تو ضروری ہے کہ متعلقہ محکمہ ٹریژری کو اس کی نسبت اطلاع کر دے اور اس کی رائے حاصل کرلے پیشتر اس کے کہ اس محکمہ کا تخمینہ مکمل ہو کر ٹریژری کو بھیجا جائے ۔ اگر ٹریژری محکمہ کے تخمینہ کی کسی تبدیلی کو ناپسند کرتی ہے تو ممکن ہے معاملہ کابینہ کے سامنے پیش ہو بشرطیکہ اس معاملہ کو غیر معمولی قومی اہمیت حاصل ہو ورنہ معمولاً ٹریژری کی رائے قطعی تصور کی جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرکاری محکمے اپنے تخمینہ جات مکمل کرکے ٹریژری کو بھیجتے ہیں تو درحقیقت وہ پہلے سے ٹریژری کے منشا کو ان کے متعلق معلوم کر لیتے ہیں ۔ مختلف محکموں کے جو تخمینہ جات اور وہ مستقل اخراجات جو "کنسالی ڈیٹڈ فنڈ سروس" کے نام سے موسوم ہیں سال بھر کے کل اخراجات پر مشتمل ہوتے ہیں جن کو مختلف محصولات کے ذریعہ حکومت فراہم کرنا اپنا فرض تصور کرتی ہے تاکہ ملک کے نظم ونسق کو چلا سکے ۔ ہاؤس آف کامنز اس کا مجاز ہے کہ وہ یہ تعین کرے کہ میزانیہ میں کل رقم کس قدر منظور کی جائے اور وہ رقم کن کن ذرائع سے حاصل کی جائے لیکن ہاؤس نے اپنے آپ کو اس اہم حق سے محروم کر لیا ہے کہ وہ خود مختلف قومی ضروریات کے لئے اخراجات تجویز کرے ۔ یہ کام اب کابینہ انجام دیتی ہے ۔

ہاؤس آف کامنز میں جب کابینہ کی جانب سے بجٹ کا مسودہ پیش کیا جاتا ہے تو ہاؤس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس امر کی پوری طرح چھان بین کرے کہ قومی نظم ونسق کے لئے جو خرچ کی تجویز کی گئی ہے وہ کم سے کم ہے جو ان حالات میں ممکن ہے ۔ قوم کی پوری مالی حالت کا جائزہ لینے کے لئے ہاؤس آف کامنز ایک کمیٹی کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کس مد پر کتنا خرچ کیا جائے ۔ اس کو کمیٹی آف سپلائی کہتے ہیں ۔ جب یہی کمیٹی اس پر غور کرتی ہے کہ یہ اخراجات قومی آمدنی کے کن ذرائع سے حاصل کئے جائیں تو اس کو کمیٹی آف ویز اینڈ مینز کہتے ہیں ۔ ہاؤس آف کامنز جب ان کمیٹیوں کی شکل اختیار

کرتا ہے تو اسپیکر اس کی صدارت نہیں کرتا بلکہ کمیٹی آف سپلائی کا علٰحدہ صدر منتخب ہوتا ہے اور کمیٹی آف ویز اینڈ مینس کا علٰحدہ۔ جب بجٹ تیار کیا جاتا ہے تو وہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایک حصہ میں اخراجات اور دوسرے میں محصولات وغیرہ کے ذرائع آمدنی کی تفصیل ہوتی ہے۔ جس طرح اور دوسرے قوانین ہاؤس آف کامنز میں منظور کئے جاتے ہیں اسی طرح بجٹ کا مسودہ بھی ہاؤس میں منظور ہونے کے بعد نافذ ہوتا ہے۔ دوسرے مسودات قانون کی طرح بجٹ کی تجاویز پر بھی پارٹی بندی کے نقطۂ نظر سے ہاؤس آف کامنز میں غور کیا جاتا ہے۔ حکومت کے حامی بجٹ کی تجاویز کی حمایت کرتے ہیں اور مخالفین مخالفت کرتے ہیں لیکن مخالف جماعت کی تنقید بجٹ پر بھی سیاسی نقطۂ نظر سے ہوتی ہے۔ مخالف جماعت بجٹ کے ان کمزور پہلوؤں کو چن لیتی ہے جن کی مخالفت سے وہ اپنے حریفوں کے مقابلہ میں سیاسی فائدہ حاصل کرسکتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مالیاتی معاملات میں ہاؤس آف کامنز کا اختیار اب برائے نام رہ گیا ہے۔ ہاؤس میں مالیاتی تجاویز صرف حکومت پیش کرسکتی ہے۔ چونکہ کابینہ کا تعلق اس سیاسی فریق سے ہوتا ہے جسے ہاؤس آف کامنز میں اکثریت حاصل ہے اسواسطے سوائے بعض ضمنی تبدیلیوں کے جو محصولوں کے عائد ہونے کے متعلق ہوتی ہیں بجٹ بلاکسی دشواری اور تبدیلی کے منظور کرلیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات حکومت کو باوجود ہاؤس میں اکثریت رکھنے کے بعض محصولات بدلنے پڑتے ہیں اور بجائے کسی ایک طبقہ کے کسی دوسرے طبقہ پر محصول کا بار عائد کرنا ہوتا ہے اور اس طرح تخمینہ کی مقررہ رقم کو پورا کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں مسٹر (لارڈ) بالڈون کی کابینہ کو ہاؤس آف کامنز کی اکثریت حاصل تھی۔ اس کابینہ کی طرف سے اس سال جو بجٹ پیش کیا گیا اس میں مٹی کے تیل پر محصول کی تجویز تھی جس کا اثر زیادہ تر غریب طبقہ پر پڑتا تھا۔ چنانچہ ہاؤس کا رجحان اس محصول کے خلاف دیکھ کر کابینہ نے اس تجویز کو واپس لے لیا اور دوسرے محصولوں سے اس کی کمی کو

پورا کیا جن کا بار متوسط اور اعلیٰ طبقہ پر پڑتا تھا۔

وضع قانون اور ملکی نظم ونسق کے مالیاتی انصرام کی تجاویز منظور کرنے کے علاوہ ہاؤس آف کامنز کا ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ حکومت کے مختلف شعبوں کے متعلق واقفیت حاصل کرے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہاؤس کے ارکان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ متعلقہ وزیروں سے سوالات کر سکیں۔ سوالوں کے ذریعہ ارکان نہ صرف صحیح حالات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں بلکہ اپنی شکایات کا بھی اظہار کر سکتے ہیں اور اس طرح عام مفاد کے ان مسائل کو ملک و قوم کی توجہ کا مرکز بنا سکتے ہیں جنھیں ان کے خیال میں حکومت پوری توجہ کے ساتھ جیسا چاہیئے انجام نہیں دے رہی ہے بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ وزارت کے حامی وزیر متعلقہ سے کسی خاص مسئلہ کے متعلق اس لئے سوال کرتے ہیں تاکہ وزیر متعلقہ کو اپنی عام حکمت عملی کا اس طرح اظہار کا موقع حاصل ہو اور ملک میں جو غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے اس کا سد باب ہو سکے۔ حکومت کے مخالف اکثر اوقات حکومت کو دِق کرنے کے لئے مختلف قسم کے سوالوں کی بھرمار کرتے ہیں۔ بعض ارکان کو سوال کرنے کا شوق اس لئے ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے منتخب کرنے والوں کو بتا سکیں کہ ملکی معاملات سے ان کی دلچسپی برقرار ہے اور وہ پارلیمنٹ کے اونگھتے ہوئے رکن نہیں ہیں۔ سوالوں کے ذریعہ حکومت کے مختلف محکموں پر تنقید ممکن ہے اور محکموں کی فروگزاشتوں کو پبلک کے سامنے لانے کا یہ نہایت موثر ذریعہ ہے۔ دفتر شاہی پارلیمنٹ میں سوالوں کے ڈر سے ہر وقت چوکنّی اور اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری میں مستعد رہتی ہے۔ سوال کرنے کی آزادی کے حق کو جو پالیمانی حکومت کا نہایت اہم حق ہے، اگر ٹھیک طور پر استعمال نہ کیا جائے تو اس سے بجائے فائدہ کے اُلٹا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس پارلیمانی حق کو اور دوسرے دستوری حقوق کی طرح ضابطوں کا پابند کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ہر سوال صرف اس وزیر سے کیا جا سکتا ہے جس کے دائرۂ عمل کے تحت متعلقہ محکمہ کا تعلق ہے۔ سوال کرنے والے کو کم سے کم ایک روز کا نوٹس دینا ہوتا ہے تاکہ اس کے متعلق وزیر کا عملہ محکمہ سے معلومات فراہم

کر سکے ۔ یہ بھی لازمی ہے کہ سوال کے ضمن میں کسی قسم کی کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جس سے ظاہر ہو کہ سوال کرنے والا اس بہانہ سے اپنی حجت پیش کرنا چاہتا ہے یا خاص مسلک یا خیال کا پرچار کرنا چاہتا ہے ۔ سوال سے کسی کی برائی یا تعریف کا پہلو نکلتا ہو تو اسپیکر اس کی اجازت نہ دے گا ۔ سوال میں کسی ایسے بیان کی نسبت اشارہ یا حوالہ نہ ہونا چاہیئے جو کسی وزیر یا ہاؤس کے کسی رکن نے ہاؤس سے باہر دیا ہو ۔ کسی رکن کو ایک وقت میں چار سوال سے زیادہ کی اجازت نہ ہوگی ۔ کسی جواب کے غیر تشفی بخش ہونے کی صورت میں اسپیکر کی اجازت سے ضمنی سوال دریافت کئے جاسکتے ہیں ۔ ہاؤس آف کامنز کی ہر روز کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے کچھ وقت کی نشان دہی کردی جاتی ہے جس میں حکومت کے وزیر ارکان کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں ۔ سوال کے ضمن میں کسی قسم کی ہاؤس میں بحث نہیں کی جاسکتی ۔ وزیر متعلقہ جب کسی سوال کا جواب دے چکے تو اس کے بعد ہاؤس میں، جیسا کہ فرانس کے چیمبر آف ڈیپیوٹیز میں دستور ہے، اس موضوع کو طول نہیں دیا جاسکتا اور اس کو بنائے بحث و حجت نہیں قرار دیا جاسکتا ۔ اس بات کا کوئی تعین ممکن نہیں کہ وزیر متعلقہ نے کسی سوال کا جو جواب ہاؤس کے سامنے دیا وہ قابلِ اطمینان تھا یا نہیں ۔ وزیر کے جواب کے بعد چاہے وہ جواب تشفی بخش ہو یا نہ ہو ہاؤس اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق جسے "آرڈرز آف دی ڈے" کہتے ہیں، عمل کرتا ہے ۔ ہاؤس آف کامنز میں روزانہ تقریباً ڈیڑھ سو سوال کئے جاتے ہیں جن کے جواب متعلقہ وزیروں کو اپنے اپنے محکموں سے مواد فراہم کرنے کے بعد دینے ہوتے ہیں ۔ کچھ عرصہ ہوا حکومت کے اخراجات میں تخفیف کرنے کی سفارش کرنے کی غرض سے ہاؤس آف کامنز نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی ۔ اس کمیٹی نے اپنی تحقیقات کے دوران میں اس مسئلہ پر بھی غور کیا کہ ہاؤس آف کامنز میں روزانہ جو سوالات کئے جاتے ہیں اور ان کے جو جواب دیئے جاتے ہیں ان پر کتنا خرچ ہوتا ہے ۔ چنانچہ کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ انگلستان کے خزانہ کو ہر سوال کے جواب پر تقریباً ۳۰ شلنگ (۲۰ روپئے) خرچ کرنا پڑتے ہیں ۔ لیکن باوجود اس خرچ کے پارلیمنٹ میں سوال کرنے کا حق ایک نہایت اہم دستوری حق ہے جس کو انگریز قوم اپنا

آزادی کے اصول میں شمار کرتی ہے۔

یہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ سوالات کے ضمن میں بحث نہیں ہو سکتی اور نہ رائے طلب کی جا سکتی ہے لیکن ہر رکن اس کا مجاز ہوتا ہے کہ کسی ایسے اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے جس کا تعلق مفاد عامہ سے ہے، ہاؤس کی کارروائی کو ملتوی کرانے (اڈجورن منٹ) کی تحریک پیش کرے۔ اس قسم کی تجاویز بالعموم اس وقت کی جاتی ہیں جب متعلقہ وزیر کسی سوال کا تشفی بخش جواب نہ دے یا اپنے جواب سے اصل مسئلہ کو ٹالنے کی کوشش کرے۔ اجلاس ملتوی کرنے کی تحریک معمولاً آرڈرز آف دی ڈے سے قبل نہیں پیش کی جا سکتی لیکن اس وقت اس کو پیش کیا جا سکتا ہے جبکہ ہاؤس کے چالیس ارکان کھڑے ہو کر ایسا کرنے کی تائید کریں۔ ایسی صورت میں اس روز کا پارلیمانی پروگرام شروع کرنے سے قبل تحریک التوا پر غور کیا جائیگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہاؤس کے دس ارکان کھڑے ہو کر اسپیکر سے درخواست کریں کہ اس روز کا پروگرام شروع ہونے سے پہلے تحریکِ التوا کو پہلے پیش ہونا چاہیئے۔ ایسی حالت میں اسپیکر کُل ہاؤس سے اس کی نسبت رائے دریافت کرے گا اور اگر کثرت رائے تحریکِ التوا کو پہلے پیش کرنے کی موافقت میں ہوگی تو اس پر عمل کیا جائے گا۔ تحریک التوا کسی ایسے اہم مسئلہ کے متعلق ہوتی ہے جس کا تعلق مفاد عامہ سے ہو۔ لیکن اس بات کا تعین بڑا مشکل ہے کہ آیا کسی مسئلہ کا تعلق مفاد عامہ کے اہم مسئلہ سے ہے یا نہیں۔ کابینہ کے ارکان تحریک التوا کو پسند نہیں کرتے اس واسطے کہ بعض اوقات یہ تحریک کسی ایسے مسئلہ کے ضمن میں پیش کی جا سکتی ہے جس کے متعلق حکومت اپنی رائے ظاہر کرنا اور متعلقہ واقعات کو پیش نہیں کرنا چاہتی۔

بالعموم تحریک التوا کابینہ سے اہم معاملات کے متعلق مزید اطلاع اور واقفیت حاصل کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہے اور بعض اوقات اس کا مقصد کابینہ پر اظہارِ ملامت کرنا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ تحریکِ التوا اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ کسی فوری پبلک اہمیت رکھنے والے صریح اور معینہ معاملے کی طرف مقننہ کی توجہ مرکوز کی جا سکے اور اس کے ضمن میں جو بحث و تنقید ہو اس سے متعلقہ تنقیحات واضح ہو جائیں لیکن جب سے انگلستان کی سیاست میں

پارٹی بندی کے اصول پر سختی کے ساتھ عمل ہو رہا ہے اس وقت سے مخالف جماعت کے لئے اس کا بہت کم امکان باقی ہے کہ وہ کابینہ کی مرضی کے خلاف اپنی تحریک التوا کو کامیاب بنا سکے۔

بعض اوقات حکومت جب کسی مسئلہ کے متعلق تشفی بخش جواب نہیں دیتی تو تحریکِ التوا ہاؤس میں پیش کی جاتی ہے تاکہ متعلقہ مسئلہ پر بحث و تنقید ہو اور رائے لی جائے ورنہ ویسے معمولی سوالات پر بحث نہیں ہو سکتی اور نہ رائے لی جاتی ہے بلکہ وزیر متعلقہ جو کچھ جواب دیتا ہے اسی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ ہاؤس آف کامنز میں تحریک التوا فرانسیسی دار الوکلا[۱] کے ان تفصیل طلب سوالات[۲] سے ملتی جلتی ہے جو حکومتوں کو بنانے بگاڑنے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ فرانس میں وزراء سے سوال کرنا ایک مستقل فنِ لطیف بن گیا ہے بعض دفعہ یہ سوال اس طور پر اور ایسی عبارت میں ہوتے ہیں کہ حکومت کے حامی بھی اگر ذرا بھی اپنے ضمیر کا خیال کریں تو ان کی مخالفت کرتے ہوئے ہچکچائیں لیکن چونکہ ان کی تہ میں حکومت وقت کی ملامت کا خیال کار فرما ہوتا ہے اس لئے حکومت کے حامیوں کے سامنے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ وہ کابینہ کی تائید کرنے کی غرض سے ان کی مخالفت کریں۔ لیکن پھر بھی انگلستان کے مقابلہ میں فرانس میں ان تفصیل طلب سوالات سے حکومتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اگر کسی سوال کے ضمن میں حکومت کو دار الوکلاء کی اکثریت حاصل نہ رہے تو اس کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ ہاؤس آف کامنز میں بھی تحریک التوا جب پیش کی جاتی ہے تو اس پر بحث و تنقید ہوتی اور رائے لی جاتی ہے اور حکومت کی طرف سے متعلقہ مسئلہ کے ضمن میں جو جواب دیا جاتا ہے وہ معرض بحث میں آتا ہے۔ چنانچہ اگر مخالف جماعت کے معمولی سوال کا حکومت کی طرف سے تشفی بخش جواب نہیں دیا جاتا یا اس کو ٹالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو تحریک التوا کا حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ بالعموم اگر کسی تحریک التوا کے ضمن میں حکومت کو شکست ہو جائے تو اس کو مستعفی ہونا چاہیئے

۱۔ Chamber of Deputies

۲۔ Interpellations

لیکن انگلستان میں فرانس کی طرح ایسی نوبت نہیں آتی اس واسطے کہ کابینہ کو پچھلے پچاس برس میں بہت قوت حاصل ہوگئی ہے اور وہ من مانے طور پر ہاؤس آف کامنز سے جو چاہتی ہے فیصلہ کرا لیتی ہے۔ جو جماعت کابینہ بنانے کی اہل ہوتی ہے وہ اس کی بدرجۂ اتم اہل ہوتی ہے کہ ہاؤس آف کامنز میں تحریک التوا یا تحریک ملامت کو شکست دے سکے۔ اگر ہاؤس کابینہ کی تائید نہیں کرے گا تو خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارے گا کیونکہ کابینہ کی شکست کے معنی ہوں گے ہاؤس کا برخاست ہو جانا جو کابینہ کے حامی ہرگز نہیں چاہیں گے۔

اٹھارویں صدی میں ہاؤس آف کامنز اپنی قوت کے شباب پر تھا۔ اس کے بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار سے لوگ خائف ہوگئے۔ چنانچہ کابینی طریق حکومت کو اسی غرض کے لئے ترقی دی گئی کہ اس طرح ہاؤس آف کامنز کی روک تھام ممکن ہوگی۔ انیسویں صدی میں کابینی طریق حکومت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ پچھلے دنوں انگلستان کی سیاسی زندگی میں یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ہاؤس آف کامنز کا اثر دن بدن گھٹتا جا رہا ہے اور کابینہ کا اثر بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ آج اصل آقا کابینہ ہے نہ کہ ہاؤس آف کامنز بالکل اسی طرح جیسے انیسویں صدی میں ہاؤس آف کامنز اصل آقا تھا اور کابینہ اس کی خادم۔ ہاؤس آف کامنز کا کام زیادہ تر یہ رہ گیا ہے کہ وہ کابینہ کے فیصلوں کی توثیق کرتا رہے۔

پارٹی بندی کی ترقی کا یہ لازمی نتیجہ نکلا کہ ہاؤس آف کامنز میں پرائیویٹ ممبر کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہی۔ ہاؤس خود وضع قانون نہیں کرتا بلکہ وزیر وضع قانون کی جو تجاویز پیش کرتے ہیں ان کی توثیق کرتا ہے۔ وہ جماعت جو برسر اقتدار ہوتی ہے اس کے ارکان کو مجوزہ مسودات قانون کے متعلق اتنی ہی واقفیت ہوتی ہے جتنی مخالف جماعت کے ارکان کو۔ جب یہ مسودے چھپ کر ارکان کے غور کے لئے پیش ہوتے ہیں تو ان کو ان کی نسبت اطلاع ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے مخالف جماعت کے ارکان کو۔ ان کی آواز بھی مخالف جماعت کے ارکان کی طرح معاملات اور مسائل کو خاص شکل دینے میں غیر موثر رہتی ہے۔ لیکن برسر اقتدار جماعت کے حامی ہونے کے سبب سے ان کا کام یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی جماعت کی

بحث کریں اور اس کے ساتھ رائے دیں۔ بعض اوقات بالکل مشینی طور پر اپنے ضمیر کے خلاف رائے دینا پڑتی ہے۔ کابینہ اس وقت ہاؤس آف کامنز پر اس طرح حاوی ہے کہ اس کے افعال کی بازپرس بہت دشوار ہوگئی ہے۔ اس کے افعال پر اگر کوئی روک ہے تو وہ ہاؤس آف کامنز نہیں ہے بلکہ رائے دینے والی عام پبلک ہے جس کے سامنے پھر کچھ سال بعد ارکان کابینہ کو ووٹوں کے لئے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ لیکن جہاں تک ہاؤس آف کامنز کا تعلق ہے اس کا اثر برابر کم ہو رہا ہے اور بغیر کابینہ کے ایما کے کچھ نہیں کرسکتا۔ ہاؤس آف کامنز کا اہم تاریخی فریضہ یہ تھا کہ وہ حکومت کی نگرانی اور روک تھام کرتا رہے لیکن اب بہت دنوں سے وہ اپنے اس فرض کی بجا آوری میں قاصر نظر آتا ہے۔

سو سال قبل ہاؤس آف کامنز زیادہ تر وضع قانون کے فرائض انجام دیتا لیکن آج یہ کام کابینہ کے ذمہ ہے۔ کابینہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنی ضروریات کے لئے ہاؤس کے وقت میں سے بیشتر اپنے لئے مخصوص کرائے تاکہ وہ مسودات قانون منظور ہوسکیں جنھیں وہ ملک و قوم کے لئے ضروری خیال کرتی ہے۔ ہاؤس آف کامنز صرف اس وقت اپنی آواز بلند کرسکتا ہے جبکہ کسی مسودۂ قانون کے ضمن میں ملک کی عام حکمت عملی متاثر ہوتی ہو لیکن اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ حکومت وقت کسی خاص حکمت عملی کے متعلق اس قدر اقدام کرچکی ہوتی ہے کہ ہاؤس آف کامنز سوائے اس کے کہ اس حکمت عملی کو کلیتہً باطل قرار دے اس میں کوئی نمایاں تغیر و تبدل نہیں کراسکتا اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب حکومت وقت کو بیدخل کرنا مقصود ہو۔ اور ظاہر ہے کہ حکومت کی پارٹی کے ارکان چاہے وہ اس کی کسی خاص حکمت عملی کو کتنا ہی ناپسند کیوں نہ کرتے ہوں یہ گوارا کریں گے کہ اس کو شکست ہوجائے اور مخالف پارٹی اپنی حکومت قایم کرے۔ غرضکہ وضع قانون اور عام حکمت عملی کی تشکیل کے باب میں ہاؤس آف کامنز کا کوئی خاص حصہ نہیں ہوتا بلکہ اکثر اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ جب کابینہ اہم فیصلے اور حکمت عملی کی تشکیل کرچکتی ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں تو ہاؤس آف کامنز کو اس کی نسبت واقف کرایا جاتا ہے۔

کابینہ کے اس بڑھتے ہوئے اثر کی حمایت انگلستان کے بعض اُن اہل فکر نے بھی کی جن کی نظر فلسفۂ سیاست پر گہری تھی۔ جان اسٹورٹ مل نے ۱۸۶۲ء میں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے انگلستان کے اس جدید سیاسی رجحان کی تائید کی اور کہا۔ "ایک عام نمائندہ جماعت جانتی ہے کہ وہ کس کام کے لئے موزوں ہے اور کس کام کے لئے موزوں نہیں ہے۔ دن بدن یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ اُس کا (ہاؤس آف کامنز) کام نظم و نسق کو چلانا نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ آیا نظم و نسق کا کام موزوں لوگوں کے ہاتھ سے انجام پا رہا ہے یا نہیں اور وہ لوگ اپنے فرائض جیسے چاہئے ویسے پورے کر رہے ہیں یا نہیں۔ مجھے پوری توقع ہے کہ یہ احساس بڑھتا جائیگا کہ اس ہاؤس (ہاؤس آف کامنز) کا فرض یہ ہے کہ وہ ٹریژری بنچ پر موزوں اشخاص کو بٹھائے اور جب وہ وہاں ہوں تو انھیں اپنے کام میں لگا رکھے جتنا زیادہ لوگوں کا تجربہ وسیع ہوتا جائیگا اتنا ہی زیادہ وہ اس اصول کی قدر کریں گے"۔

پچھلی صدی میں ہاؤس آف کامنز کی قوت کا راز اس امر میں پوشیدہ تھا کہ ملکی مالیات کے متعلق اس کو مکمل اختیارات حاصل تھے اور بجٹ کے بنانے' بدلنے میں اس کو موثر دخل حاصل تھا۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع سے یہ رجحان دن بدن بڑھ رہا ہے کہ مالیاتی حکمت عملی کی تشکیل بھی پورے طور پر کابینہ کے ہاتھ میں چھوڑ دی جائے اب انگلستان کے خزانے کی کنجی ہاؤس آف کامنز کے ہاتھ سے نکل کر کابینہ کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ خاص طور پر جنگ عظیم کے بعد سے حکومت کی پیش کی ہوئی مالیاتی تجاویز میں شاذ ہی رد و بدل کیا جاتا ہے اور حکومت کی طرف سے قومی آمدنی اور خرچ کے تخمینے پیش ہوتے ہیں انھیں بلاچون و چرا تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ وزیر یہ پسند نہیں کرتے کہ ہاؤس ان کی تجاویز میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کرے چاہے وہ کتنی ہی ناقابل قبول کیوں نہ ہوں۔ ہاؤس آف کامنز سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ حکومت کی پیش کی ہوئی مالیاتی تجاویز کو جیسے کا تیسا تسلیم کرے گا۔

۱؎ - سڈنی لو - دی گورنمنٹ آف انگلینڈ - ص ۶۸ -

سر ارسکن مے نے پارلیمنٹ کے تینوں اجزا یعنی تاج، ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنز کے مالیاتی حق کا اپنی مشہور تصنیف میں اس طرح ذکر کیا ہے :۔ "تاج رقم کا مطالبہ کرتا ہے، کامنز اس رقم کو منظور کرتے ہیں اور لارڈز اس کی منظوری کی تائید کرتے ہیں۔ ہاؤس آف کامنز اس وقت تک رقم منظور نہیں کرتا جب تک کہ تاج کی طرف سے مطالبہ نہ پیش کیا جائے۔ اور نہ وہ نئے ٹکس عائد کرتا جب تک کہ تاج کی طرف سے مطالبہ نہ پیش کیا جائے۔ اور نہ وہ نئے ٹکس عائد کرتا یا ان میں اضافہ کر سکتا ہے جب تک کہ پبلک سروس کے لئے ایسا کرنا ضروری نہ ہو جس کی نسبت تاج نے اپنے دستوری مشیروں کے ذریعہ اعلان کر دیا ہو[۱]" لیکن سر ارسکن مے نے جس پارلیمانی طریق کار کی طرف اشارہ کیا ہے وہ دستوری حیثیت سے چاہے کتنا درست کیوں نہ ہو لیکن عملی طور پر اس کے نتائج کا رُخ بالکل دوسری طرف ہے۔ اب ہاؤس آف لارڈز کو ۱۹۱۱ء کے ریفارم ایکٹ کی رو سے مالیاتی معاملات میں دخل دینے کا حق باقی نہیں رہا۔ آمد و خرچ پر کامنز کی نگرانی بھی اب برائے نام رہ گئی ہے۔ بادشاہ کو ذاتی طور پر بہت عرصے سے ملک کی مالیات سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہاں اگر تاج سے مراد کابینہ لی جائے تو اس ضمن میں جو دستوری اُلجھاؤ پیدا ہوتا ہے وہ سُلجھ جاتا ہے۔ ہاؤس آف کامنز کسی مالیاتی تجویز کو از خود نہیں پیش کر سکتا جب تک کہ کابینہ کی طرف سے اس کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو۔ جب کابینہ مطالبہ کرتی ہے تو اس وقت ہاؤس آف کامنز رقوم کی معینہ مقاصد کے لئے نشاندہی کرتا ہے۔ اس تمام اہم کارروائی کے متعلق پارلیمنٹ کا کوئی منظور کیا ہوا قانون موجود نہیں بلکہ صرف ایک منظورہ قاعدہ (اسٹنڈنگ آرڈر) کے ذریعہ مالیاتی انصرام کے متعلق دستوری روایات پیدا ہو گئی ہیں جو لکھے ہوئے قانون کی طرح موثر ہیں۔

ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ کروڑوں پونڈ کی رقموں کے متعلق جانچ پڑتال کرنے کے لئے ہاؤس کو صرف ۲۰ دن دیئے جاتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مالیاتی مسائل اس قدر پیچیدہ ہوتے

---

[۱] Parliamentary Practice ص ۵۱۵

ہیں کہ جب تک کوئی شخص اس فن کی مہارت نہ رکھتا ہو کسی مقننہ کے معمولی ارکان کے لیئے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کوئی معقول رائے دے سکیں جو فنی اعتبار سے درست اور صائب کہی جا سکے۔ حکومت کی مخالف پارٹی بھی بڑی مشکل سے مالیاتی تجاویز میں کوئی فنی کوتاہی نکال سکتی ہے اس لئے کہ ہر مد بڑی دیدہ ریزی اور محنت کے بعد ماہروں کے مشورہ سے تیار کی جاتی ہے۔ لیکن مخالف پارٹی بالعموم ایسے موقع پر یہ کرتی ہے کہ حکومت کی عام حکمت عملی کو معرض بحث میں لاتی ہے بجائے اس کے کہ پیش کردہ تخمینوں پر فنی نقطۂ نظر سے بحث کرے۔ چنانچہ سیاسی تنقیحات اُٹھائی جاتی ہیں اور متعلقہ وزیروں کی تنخواہوں میں تخفیف کرنے کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

۱۹۱۸ء[1] میں انگلستان کی قومی آمدنی کے وسائل پر تفتیش کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ نے ایک سیلکٹ کمیٹی مقرر کی تھی جس نے اس پر تعجب ظاہر کیا ہے کہ "پچھلے پچیس سال میں ایسی کوئی ایک مثال بھی موجود نہیں کہ ہاؤس آف کامنز نے اپنے براہ راست عمل سے مالیاتی وجوہ کی بنا پر کسی تخمینے میں جو اس کے سامنے پیش کیا گیا ہو کمی کی ہو۔ کمیٹی آف سپلائی میں جو مباحثہ ہوتا ہے وہ حکومت کی حکمت عملی اور نظم ونسق کی تنقید کے لئے ناگزیر ہے لیکن حکومتی اخراجات کی تجاویز پر براہ راست موثر طور پر روک یا قابو رکھنے کا جہاں تک تعلق ہے، یہ کہنا درست ہوگا کہ اگر تخمینے ہاؤس کے سامنے پیش نہ بھی ہوتے اور کمیٹی آف سپلائی اپنے اجلاس منعقد نہ بھی کرتے تو بھی کوئی خاص فرق پیدا نہ ہوتا۔"[2]

دراصل ضرورت اس کی ہے کہ امریکہ اور فرانس کی طرح انگلستان میں بھی کمیٹیوں کا طریقہ رائج کیا جائے جو ایک طرف تو ہاؤس آف کامنز کے کھوئے ہوئے اختیارات کی حفاظت کرے اور دوسری طرف کابینہ کے بڑھتے ہوئے اثر میں کمی کرے۔ اس وقت

---

[1] Ninth Report of the Select Committee on National Expenditure p. 121, 1918.

[2] دیکھو ایف۔ اوگ کی کتاب "European Governments and Politics" ص ۱۸۷۔

انگلستان میں حالت یہ ہے کہ محکمۂ مالیات یہ نہیں چاہتا کہ اس کے راز ہائے سربستہ ہر کس و ناکس کے سامنے تفصیل سے پیش ہوں اور ہاؤس آف کامنز کے ارکان کو اس باب میں عمل دخل حاصل ہو۔ امریکہ میں حکومت کے پیش کئے ہوئے تخمینوں کی جانچ پڑتال کے لئے نو کمیٹیاں ہوتی ہیں جن کے سپرد خاص خاص محکموں کے تخمینے ہوتے ہیں۔ ان کمیٹیوں کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ چنانچہ وزیر متعلقہ اور سرکاری عہدہ داروں کو وہ اپنے سامنے کسی خاص مد کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے طلب کر سکتی ہیں۔ ان کمیٹیوں کے صدر بڑے با اثر لوگ ہوتے ہیں اور کسی طرح بھی ان کی حیثیت وزیروں سے کم نہیں ہوتی۔ فرانس میں بھی اس قسم کی کمیٹیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ فنانس کمیٹی کے سب ارکان دار الوکلاء کے ارکان ہوتے ہیں لیکن وزیر مالیات اس کا رکن نہیں ہوتا۔ اگر کمیٹی چاہے تو اس کو اپنے سامنے طلب کر سکتی ہے۔ اس کمیٹی کی نظر ثانی کے بعد بجٹ کا مسودہ دار الوکلاء میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اور دوسرے شعبوں کے متعلق امریکہ اور فرانس میں جو کمیٹیاں مقرر ہوتی ہیں ان کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں اور ان کی بدولت ان ملکوں کی عاملہ پر بلاواسطہ روک رہتی ہے۔ فرانس میں باوجود وزارتوں کی آئے دن کی تبدیلیوں کے ان کمیٹیوں کے سبب سے نظم و نسق کی بنیادی حکمت عملی میں بہت کم فرق پیدا ہوتا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ فرانس میں دار الوکلاء کابینہ پر پورا قابو رکھتا ہے بالکل اسی طرح جیسے انگلستان میں کابینہ ہاؤس آف کامنز کی تکمیل کابینہ کے ہاتھ میں رہتی ہے کہ من مانے طور پر اسے جدھر چاہے لے جائے۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کمیٹیوں کی بدولت فرانس کی دفتر شاہی حکومت پر عوام کا زیادہ اثر ہے بہ نسبت انگلستان کے، جہاں دفتر شاہی حکومت کابینہ کی آڑ میں پوری طرح پارلیمنٹ پر حاوی ہے۔[1]

یہ سوال اگرچہ مختلف فیہ ہے کہ آیا کابینہ اور پارٹی بندی کے طریقے کو کمزور کرنے

---

[1] ریمزے میور How Britain is Governed. ص ۲۳۰۔

اور پرائیویٹ ممبر کے حل و عمل کو بڑھانے سے جو وضع قانون ہوگا وہ ملک و قوم کے لئے زیادہ مفید ہوگا یا وہ قوانین جو کسی خاص حکمت عملی کے تحت کابینہ کے اقدام پر ہاؤس آف کامنز میں وضع کئے جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ چونکہ کابینہ نے وضع قانون کے تقریباً تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر لئے ہیں اس لئے پرائیویٹ ممبر کی اہمیت بالکل ختم ہوگئی ہے اور اس کو اپنی بے لاگ رائے اور صلاحیت سے ہاؤس کو مستفید کرنے کے برائے نام مواقع باقی رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کابینہ اور محکمے نظم و نسق کے علاوہ وضع قانون کے متعلق بھی پورے طور پر حاوی نظر آرہے ہیں جو درحقیقت عمومیت کے اصول کی نفی ہے۔ یہ سچ ہے کہ کابینہ خود کوئی ایسا کام کرتے ہوئے پیدس وپیش کرتی ہے جس سے عوام الناس میں اس کے خلاف ناراضگی کے جذبات پھیلنے کا احتمال ہو۔ مثلاً حبشہ کے معاملہ میں ۱۹۳۵ء میں جب سر سموئیل ہور، وزیر خارجہ کی پالیسی پر عام طور پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا تو مسٹر بالڈون نے مجبوراً اپنی حکومت کو اس پالیسی سے بے تعلقی ظاہر کی اور سر سموئیل ہور کو مستعفی ہونا پڑا اور نہ اندیشہ تھا کہ کہیں حکومت کو مزید مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن عام طور پر ایسی مثالیں آج کل کی پارلیمانی زندگی میں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ پارٹی بندی کے بندھن ایسے سخت ہیں کہ انفرادی ضمیر کی آزادیاں اس پر قربان کر دی گئی ہیں۔ ہاؤس آف کامنز میں مختلف سیاسی پارٹیوں کی طرف سے جو فصاحت و خطابت صرف کی جاتی ہے وہ اکثر و بیشتر بے اثر رہتی ہے۔ اگرچہ ایک پارٹی کا رکن محسوس کرتا ہے کہ مخالفوں کے دلائل قوی ہیں لیکن وہ اپنا ووٹ اپنی پارٹی ہی کو دیتا ہے چاہے اس کے لیڈر کی حجت کتنی ہی غیر تشفی بخش اور پھس پھسی کیوں نہ رہی ہو۔

آج کل ہاؤس آف کامنز میں رائے بالکل میکانکی طور پر دی جاتی ہے نہ کہ دلائل و براہین کے اثر سے۔ پارٹی بندی کا گر یہی ہے ورنہ ایک پارٹی کے رکن دوسری پارٹی کے ساتھ ووٹ دیا کریں جیسا کہ انیسویں صدی کے آخر تک دیا کرتے تھے۔ لیکن اب اس کا مطلق امکان باقی نہیں رہا ہے اگر ایسا ہو تو سارا پارلیمانی نظام درہم برہم ہو جائے۔

ہاؤس آف کامنز کے وقار کو برقرار رکھنے اور پرائیویٹ ممبر کی اُپج کو بالکل ختم ہونے سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ کابینہ اور ہاؤس آف کامنز کے اختیارات کے باہمی توازن پر نظرثانی کی جائے تاکہ انگلستان کی روایتی آزادئ تنقید متاثر نہ ہو لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ تنقید کا کام بڑی حد تک اخبارات نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اکثر اوقات ہاؤس آف کامنز کے رکن کو اس کا علم تک نہیں ہوتا کہ ایوان میں کیا ہو رہا ہے۔ صبح اٹھ کر ناشتہ کے وقت جب وہ اخبار پڑھتا ہے تو حال معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح پبلک کو اخباروں کے ذریعہ پارلیمنٹ کی کارروائیاں تفصیل سے معلوم ہوتی ہیں اسی طرح پارلیمنٹ کے بیشتر ارکان کو اخباروں ہی سے اپنے ایوان کی کارروائیوں کے متعلق واقفیت ہوتی ہے۔ اب ہاؤس آف کامنز کے حق تنقید پر پریس قابض ہے اس لئے کہ ہاؤس کے ارکان کی تنقید موجودہ پارٹی بندی کے طریق کار کے مطابق پارلیمانی امور میں دراصل ایک قسم کی رکاوٹ ہوگی۔ ہاؤس آف کامنز کا سوائے اس کے کوئی فرض باقی نہیں رہا کہ وہ حکومت وقت کو برقرار رکھے اور اس پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے دے۔ حالانکہ اس کا فرض یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ حکومت کو ٹھیک ٹھیک مشورہ دے اور اس کو بے راہ روی سے بچائے۔ لیکن چونکہ کابینہ اس پارٹی کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جس کو ہاؤس آف کامنز میں اکثریت حاصل ہے اس لئے بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ وہ ارکان جن کی پارٹی برسراقتدار ہے یہ فرض کر لیتے ہیں کہ کابینہ جو کچھ کر رہی ہے وہ درست ہے۔ پھر چونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے حکومت کی مخالفت کی اور اس کو کسی اہم تجویز پر ہاؤس میں شکست ہوگئی تو انتخاب کے جھمیلے میں پڑنا پڑے گا اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ پارٹی کبھی بھی ان کی تائید نہیں کرے گی اور نجی حیثیت سے ان کا منتخب ہونا محال ہوگا اس لئے بہترین صورت یہی ہے کہ اپنی تنقید کی قابلیت کو معطل ہو جانے دو اور حکومت ہی کے ساتھ ووٹ دو۔

موجودہ ہاؤس آف کامنز کی ساخت کے متعلق بعض اہل فکر نے یہ اعتراض عاید کیا ہے کہ اس کا طریق انتخاب اس قسم کا ہے کہ قوم کی صحیح نمائندگی اس کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔

بالخصوص ریمزے میور نے اس باب میں جو تحقیق کی ہے وہ قابل غور ہے[1]۔ ریمزے میور اور ان کے ہم خیال لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ طریق انتخاب سے قوم کے صرف ایک حصے کی نمائندگی ممکن ہے۔ رائے دینے والوں کو اس کا موقع حاصل نہیں ہے کہ وہ قابل اور اعلیٰ سیرت رکھنے والے افراد کو اپنی نمائندگی کے لئے منتخب کر کے بھیجیں۔ موجودہ انتخاب کا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو ۵۹۵ حلقہ ہائے انتخاب میں تقسیم کر دیا گیا ہے جن میں صرف ۱۸ حلقے ایسے ہیں جن سے دو دو نمائندے منتخب ہو کر آتے ہیں۔ باقی سب حلقوں سے ایک ایک نمائندہ منتخب ہوتا ہے۔ اگرچہ حلقہ ہائے انتخاب میں رقبہ اور آبادی کا کہیں کہیں تھوڑا بہت فرق پایا جاتا ہے لیکن حتی المقدور سب حلقوں کو دونوں اعتبار سے برابر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معمولاً ہر حلقہ میں ۵۰ ہزار رائے دینے والے ہوتے ہیں۔ ہر حلقے سے جتنے امیدوار چاہیں انتخاب کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے کے مجاز ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اس حلقہ کے باشندے ہوں۔ صرف یہ لازمی ہے کہ ان کے نام کو اس حلقہ کے دس رائے دینے والے اپنے دستخط سے پیش کر دیں۔ موجودہ طریق انتخاب کے مطابق یہ ممکن ہے کہ اگر تین پارٹیاں ہاؤس آف کامنز کے انتخاب میں حصہ لے رہی ہوں تو ایک پارٹی جس نے مجموعی طور پر دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں ووٹ حاصل کئے ہوں ایک نشست بھی حاصل نہ کر سکے۔ اسی طرح ہر حلقہ کے انتخاب میں مجموعی طور پر کم ووٹ حاصل کرنے والا منتخب ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک رکن کو ۱۵۰۰۰ ووٹ حاصل ہوئے، دوسرے کو ۱۴۹۹۹ تیسرے کو ۱۴۵۰۰ اور چوتھے کو ۱۰۵۰۰ تو پہلا امیدوار کثرت رائے سے منتخب سمجھا جائیگا اور اس حلقہ کے تمام رائے دینے والوں کا نمائندہ تصور کیا جائیگا۔ وہ ان کا بھی نمائندہ تصور ہوگا جنھوں نے اس کے خلاف رائے دی ہوگی جن کی تعداد ان سے زیادہ ہے جنھوں نے اس کی تائید

---

[1] دیکھو تفصیل کے لئے ریمزے میور کی کتاب How Britain is Governed ص ۱۶۲ تا ۱۸۴۔

کی ہے۔ انتخاب کے اس طریق کار کی تنظیم پارٹی بندی کے اصول پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جس پارٹی کو ملک میں نسبتاً کم ووٹ ملے وہ ہاؤس آف کامنز میں اکثریت حاصل کرلیتی ہے اور حکومت قایم کرتی ہے۔ جنگ عظیم کے بعد اس کی دو مثالیں ملتی ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں اتحادی پارٹی (کولیشن کیبنٹ) نے ہاؤس آف کامنز میں ۴۷۴ نشستیں حاصل کی تھیں اور ان کے مخالفوں نے ۲۳۰ نشستیں حاصل کیں یعنی ہاؤس میں ۴ اور ۱ کا تناسب رہا حالانکہ اتحادی پارٹی نے ملک کے تمام انتخاب کرنے والوں کے ۵۲ فی صدی ووٹ حاصل کیے تھے اور ان کے مخالفوں نے ۴۸ فی صدی۔ اگر کل رائے دینے والوں کے تناسب سے دونوں پارٹیوں کو ہاؤس میں نشستیں ملتیں تو اکثریت رکھنے والی پارٹی کو ۳۴۴ نشستیں حاصل ہوتیں اور اس کو ۳۰ کی اکثریت حاصل ہوتی۔ لیکن کولیشن پارٹی نے ہاؤس آف کامنز جتنی نشستیں حاصل کیں ان کی بدولت اس کو سیاہ وسفید کا اختیار حاصل ہوگیا۔ ۱۹۲۲ء کے انتخاب میں قدامت پسندوں کو ملک کے مجموعی ووٹوں کے ۳۸ فی صدی ووٹ ملے لیکن ہاؤس میں ان کے ارکان نے ۳۴۷ نشستیں حاصل کیں اور انھیں دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں ۷۹ کی اکثریت حاصل رہی۔ ۱۹۲۳ء کے انتخاب میں اگرچہ قدامت پسندوں نے ملک کے مجموعی ووٹوں کے ۳۸ فی صدی پھر حاصل کیے لیکن اس دفعہ ان کی نشستیں گزشتہ انتخاب کے مقابلے میں ۹۰ کم ہوگئیں۔ اس دفعہ ہاؤس میں انھیں اکثریت نہیں حاصل رہی اور لیبر پارٹی نے اپنی حکومت قایم کی۔ ۱۹۲۴ء کے انتخاب میں لیبر پارٹی نے ۱۵۱ نشستیں حاصل کیں حالانکہ ان کے امیدواروں کو مجموعی طور پر جو ووٹ ملے ان کے حساب سے انھیں ۱۸۹ نشستیں ملنی چاہیئے تھیں۔ اسی طرح ۱۹۲۹ء کے انتخاب میں لیبر پارٹی نے ہاؤس میں ۲۸۸ نشستیں حاصل کیں حالانکہ کل ووٹوں کے ۳۶ فی صدی ووٹ اس کو ملے تھے اور قدامت پرستوں کو مجموعی ووٹوں کے ۳۸ فی صدی ووٹ ملے۔ اس طرح لیبر پارٹی ہاؤس آف کامنز کی سب سے بڑی پارٹی ہوگئی۔ برخلاف اس کے اسی انتخاب میں لبرل پارٹی نے ووٹوں کی تعداد کے ۲۳ فی صدی ووٹ حاصل کیے جس کے اعتبار سے ہاؤس میں

انھیں ۱۴۱ نشستیں ملنی چاہیئے تھیں لیکن انھیں صرف ۸۰ نشستیں ملیں۔ اس انتخاب میں اگر مجموعی ووٹوں کی مناسبت سے مختلف پارٹیوں کو ہاؤس آف کامنز میں نشستیں ملتیں تو قدامت پسند ۳۴۱، لبرل ۱۴۱ اور لیبر پارٹی ۲۲۴ نشستیں حاصل کرتے۔ غرضکہ لیبر پارٹی نے باوجود ملک میں کم ووٹ حاصل کرنے کے اپنی حکومت قایم کرلی[1]۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہر انتخاب ایک طرح کا جوا ہوتا ہے جس میں ہر قسم کے امکانات ہوتے ہیں۔ کبھی پانسہ ایک پارٹی کے موافق پڑتا ہے اور کبھی دوسری کے۔ قوم کی قسمت کا فیصلہ اکثر و بیشتر سوچنے سمجھنے والوں اور معاملات پر رائے رکھنے والوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ ان ناسمجھ، جاہل اور متلون عوام کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو بلند آہنگ دعوؤں اور ناقابل وعدوں سے متاثر ہو کر کبھی کسی پارٹی کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں اور کبھی کسی کے ساتھ۔

۱۹۱۸ء میں جبکہ حقوق رائے دھندگی کی توسیع کے متعلق تحقیق ہو رہی تھی تو اس مسئلہ پر بھی اسپیکرس کانفرنس میں غور کیا گیا کہ انتخابات کی مذکورہ بالا خرابیوں کو کس طرح دور کیا جائے اور کیا تدابیر اختیار کی جائیں کہ ہاؤس آف کامنز صحیح معنوں میں قوم کا نمائندہ بن سکے۔ اس کانفرنس نے اس ضمن میں جو تجاویز پیش کیں وہ تناسبی انتخاب[2] سے ملتی جلتی تھیں جس کی وجہ سے انگلستان کے طریق انتخاب میں دوررس تبدیلی پیدا ہوتی۔ لیکن چونکہ ملک دونوں اہم اور بڑی سیاسی پارٹیاں یعنی کنزرویٹو اور لیبر ان تجاویز کے خلاف تھیں اس لئے ان پر عمل نہیں کیا گیا۔ یہ دونوں پارٹیاں یہ چاہتی ہیں کہ انتخاب کے موجودہ طریق کار کو برقرار رکھا جائے اور اسے چھیڑا نہ جائے اس واسطے کہ اس سے بڑی پارٹیوں کو فائدہ ہے۔ اگر نقصان ہے تو لبرل پارٹی کو ہے۔ تناسبی انتخاب میں بڑی پارٹیاں نقصان میں رہیں گی اور لبرل پارٹی فائدہ میں رہے گی۔ قدامت پسندوں اور لیبر پارٹی والوں کا خیال ہے کہ

---

[1] How Britain is Governed

[2] Proportional Representation

موجودہ طریق انتخاب کی بدولت لبرل پارٹی ختم ہو جائے گی اور اس کے ارکان ان دونوں میں اپنے اپنے رجحانات کے مطابق ضم ہو جائیں گے اور انگلستان کا دو پارٹی والا نظام جو قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے وہ پھر قائم ہو جائے گا۔

اگرچہ یہ کہنا درست ہے کہ ہاؤس آف کامنز کی بحثیں اب محض دکھاوے کی رہ گئی ہیں۔ ان کا مقصد یہ نہیں رہا کہ مخالفوں کی رائے میں تبدیلی کی جائے لیکن تقریروں اور بحثوں سے یہ ضرور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنے دل کے بخار نکالنے کا موقع مل جاتا ہے اور انتخاب کرنے والوں کے سامنے مختلف پارٹیوں کے ارکان کے دلائل اخبارات کے ذریعہ آجاتے ہیں اور وہ ان کے متعلق اپنی رائے قایم کرسکتے ہیں۔ بقول لاسکی "ان بحثوں کی بدولت اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ جب اہم مسائل معرض تنقید میں آئیں گے تو ہر موضوع کے متعلق جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ (ہاؤس آف کامنز میں) کوئی نہ کوئی شخص ضرور کہدے گا۔"[1]

انگریز قوم کا آج بھی اس بات پر ایقان ہے جبکہ دنیا میں ہر طرف مطلقیت دستکاری جارہی ہے کہ لوگوں کی مرضی اور بحث و تنقید کے ذریعہ جو حکومت کی جاتی ہے وہ اس حکومت سے بدرجہا بہتر ہے جو اپنے مخالف کو حجت پیش کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ انگریزوں کو اس کا قوی احساس ہے کہ آزادی رائے کو اپنے اظہار کے پورے مواقع حاصل ہونے چاہئیں اس لئے کہ اس کی بدولت امن عامہ مضبوط بنیادوں پر قایم رہ سکتا ہے۔ اس کے سبب سے ہر سیاسی پارٹی کو یہ حق حاصل رہتا ہے کہ وہ قوم کی اکثریت کو اپنے ساتھ کرے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالے۔ چنانچہ ۱۸۳۲ء سے آج تک کوئی سیاسی پارٹی دس سال سے زائد بیک وقت اپنے ہاتھ میں اقتدار نہیں رکھ سکی اس طرح ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں کو اپنی مملکت کی خدمت کا موقع حاصل رہتا ہے اور خود

---

[1] - پارلیمنٹری گورنمنٹ ان انگلینڈ۔ ص ۱۴۲۔

مملکت کی حیثیت ایک بے تعلق اور غیر جانبدار عنصر کی رہتی ہے[1]۔ باوجود ان تمام رکاوٹوں کے جو پارٹی بندی کے سبب سے انفرادی اقدام پر عاید ہوگئی ہیں ہاؤس آف کامنز آج بھی دفتر شاہی حکومت کو غفلت سے بیدار کرنے اپنے فرائض منصبی کو بجالانے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ ہاؤس آف کامنز چاہے حکومت کو انصاف کرنے اور ٹھیک بات کرنے پر مجبور نہ کرسکے لیکن اس کا اطمینان ضرور رہتا ہے کہ اس کے خلاف جو الزام لگائے جائیں گے ان کی صفائی پیش کی جائیگی اور معاملات کی پوری طرح چھان بین ہوگی جس کا نتیجہ مفاد عامہ کے لئے ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔

---

[1] پارلیمنٹری گورنمنٹ ان انگلینڈ ص ۱۸۱۔

جدید چین

از

عبداللطیف اعظمی، بی اے (جامعہ)

آج سے ۴۲ سال قبل ۱۹۱۱ء میں چالیس صدیوں کی شہنشاہیت کے بعد، بالآخر چین میں جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالی گئی۔ جمہوریت کے قیام کے مختلف اسباب تھے، جن کو سمجھنے کے لئے، چین کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ مگر چین کی تاریخ اس قدر طویل اور وسیع ہے کہ اس پر یہاں بحث وتنقید کرنا ممکن نہیں، اس لئے ابتدائی ۴۰۰۰ سال کو نظر انداز کرتے ہوئے، ۱۶۴۴ء سے ہم ابتدا کرتے ہیں، جبکہ مانچو خاندان شمال کی طرف حملہ آور ہو کر تخت پر قابض ہوا۔

منچو خاندان چینی نہیں تھا، مگر اس کے شہنشاہ بہت جلد چینیوں میں گھل مل گئے اور ان کی بہت سی خصوصیات اختیار کرلیں، مگر لباس اور طور طریق کا امتیاز پھر بھی باقی رہا اور چینیوں کی نفرت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۸۴۲ء سے سنہ [illegible] تک کی تباہ کن جنگوں نے زبانِ پاکسر کی ذلتوں میں اور اضافہ کر دیا اور شاہی خاندان کے وقار کو بالکل ختم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب و تمدن کا رعب لوگوں کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ تائی پنگ کی بغاوت جو چند سال (۶۴-۱۸۵۰) [illegible]

لاکد ؟

جنگ عظیم سے بھی زیادہ مصیبت خیز اور المناک ثابت ہوئی۔ اس میں Putnan weale کے تخمینہ کے مطابق تقریباً ڈیڑھ سو ملین آبادی کام آئی۔ ایک عرصہ تک منچو شہنشاہ اس پر قابو حاصل نہ کر سکے، آخر میں گارڈن کی مدد سے اسے دبانے میں کامیاب تو ہو گئے، مگر اس میں ان کی طاقت بالکل ختم ہو گئی۔ اس کے بعد جاپان سے چین کی شکست (۱۸۹۴-۵ء) اور باکسر کی پیدا شدہ طاقتوں (۱۹۰۰ء) نے چینیوں کی آنکھیں کھول دیں اور ملک کے مفکرین کو شاہی نظام حکومت سے زیادہ بہتر اور مستحکم نظام حکومت بنانے کی دعوت دی۔ لیکن ترقی کی رفتار پھر بھی بہت سست رہی، یہاں تک کہ تحریک باکسر کے گیارہ سال کے بعد یکایک انقلاب پھوٹ پڑا۔

۱۹۱۱ء کا چینی انقلاب، انگلستان کے ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، اگر روس اور فرانس کے انقلاب سے بالکل مختلف ہے، یہ انقلاب بر ژوازی یا صاحب جائداد طبقہ کے خلاف نہیں تھا، بلکہ ایک مخصوص سیاسی نظام کے خلاف تھا، جو چار ہزار سال سے چین میں قایم تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملکیت جنگ اور فساد کا باعث ہوتی ہے اور عوام کو جب زندگی کو قایم رکھنے کے لئے روٹی اور تن ڈھکنے کے لئے کپڑا نہیں ملتا، تو ملک داخلی بدنظمی اور فساد کا شکار ہو جاتا ہے اور جب تک کوئی ایسا نظام قایم نہ ہو جائے جس میں پس ماندہ طبقہ کو زندگی کا حق حاصل ہو، یہ بے چینی اور اضطراب برابر قایم اور بڑھتا رہتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انقلاب چین میں یہ اسباب بھی بہت حد تک کام کر رہے تھے مگر ان کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ انقلاب کے بانی عوام نہیں تھے، بلکہ ملک کے سربرآوردہ سیاست داں، جو ایک مخصوص سیاسی نظام کی جگہ ایک ایسے نظام حکومت کی طرح ڈالنا چاہتے تھے، جو محض چینیوں ہی کے لئے نیا نہیں تھا، بلکہ دوسری نسلوں کے لئے بھی۔

اس انقلاب میں داخلی اور خارجی دونوں اسباب کام کر رہے تھے۔ داخلی وجہ دو تھی، ایک منچو کی غیر ملکی حکمرانی تھی، چینی عوام کی یہ ممتاز خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے جابر حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ چنانچہ ان میں (۹۲-۱۷۳۶ء) کے

تمام جانشین شہنشاہ معمولی قابلیت کے تھے، اس لئے ٹھیک طور پر حکومت نہ کرسکے اور تیپنگ کی مشہور بغاوت ہوئی جس میں دس صوبے تباہ ہوئے اور تقریباً بیس لاکھ آدمی کام آئے۔ اسی طرح باکسر تاریخ چین کی نہایت مشہور بغاوت ہے جس میں چین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ چینیوں کے دل میں خارجی طاقتوں کے خلاف سخت نفرت اور عداوت پیدا ہوگئی تھی جس میں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا۔

خارجی اسباب میں، اہم سبب یہ تھا کہ منچو حکومت، دوسرے ممالک سے اچھے تعلقات قایم رکھنے میں انتہائی نااہل ثابت ہوئی، جنگ کی شکستیں اور مصائب، سلطنت کی وسعت میں برابر کمی، خارجی طاقتوں کے امتیازی حقوق، یہ تمام چیزیں، چین کی آزادی کے لئے عظیم خطرہ تھیں، اور چینی مفکرین کو منچو حکومت کی اصلاح پر مجبور کرتی تھیں، علاوہ ازیں جاپان کی بڑھتی ہوئی ترقی اور روس پر اس کی فتح سے چینیوں کے دل ودماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر وہ ملک کو جدید طریقوں سے منظم کریں تو وہ خارجی دباؤ کا مقابلہ کرسکتے ہیں انھوں نے محسوس کیا کہ اس طرح نہ صرف یہ کہ ایک آزاد قوم کی انھیں حیثیت حاصل ہو جائے گی، بلکہ جدید دور ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش وہ کھڑے ہوسکیں گے۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی انھوں نے حکومت سے داخلی اصلاحات کا مطالبہ کیا، لیکن جب حکومت نے ان کے مطالبہ کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا تو انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے، بغاوت کے علاوہ اور کوئی راہ نظر نہیں آئی۔

سن یات سین پہلا شخص تھا جس نے منچو خاندان کو ختم کرنے اور جمہوری طرز حکومت قایم کرنے کے لئے انقلابی جماعتیں منظم کیں اور انقلاب کے لئے باقاعدہ اسکیم تیار کی۔ انھوں نے کینٹن پر قبضہ کرنے کی بار ہا کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوسکی، اس جرم میں اسے بارہا جلاوطنی کی سزا ملی، اس سے ایک فائدہ ہوا، وہ یہ کہ ان چینیوں میں ان کے بہت سے

Modern china by Sih-Gungcheng

ہم خیال پیدا ہو گئے جو غیر ممالک خصوصاً امریکہ اور جاپان میں تھے اور یہ واقعہ ہے کہ انقلاب چین میں ان کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو ووچنگ (صوبہ ہوپے) میں وائسرائے کے قتل کی ایک سازش کا انکشاف ہوا۔ سازش کرنے والوں نے عجلت اور مایوسی کے عالم میں بغاوت کر دی۔ اس کارروائی کے چند ہی گھنٹے کے اندر شہر پران کا پورا قبضہ ہو گیا، وائسرائے بھاگ گیا اور صوبہ جاتی فوج کا بڑا حصہ غدر میں شریک ہو گیا۔ اس کی اطلاع پاتے ہی شاہی حکومت نے جنرل ین چانگ اور وزیر جنگ کو شمالی فوج کے چند ڈویژن کے ساتھ (جس میں تقریباً ۲۰۰۰۰ سپاہی تھے) باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، لیکن ان کے پہنچنے سے قبل صوبے کے بہت سے شہروں پر باغیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور دوسرے صوبوں نے شاہی حکومت سے تعلقات منقطع کر کے بغاوت میں شریک ہو گئے تھے۔

حالات اس قدر نازک ہو گئے تھے کہ ان پر قابو حاصل کرنا ناممکن ہو گیا، اس لئے پرنس ریجنٹ نے نامزد نیشنل کونسل کو بہت سے حقوق دیئے، دستور کا اعلان کیا، جس میں شہنشاہ کے اختیارات کو کم کر کے، اسے محض برائے نام باقی رکھا اور حکومت کے تمام اختیارات منتخب لیجسلیچر کو دیئے۔ یان شی کائی کو، جسے اسی سال وزارت امور خارجہ سے علٰحدہ کیا گیا تھا، دوبارہ بلا کر وزیر اعظم مقرر کیا اور خود حکمرانی سے علٰحدہ ہو گیا۔ یان شی کائی چین کی جدید فوج کا بانی تھا، اس لئے کمانڈر اور فوج سب کے سب اس کا بہت احترام کرتے تھے، اس کے علاوہ متعدد صوبوں میں وہ وائسرائے کے منصب پر بھی فائز رہ چکا تھا، اس لئے توقع تھی کہ جدید وزیر اعظم کے ان اثرات کی وجہ سے عوام کے اس بڑھتے ہوئے جوش و خروش کے باوجود ایک بڑی تعداد شاہی حکومت کی حامی ہو جائے گی۔

یان شی کائی اپنے وطن ہونان سے پیکنگ میں وقت پہنچا، تو انقلاب نہایت نازک حد تک پہنچ چکا تھا۔ تقریباً تیرہ صوبے بغاوت میں شریک ہو چکے تھے اور قریب قریب نصف سلطنت متاثر ہو چکی تھی۔ جدید لئے ہانگسی سے کے جنوب میں انقلاب سے قابل آگ کی طرح ایک

ضلع سے دوسرے ضلع میں نہایت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ہنگ کاؤ اور بہت سے شہروں کی عمارتوں اور دفتروں پر جمہوریت پسندوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا، جن پر لکھا ہوا تھا کہ "منچو شہنشاہوں کو نکال باہر کرو۔"

اگرچہ انقلابیوں نے شاہ پسندوں کو پریشان کر دیا تھا اور بہت سے صوبوں کی انھیں حمایت حاصل ہو گئی تھی، مگر وہ فوجی اور مالی دونوں حیثیتوں سے شاہ پسندوں کے مقابل میں کمتر تھے۔ شمالی فوج، جو اب بھی شہنشاہ ——— یا جدید وزیر اعظم ——— کی وفادار تھی، انقلابی رنگروٹوں یا جنوبی فوج کے مقابل میں زیادہ منظم اور بہتر تربیت یافتہ تھی، چنانچہ جب ہانکو کے قریب ان دونوں فوجوں میں تصادم ہوا، تو شاہی فوجوں نے ہانکو اور ہین یانگ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور اس کا سب کو یقین ہو گیا تھا کہ ووچنگ پر بھی قبضہ ہو گیا ہے اور انقلابیوں کی کمر ہمت ٹوٹ چکی ہے، مگر اسی درمیان میں دونوں جانب سے صلح کی خواہش ظاہر کی گئی (دسمبر ۱۹۱۱ء) چنانچہ جانبین سے نمایندے بھیجے گئے اور شرائط صلح پر غور کرنے کے لئے شنگھائی میں صلح کانفرنس منعقد ہوئی۔ انقلابیوں کا، شہنشاہ کی تخت سے دست برداری اور جمہوریہ کے قیام پر اصرار تھا اور شاہ پسندوں کا اس پر اصرار تھا کہ طرز حکومت، ایک نیشنل کنونشن کے ذریعہ طے کیا جائے ——— (اور یہ واقعہ ہے کہ یہ نیشنل کنونشن کبھی بھی منعقد نہیں ہوا۔)

یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو نانکنگ میں جمہوری حکومت قایم کر دی گئی۔ ڈاکٹر سن یات سین کو صدر بنایا گیا۔ باغی صوبوں کے نمایندوں کی ایک اسمبلی بنائی گئی، جسے جمہوریہ کی پارلیمنٹ کی حیثیت حاصل تھی اور ایک عارضی دستور کا مسودہ تیار کیا گیا جس کا اسمبلی کی منظوری کے بعد اعلان کر دیا گیا۔ اس موقع پر یان شی کائی نے، شاہی حکومت کی طرف سے حسب ذیل اعلان کیا:

مجھے شبہ ہے کہ چین کے عوام فی الحال جمہوریہ کے لئے موزوں ہیں۔

موجودہ حالات میں چینی عوام کے لئے جمہوری طرز حکومت منظور کرنا ...

... اور شاہی حکومت کی منظوری سے حالات معمول پر آ جائیں گے۔

اور حکومت کو کم سے کم وقت میں استحکام حاصل ہوجائے گا۔ بہ نسبت ایسے طرز حکومت
کے جیسے ابھی تجربہ کی منزلوں سے گزرتا ہے اور جو کم از کم موجودہ حالات میں چین
جیسے ملک کے لئے بالکل ناموزوں ہے ..... موجودہ شہنشاہ کو باقی رکھنے
کی حمایت بھی اس لئے کر رہا ہوں کہ میں دستوری شہنشاہی کا قائل ہوں۔ اگر
ہم نے اس طرز حکومت کو اختیار کر لیا تو شہنشاہ کے علاوہ اور کوئی شخص
ایسا نہیں ہے، جس پر قوم اتفاق کرے گی ... میرا مقصد صرف یہ ہے کہ
اس نازک موقع پر چین کو فنا ہونے سے بچا لیا جائے اور ان تمام خرابیوں
سے جو اس کے بعد آنے والی ہیں۔"

مگر جمہوریت پسند کسی حالت میں بھی اپنے مطالبہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے، خصوصاً ایسی حالت میں، جبکہ تیرہ صوبوں نے جمہوریہ کو قبول کر لیا تھا اور جمہوریہ کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا جا چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہن یانگ پر قبضہ کرنے کے بعد، یان شی کائی نے انقلابیوں کو دبانے کی کوشش نہیں کی، اس لئے کہ شاہی حکومت سے زیادہ اسے اپنے شہنشاہ بننے کی فکر تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جمہوریت پسندوں کو اپنے مطالبہ پر اصرار تھا اور یان کی فوج میں اتنی قوت نہیں تھی کہ مخالف طاقت کو دبا سکے۔ اگرچہ یان شی کائی نے ان خیالات کو بے بنیاد قرار دیا ہے لیکن جمہوریہ کے چوتھے سال (۱۹۱۵ء) اس نے اپنی شہنشاہیت کے لئے جو کوششیں کیں، اس سے اس خیال کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے۔

بہر حال صلح اور شہنشاہ کی پنش وغیرہ کی گفت و شنید میں جنوری (۱۹۱۲ء) کا پورا مہینہ ختم ہو گیا۔ بالآخر یان اور جمہوریہ کے درمیان طے پایا کہ شاہی خاندان کو ..... سالانہ پنشن ملا کرے گی اور شہنشاہ کو پیکنگ کے شاہی محل میں رہنے کی اجازت ہوگی اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔

اس انقلاب کے بعد جمہوریت پسندوں کے رہنما اور انقلاب کے اہم بانی سن یات سین چین کے عارضی صدر منتخب ہوئے لیکن شمالی فوج اب تک شاہی خاندان کی وفادار

تھی، اس سے انقلابیوں کی ان کے سامنے کوئی پیش نہیں گئی۔ ان کے کمانڈر انچیف یان شی کائی نے اس نازک موقع پر نہایت چالاکی اور تدبر سے کام لیا۔ اس نے اس شرط پر جمہوریت کو تسلیم کر کے انقلابیوں سے صلح کرلی کہ سن یات سین کی بجائے اسے صدر بنایا جائے چنانچہ ۱۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو اسے صدر منتخب کر لیا گیا۔ جنوبی چین کے مقابلے میں شمالی چین کی آبادی کا بیشتر حصہ فوجی تھا اور اسے شی کائی نے جدید طریقے پر تربیت دی تھی، اس لئے قدرتی طور پر شمالی چین کا اسے پورا اعتماد حاصل تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس اعتماد کے حصول میں ملک کے مفاد سے زیادہ اس کی خود غرضی کو دخل تھا، لیکن اس کے مرنے کے بعد، ملک میں جو انتشار اور افراتفری پھیلی ہے اس کے پیش نظر، اس کی پالیسی اور طریق عمل کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

جمہوریہ کا کام چلانے کے لئے، ایک عارضی دستور بنانے کے لئے دستور ساز مجلس کا تقرر عمل میں آیا، جس نے اپنا کام کرنے کے بعد، باقاعدہ منتخب شدہ پارلیمنٹ کے لئے جگہ خالی کر دی جو اپریل ۱۹۱۳ء میں مستقل دستور وضع کرنے کے لئے منعقد ہونے والی تھی۔

پارلیمنٹ کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ عارضی دستور کی جگہ ایک مستقل دستور وضع کرے۔ پارلیمنٹ میں انقلاب پسندوں کی اکثریت تھی، جن کا خیال تھا کہ صدر، دل سے جمہوریت کا حامی نہیں ہے بلکہ محض حالات نے اسے حمایت پر مجبور کیا ہے، اس لئے انھوں نے دستور میں ایسی قیود اور پابندیاں رکھنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے حکومت کے جملہ اختیارات پارلیمنٹ کو حاصل ہوں اور صدر اور اس کی کابینہ پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہو۔ یان شی کائی ملک پر حقیقی حکومت کرنا چاہتا تھا، نہ کہ ایسا عہدہ دار بننا جس کے اختیارات محض برائے نام ہوں، اس لئے اس نے مجوزہ دستور کی انقلابیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو اپنی رائے سے آگاہ کرنے کے لئے ان کے پاس نمائندے بھیجے مگر پارلیمنٹ نے اس کے احتجاج کی مطلق پروا نہیں کی اور اس کے نمائندوں کی اس مداخلت کو پارلیمنٹ کے خلاف دستور تصور کیا۔

یان شی کائی کے لئے یہ مرحلہ بہت ہی مشکل تھا، مگر اسے اپنے مقصد میں کسی نہ کسی طرح

کامیابی حاصل کرنی تھی، اس لئے وہ نہایت خوشی سے اس کام کرنے کے لئے بھی تیار ہوگیا۔ حکومت کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قایم کرنا اور خالی خزانے کو پر کرنا، اس کے لئے نہایت ضروری تھا اور اس کی آیندہ کامیابیوں کا تمام تر دارومدار محض انھی دو امور پر تھا۔ پہلے مقصد کے لئے اس نے تربیت یافتہ اور قابل اعتماد دوستوں کو کابینہ میں جگہ دی، مگر عارضی دستور کے مطابق کابینہ کے ممبروں کی نامزدگی کے لئے پارلیمنٹ کے ایوان کی منظوری ضروری تھی اور پارلیمنٹ کی اکثریت اس کی مخالف تھی، اس لئے مجوزہ فہرست میں سے بہت سے نام خارج کر دیئے گئے۔ دوسرے مقصد کے سلسلے میں اس نے پیکنگ کے خارجی بینکوں سے گفت وشنید شروع کی، مگر یہاں بھی پارلیمنٹ راہ میں حائل تھی۔ عارضی دستور کی رو سے یا انقلابیوں کی تاویل کے مطابق وہ پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر کوئی قرضہ نہیں لے سکتا تھا، مخالفت کے ڈر سے اس نے پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر ہی قرضے کے معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ پارلیمنٹ کے انقلاب پسند ممبروں نے اسے دستور کی مخالفت تصور کیا اور انقلابی جماعت کے ممتاز ممبروں نے یان کی مخالفت میں باقاعدہ تحریک شروع کر دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شانگھائی میں بغاوت یا بہ الفاظ دیگر دوسرا انقلاب پھوٹ پڑا اور ایک دو ہفتہ میں یانگ ٹسے کے پانچ صوبے اس میں شریک ہوگئے۔

باغیوں کے ساتھ جنوب کی بہت سی فوجیں شریک ہوگئی تھیں اور انھوں نے ملک کے خاصے حصہ پر قبضہ کر لیا تھا لیکن صدر نے شمالی فوج کی مدد سے تین مہینے کے اندر بغاوت کو ختم کر دیا۔ اس غیر معمولی کامیابی سے اس کے وقار اور رعب کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا اور پارلیمنٹ کے بہت سے ممبروں کو، جو جنوبی چین چلے گئے تھے، پیکنگ واپس آنے کی جرات نہیں ہوئی اور جو واپس آئے یا جنھوں نے بغاوت میں کھلم کھلا حصہ نہیں لیا تھا، ان کا رویہ بہت صلح جویانہ اور معتدل ہوگیا۔ دستور کا مسودہ اب بھی نا تمام تھا۔ ملک میں امن پیدا کرنے اور جمہوریت کو خارجی طاقتوں سے منظور کرانے کے لئے جدید انتخاب اور مستقل صدر کی مسند نشینی نہایت ضروری تھی۔ مستقل دستور کے مسودہ کو مکمل کرنے

اور پھر سے دستور کو قانونی حیثیت دینے کے لئے کافی وقت کی ضرورت تھی، اس لئے طے کیا گیا کہ وہ حصہ جس کا تعلق صدر کے انتخاب سے ہے، اسے پہلے منظور کرا کر شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ ۵ / اکتوبر ۱۹۱۳ء شائع کر دیا گیا اور انتخاب کا کام پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کے سپرد کر دیا گیا۔ ۱۰ / اکتوبر کو یوان شائی کائی جمہوریہ کا پہلا صدر منتخب ہوا۔

اپنی پوزیشن کو محفوظ اور مضبوط کرنے کے لئے صدر نے پارلیمنٹ کے ان تمام ممبروں کو، جو انقلابی جماعت کومن تانگ سے تعلق رکھتے تھے، علیحدہ کر دیا اور ان کی خالی نشستوں کے لئے جدید انتخاب کا اعلان کیا، مگر یہ انتخاب کبھی بھی عمل میں نہیں لایا گیا۔ اس کے بعد عارضی دستور کی نظر ثانی کے لئے ایک کونسل نامزد کی گئی۔ ذمہ دار کابینہ ختم کر دی گئی اور صدر، پارلیمنٹ کی بجائے قوم کے سامنے جواب دہ سمجھا گیا، وزیر اعظم، سکریٹری آف اسٹیٹ ہو گیا اور کابینہ کے تمام ممبر اس کے ماتحت کر دیئے گئے۔ سینٹ کے ممبر جنھیں صوبجاتی اسمبلیوں نے منتخب کیا تھا نامزد کئے جانے لگے اور ایوان ادنیٰ کے اختیارات بہت زیادہ محدود کر دیئے گئے۔

ایوان نمایندگان کا اجتماع چونکہ ابھی زیر غور تھا، اس لئے انتخاب کے جدید قانون کی روسے، سینٹ کو پارلیمنٹ کے فرائض انجام دینے کا حق دیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں صدارتی انتخاب کا جو قانون شائع کیا گیا تھا، اسے منسوخ قرار دیا گیا اور اس کی بجائے، دوسرا قانون منظور ہوا جس میں صدر کو تین جانشین نامزد کرنے کا حق دیا گیا جن میں سے کسی ایک کو پارلیمنٹ منتخب کر سکتی تھی۔

مطلق العنانی کا یہ دور ۱۹۱۵ء تک قایم رہا۔ طرز حکومت اگرچہ جمہوری نہیں تھا، مگر امن و امان قایم کرنے میں بہت مفید ثابت ہوا، صدر نے اپنی پوری طاقت، مخالفت کو ختم کرنے میں صرف کر دی اور ملک کو طاقت یا رشوت کے ذریعہ متحد کر دیا۔ ۱۹۱۵ء کے موسم خزاں میں ایک جماعت "امن کا منصوبہ" (جسے انگریزی میں Peace Planning کہتے ہیں) کے نام سے قایم ہوئی جس کا شروع شروع میں مقصد یہ تھا کہ جمہوری اور شاہی طرز حکومت کے تفصیلی [illegible] کی ترویج یوں ہو کہ علمی طور پر بحث و تنقید کی جائے۔ [illegible]
کرے

کولمبیا یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور اب صدر کے دستوری مشیر کار پروفیسر گڈناؤ نے ایک کتابچہ شائع کیا، جس میں دکھلایا گیا تھا کہ چین کے لئے جمہوری سے زیادہ شاہی طرز حکومت زیادہ موزوں ہے۔ اس جماعت نے اس رسالہ کے نظریوں کو بلاپس وپیش منظور کر لیا اور عوام میں اس خیال کی تلقین و اشاعت شروع کر دی۔ اس زمانہ میں یان شی کائی کے حکم سے سیاسی کام کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد، نقض امن کے بہانے سے، قید اور جلاوطن کی جا چکی تھی، مگر اس جماعت کی کوششوں پر کسی قسم کی پابندی عاید نہیں کی گئی۔ یہی نہیں بلکہ خفیہ ذریعوں سے اس کی پوری طرح ہمت افزائی اور سرپرستی کی گئی اور سرکاری ملازموں اور فوجیوں نے کھلم کھلا یان شی کائی کی شہنشاہیت کے قیام کے لئے جد وجہد شروع کر دی۔ صدر کی درخواست پر سینٹ نے ایک بل پاس کیا، جس میں اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کہ آیا طرز حکومت شہنشاہیت میں تبدیل کر دیا جائے، تمام صوبوں کو ایسے ممبر منتخب کرنے کی ہدایت کی گئی، جس میں مختلف خیالات کے لوگ شامل ہوں، گر ہوں سب کے سب سرکاری اثر و اقتدار میں۔ بیس مختلف مرکزوں سے دو ہزار ممبروں نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ صدر کو شہنشاہ بنایا جائے۔ ابتدا میں صدر نے اس پیش کش کے قبول کرنے میں بہت تامل سے کام لیا، مگر بالآخر قوم کے "مفاد" کی خاطر تخت قبول کر کے، رات کا چین اور دن کا آرام حرام کرنا ہی پڑا (۱۹۱۵ء)۔

اس فیصلہ پر صوبہ یونان میں بغاوت پھوٹ پڑی اور چند مہینوں میں آس پاس کے متعدد صوبوں نے مرکزی حکومت سے تعلقات منقطع کر لئے اور بہت سے وہ لوگ بھی، جو یان شی کائی کی شہنشاہیت کے لئے کوشش کر رہے تھے، اس بغاوت میں شامل ہو گئے۔ اس کامیاب بغاوت کا وہ مقابلہ نہ کر سکا اور اس کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ کہتے ہیں اسی صدمے سے وہ ۱۹۱۶ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

یان شی کائی کے انتقال کے بعد، دستور کے مطابق جنرل لی یان ہنگ جمہوریہ کا صدر منتخب ہوا، مگر اس وقت ملک میں عجیب ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ یان کے مضبوط ہاتھوں کے اٹھتے ہی فوجی گورنروں کو کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے مرکزی حکومت کی اطاعت سے

انکار کردیا اور اپنے اپنے صوبوں کی آبادی کو تخویفی طریقوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب کبھی کوئی خانہ جنگی ہوتی ہے تو کسی اصول کے لئے اور اس کا کوئی نہ کوئی مقصد اور نصب العین ہوتا ہے، مگر اس خانہ جنگی کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ مختلف گورنر مختلف صوبوں میں اپنی مرضی اور منشا کے مطابق حکومت کرنا چاہتے تھے اور بس۔ شمال اور جنوب کے اختلافات بھی کچھ دکھاوے کا کام کر رہے تھے۔ مگر دستور کے وقار اور اہمیت کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔

صوبوں کے فوجی گورنر جنہیں Tuchun کہا جاتا تھا، پیکنگ کی مدافعت میں نہایت جبر و تشدد سے کام لے رہے تھے اور جن اضلاع پر ان کی حکومت تھی، ان میں پوری آزادی سے لوٹ اور غارت گری کر رہے تھے۔ انھوں نے ان محاصل کے علاوہ جنھیں خارجی ممالک وصول کرتے تھے، جیسے نمک کا ٹکس، بقیہ تمام مالیہ روک لیا، وہ محض برائے نام پیکنگ کے متعین کردہ تھے، اور درحقیقت عملی طور پر ان کا وجود محض ان کے صوبوں کی فوج کی حمایت کی وجہ سے قایم تھا۔ مرکزی حکومت تقریباً دیوالیہ ہو چکی تھی اور عام طور پر وہ فوج کی تنخواہیں نہیں دے سکتی تھی، اس لئے وہ لوٹ کھسوٹ سے کام لیتے تھے اور Tuchun کی ناجائز وصول شدہ رقم سے اپنا کام چلاتے تھے، یہ افراتفری ممکن ہے جلد ختم ہو جاتی ہے، مگر جاپان کا مفاد اس میں تھا کہ یہ زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قایم رہے، اس لئے جب کبھی کوئی جماعت کامیاب ہوتی نظر آتی تو جاپان اس کے مخالفوں کی مدد پر آ کھڑا ہوتا۔ ایک مرتبہ پیکنگ میں تین نہایت اہم Tuchun کی ملک کی تقسیم کے لئے کانفرنس منعقد ہوئی اور صدر اور وزیر اعظم کے ساتھ، جو خارجی طاقتوں کی نگاہ میں اب بھی چین کے نمایندے تھے، بہت ہی معمولی اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ ان تینوں "معزز حضرات" کو دارالسلطنت سے رخصت کرنے کے لئے نام نہاد حکومت کو اپنے دیوالیہ خزانہ سے ایک خطیر رقم دینی پڑی، جس کے متعلق اخبارات کا بیان ہے کہ دو ملین ڈالر تھی۔ اس رقم کا بڑا حصہ چانگ سے لن (؟) کو دیا گیا اور تقریباً اتنی ہی رقم جاپان کے ایک آلۂ کار کو دی گئی جس نے اسے لگا لیا، جو اس وقت جماعت میں نہایت سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا۔

چیانگ کائی شیک کا عروج: بہرحال اتحادی جنوب میں ایک مختلف قسم کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ کینٹن جو چینی انتہا پسندوں کا ہمیشہ مرکز رہا ہے، شمالی فوج کی جابرانہ حکومت کا جوا اُتارنے میں کامیاب ہوگیا اور سن یات سین کی صدارت میں ۱۹۲۰ء کے موسم خزاں میں ایک ترقی پسند اور باقاعدہ حکومت قائم کی۔ یہ حکومت محض دو صوبوں پر مشتمل تھی ایک Kwangting پر جس کا دارالسلطنت کینٹن تھا دوسرے Kwangsi. پر۔ شروع شروع میں تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ پورے جنوب پر حاوی ہو جائے گی، مگر صوبہ ہونان کے قریب شمالی جنرل او پائی فو نے اسے آگے بڑھنے سے بالکل روک دیا۔

غرض کہ چین ادھر اندرونی اختلافات اور داخلی نزاعات میں مبتلا تھا، ادھر خارجی مسائل خصوصاً جنگ کے پیدا شدہ حالات پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے جا رہے تھے۔ چین جنگ عظیم میں اتحادیوں کی طرف سے محض اس لئے شامل ہوا تھا کہ جنگ کے بعد اسے اچھے دن نصیب ہوں گے، مگر طاقت، طاقت کے سامنے جھکتی ہے، کمزور، چاہے کتنا ہی مظلوم اور حق پر کیوں نہ ہو، اس کا دنیا میں کوئی حامی اور مددگار نہیں۔ چنانچہ لائڈ جارج، وزیراعظم برطانیہ، مسٹر ولسن صدر امریکہ اور کلے مان شیو، وزیراعظم فرانس نے مشرق میں جاپان کے اقتدار کو تسلیم کر لیا اور چین کو جاپان کے رحم وکرم اور نالہ وشیون کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

ظاہر ہے ان عظیم طاقتوں کے فیصلے کے سامنے چین جیسی کمزور اور غیر منظم حکومت کو سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا، مگر اپنے گر۔ بہ بان، پر۔ بہرحال اس کا زور تھا چنانچہ جاپان کے خلاف چینی عوام کے دلوں میں سخت نفرت پیدا ہوگئی اور انھوں نے جاپان کی جملہ مصنوعات کا نہایت کامیاب بائیکاٹ کیا۔ ملک میں ایک طرف جاپان کے خلاف یہ کوششیں جاری تھیں، دوسری طرف شمال میں فوجی عہدہ دار ذاتی مفاد کے لئے خانہ جنگیوں میں مشغول تھے۔ اس سے بین الاقوامی حالات متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ امریکہ اور جاپان کے تعلقات اس قدر خراب ہوگئے تھے کہ کھلم کھلا جنگ کی گفتگو شروع ہوگئی تھی، برطانیہ، جاپان کا اتحادی تھا، اس لئے اب اس کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ان دونوں میں سے کس کا ساتھ دے۔ ان حالات میں ... [illegible]

عظیم طاقتوں کی واشنگٹن میں کانفرنس بلائی۔ واشنگٹن کانفرنس (۱۲ نومبر ۱۹۲۱ء تا ۶ فروری ۱۹۲۲ء)
میں سات معاہدے مرتب ہوئے، مگر اب ان میں سے صرف دو کو اہمیت حاصل ہے۔ پہلے معاہدے کی
رو سے برطانیہ، امریکہ، جاپان، فرانس اور اٹلی حسب ترتیب ۵ - ۵ - ۳ - ۱،۷۵ - ۱،۷۵
کے تناسب سے اپنے تجارتی یا جنگی جہازوں اور طیارہ بردار جہازوں میں کمی کریں گے۔

اگرچہ اس معاہدہ میں صرف جنگی جہازوں اور طیارہ بردار جہازوں پر پابندی عاید کی گئی
تھی اور کروزر، ڈسٹرائر، آبدوز کشتیاں اور دوسرے معمولی ہتھیار وغیرہ اس سے مستثنیٰ تھے مگر
اس معاہدہ نے تقریباً پندرہ سال کے لئے بحری جنگ کی تیاری کو روک دیا۔ ۱۹۳۰ء میں لندن
میں ایک اور معاہدہ ہوا جس میں چھوٹے جہاز بھی شامل کر دیئے گئے، ان دونوں معاہدوں
کی مدت ۱۹۳۶ء تک تھی۔

دوسرا معاہدہ نو طاقتوں کا معاہدہ کہلاتا ہے، اس پر برطانیہ، امریکہ، فرانس، اٹلی،
بلجیم، ہالینڈ، پرتگال، جاپان اور چین کے نمائندوں نے دستخط کئے۔ اس کی رو سے چین کی
انتظامی اور ملکی سالمیت کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان تمام ملکوں کے لئے مساوی طور پر
چین میں دروازہ کھلا رہے گا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ عالمی طاقتوں نے "کھلے دروازہ" کی پالیسی کو تسلیم کیا۔

ان دو معاہدوں کے علاوہ واشنگٹن کانفرنس نے جاپان کو مجبور کیا کہ وہ سائبیریا سے
اپنی فوجیں واپس بلائے، جرمن اجاروں کو چین کو واپس کر دے اور شانٹنگ میں چین کو مراعات
دے۔ اسی کے ساتھ اینگلو جاپانی اتحاد کو مسترد کر دیا گیا، نیز عظیم طاقتوں نے وعدہ کیا کہ
بحرالکاہل کے اپنے جزیروں میں، دوسرے جزیروں کی خاطر، بحری طاقت میں مزید
اضافہ نہیں کریں گے۔

واشنگٹن کے معاہدوں کے بعد چین کو اندرونی اصلاحات اور باہمی اتحاد و اتفاق
کی فضا پیدا کرنے کا موقع ملا۔ مگر جن کا مفاد ہی اس میں ہو کہ چین میں کبھی امن و امان اور اتفاق
و اتحاد پیدا نہ ہو، وہ اس کا موقع کب دیتے، چنانچہ ان کی دغا اور کوشش سے ۱۹۲۴ء میں پھر
شمال میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔ مارچ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر سن یات سین انتقال کر گئے

کے شدید نقصان ہوا... کو ۱۲ مارچ کو انتقال ہوگیا۔ ان کے بے وقت انتقال سے چین کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور چین ایک مخلص رہنما اور بے لوث خادم سے محروم ہوگیا۔ مگر قوم نے جس گرویدگی اور جوش و خروش سے ان کی تعلیمات اور اصول پر عمل کیا، اس سے ملک کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔

ڈاکٹر سن کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ تک کومن تانگ میں یکجہتی اور شیرازہ بندی رہی، مگر یہ حالت زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکی۔ بہت جلد پھوٹ پڑ گئی اور دو جماعتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک "دایاں بازو" کے نام سے مشہور ہوئی اور دوسری "بایاں بازو"۔ بیگم ڈاکٹر سن، سونگ چنگ لنگ کا بیان ہے کہ "اگر ڈاکٹر سن یات سین اس وقت زندہ ہوتے تو بائیں بازو کا ساتھ دیتے۔" عام طور پر حکومت کے عہدہ دار دائیں بازو کے حامی تھے، کچھ اس لئے وہ اصلاحات کے حامی نہیں تھے اور کچھ اس لئے کہ مستحکم حکومت اور مضبوط فوج کے قیام کو وہ ملک کی اصلاحات پر مقدم تصور کرتے تھے۔ بائیں بازو میں کمیونسٹ تھے جنھیں، جنوری ۱۹۲۴ء میں ڈاکٹر سن نے کومن تانگ میں شامل کر لیا تھا۔ یہ چین کی اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں یکسر انقلاب چاہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ چینی انقلاب سے اس وقت تک کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا، جب تک کہ فوجی نظام کے حامیوں کو قومی تحریک کے ماتحت نہ کیا جائے اور جدید چین کو خارجی کنٹرول سے نجات نہ دی گئی۔ چیانگ کائی شک کو، جو دائیں بازو کے حامیوں میں تھے، سب سے زیادہ سیاسی اتحاد کی فکر تھی، ان کا خیال تھا کہ اب روسیوں کی مدد کی ملک کو چنداں ضرورت نہیں۔ اس پالیسی کی وجہ سے انھیں برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کی حمایت حاصل تھی۔ انگلستان، واشنگٹن اور پیرس انھیں دوسرا کمال اتاترک بننے کی اجازت دے سکتے تھے، مگر دوسرا اشتراکی یا لینین بننے سے ہر قیمت پر روکنے کے لئے تیار تھے۔

بائیں بازو کے لیڈر رانگ چنگ وی اور دائیں بازو کے ہو یان مین۔ ہو یان مین کچھ

صفحہ ۹۴ Pringle. China Struggles for Unity. ۱۔

عرصے کے بعد انتقال ہوگیا تو ان کی جگہ چانگ کائی شک نے لی اور بعد میں وانگ کو شکست دے کر خود کومن تانگ کے صدر بن گئے۔ چانگ کائی شک نے اس کامیابی کے بعد کومن تانگ کی تنظیم کی طرف توجہ کی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک بائیں بازو کے اثر کو بالکل زائل نہیں کیا جائے گا، مقصد میں کسی قسم کی کامیابی حاصل کرنا ناممکن ہے، اس لئے ۱۹۲۷ء میں قومی حکومت کو نانکن میں منتقل کیا، کمیونسٹوں کو ہان کاؤ سے نکالا اور کمیونسٹ جماعت کو خلاف قانون قرار دیا۔ ان کارروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد سن یات سین کی جانشینی کا اعلان کیا اور اس کے تینوں اصولوں کو نئی حکومت کا نصب العین قرار دیا۔ چانگ کائی شک کی ان کارروائیوں سے، اس میں شبہہ نہیں کہ کمیونسٹ جماعت کو بہت زیادہ نقصان پہنچا، ان کو غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور کائی شک کی حکومت میں ان کا وجود ختم ہوگیا، مگر وہ ان نامساعد حالات سے دل برداشتہ ہونے کے بجائے، اپنی تنظیم میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہوگئے چنانچہ کچھ ہی عرصے کے بعد کمیونسٹ جماعت پھر منظر عام پر آگئی۔ چانگ کائی شک کو ان کی قوت توڑنے کے لئے متعدد جنگیں لڑنی پڑیں۔ مگر چین کی سوویٹ حکومتیں ۱۹۳۴ء تک باقاعدہ مقابلہ کرتی رہیں، یہ سلسلہ جب کسی طرح ختم ہوتا نظر آیا اور دوسری طرف جاپان کی دست وبرد کا سلسلہ چین میں برابر بڑھتا جا رہا تھا، تو ملک کے چند بہی خواہوں نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں چانگ کائی شک کو گرفتار کرکے کسی نامعلوم مقام پر نظر بند کر دیا، بالآخر مادام چانگ کائی شک کے تدبر اور ان کی کوششوں سے چانگ کائی شک اور کمیونسٹ جماعت میں صلح ہوئی اور ۲۵ دسمبر کو کائی شک رہا کئے گئے۔ اس صلح کے بعد چین کی خانہ جنگیاں ختم ہوگئیں اور پورا چین ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہوگیا۔ اسی سال (۱۹۳۶ء) جمہوریہ چین کا مکمل دستور شائع کیا گیا اور عوام کی اصلاح وترقی اور ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے نہایت تیزی سے کام شروع ہوا۔ ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو جاپان نے چین پر بغیر کسی وجہ کے حملہ کر دیا۔ اس حملہ سے چین کے سب سیاسی اختلافات بھی جاتے رہے اور پوری قوم نہایت یکجہتی، اتفاق واتحاد کے ساتھ

... دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ ڈاکٹر سن کے بعد چین کا کوئی مسلمہ لیڈر نہیں تھا قوم نے چیانگ کائی شک کو اپنا واحد قائد تسلیم کیا، اور ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دی۔ اس جنگ کو سات سال سے زیادہ ہو چکے ہیں، مگر جاپان جیسی عظیم طاقت، چین جیسے غیر مسلح اور کمزور ملک کو ابھی تک شکست نہ دے سکی، صرف اس لئے کہ چین کی جنگ صحیح معنی میں عوام کی جنگ ہے اور عوام کو شکست دینا آسان نہیں۔

ہندستان کی شماریات آبادی
اور
عمرانیاتی تشریح

ڈاکٹر جعفر حسن، صدر شعبۂ عمرانیات، جامعہ عثمانیہ

گنادے کا مفہوم انسانی آبادی کی گنتی، مختلف معاشی اور سماجی حیثیتوں کی کیفیت، آبادی کی جنسی، عمرداری، پیشہ دری تقسیم، مختلف طبقوں، فرقوں، قوموں، نسلوں، جماعتوں کی تعلیمی و تمدنی کیفیت، بیاہوں اور بن بیاہوں کی تعداد، بیاہ کے وقت ان کی عمریں، بچوں کی تعداد، پہلی اولاد کی پیدائش کے وقت والدین کی عمریں، آخری اولاد کی پیدائش کے وقت والدین کی عمریں، شرح پیدائش، شرح بق، شدید بیماریوں اور وباؤں میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد اور مرنے والوں کی شرح، کل اموات کی تعداد اور شرح، رنڈوؤں اور بیواؤں کی تعداد اور شرح، کمانے اور کھانے والوں کی تعداد، ذرایع معاش، اوسط فی کس آمدنی، سرمایہ یا مقروضیت کی کیفیت، زیر کاشت اور افتادہ زمینوں کا رقبہ، پیداوار فصل، باربرداری کے جانوروں، غذائی جانوروں اور استعمالی جانوروں کی تعداد اور ان کے باہمی

تقابل کو سنسں کہتے ہیں۔ یہ جدید زمانے ہی کی خصوصیت ہے کہ ہر دہائی (دس برسوں کی مدت) کے بعد تمام ترقی پذیر ملکوں میں باضابطہ طور پر آبادی کی تعداد اور نوعیت معلوم کی جاتی ہے اور مختلف معاشی، سماجی، سیاسی، تعلیمی، اخلاقی اور صحت عامہ سے متعلق حقائق کو اعداد و شمار میں واضح کیا جاتا ہے۔ غرض تہذیب و تمدن کے بہتیرے امور پر اعداد و شمار اکٹھا کئے جاتے ہیں اور بسا اوقات صرف اعداد کو دیکھنے اور دوسرے ملکوں کے اعداد سے ان کا مقابلہ کرنے سے بڑی دلچسپ، حیرت انگیز اور بشرط بصیرت، سبق آموز باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

یہ اعداد سبق سکھانے اور اچنبھے میں ڈالنے والے ہوں یا نہ ہوں، مگر وہ دلچسپ ضرور ہیں، کم سے کم ان لوگوں کے لئے جو اپنی تہذیب و تمدن کی اصلیت معلوم کرنا چاہتے ہوں اور جہاں تک ہو سکے حقائق کی روشنی میں اپنی رائے اور فیصلے قائم کرنا چاہتے ہوں۔

سب سے پہلے یہی ذہن نشیں کرنا چاہئے کہ سنسں کو مردم شماری کہنا ٹھیک نہیں! کیوں ٹھیک نہیں؟ اس کے بارے میں سب سے پہلے ایک لطیفہ سنئے!

مردم شماری یا گنتا وا؟

کسی ضلع کی خبر تھی:

"According to the latest census there are 25,000 buffaloes in our district."

دفتر کے سرکاری مترجم نے لکھ دیا:

"حالیہ مردم شماری کے مطابق ہمارے ضلع میں پچیس ہزار بھینسیں ہیں!"

انسانوں کی گنتی سے بھینسوں کی تعداد معلوم کرنا، کیا خوب! اس لطیفے سے ہم یہ سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ مترجم سے زیادہ یہ ہماری زبان کا قصور ہے جس میں Census کے لئے صرف مردم شماری کا لفظ ہے اور یہ لفظ Census کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں۔

آپ جانتے ہیں ہندی میں اسے کیا کہتے ہیں؟ मनुष्य गणना

یعنی (منشیہ گنتر نا) کیسا ثقیل لفظ ہے! سنسکرتیت میں ڈوبا ہوا۔ بوجھل لوہے ... شماری

لہذا ناقص اور نامکمل! جس طرح ہمارے لئے "نشیہ گنرنا" کی ترکیب ناقابل قبول، ویسی ہی مردم شماری کی اصطلاح ہندی والوں کے لئے ناقابل فہم! کیونکہ صرف "مردم" کا لفظ اردو میں استعمال نہیں ہوتا۔ انسان شماری یا آدمی شماری ہوتا تو بھی غنیمت تھا کیونکہ اردو میں کہتے ہی ہیں کہ "دس آدمی آچکے ہیں!" "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!" مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ "دو مردم آچکے ہیں"۔ اس کا ترجمہ ... "۲ مردم ہیں!" چونکہ ہم مردم کا لفظ نہیں بولتے لہذا اس کے سمجھنے میں ہندی والوں کو دقت ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ بدرجہا بہتر ہوگا کہ سنس کو گنا وا کہا جائے جو نہ صرف جامع اصطلاح ہے بلکہ ہندی والوں اور اردو والوں کے لئے یکساں آسان۔ بہر حال آپ مانیں یا نہ مانیں، ایک تجویز تو میں نے پیش کر دی۔ ایسے ہی لفظ ہندی اور اردو کا مشترک سرمایہ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہم بے تعصبی سے ان کا استعمال کریں اور اردو والے فارسیت زدگی سے بچ کر ہندی اردو میں مستعمل لفظوں سے بنائی ہوئی اصطلاحوں کی مخالفت نہ کریں، مردم شماری اور نشیہ گنرنا بوجھل اور کٹھن ہونے کے علاوہ سنس کے پورے مفہوم کو ادا نہیں کر سکتے، اس لئے ایک نیا لفظ ضروری تھا اور میرا خیال ہے کہ اس مفہوم کو گنا وا واضح کرتا ہے جو ہندی اور اردو دونوں کے لئے آسان ہوگا۔

کیا اعداد صحیح ہوتے ہیں — اعداد و شمار کے متعلق یہ طنزیہ فقرہ مغربی ملکوں کے علمی حلقوں میں بہت مشہور ہے کہ

"جھوٹ کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو معمولی جھوٹ،
دوسری جہا جھوٹ اور تیسری اعداد و شمار!"

یہ طنزیہ فقرہ بالکل بے بنیاد نہیں کیوں کہ نا اہلی، مطلب پرستی یا نادانی کی وجہ سے غلط سلط اعداد جمع کرلئے جاتے ہیں یا ان میں عمداً کمی بیشی کی جاتی ہے یا ان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ غلط، متاثرہ اور تبدیل شدہ اعداد کے ذریعہ "استدلال" کرنا صرف اعداد تک مخصوص نہیں ہے، اکثر بیانات، گواہیاں، تحریریں اور نام نہاد علمی مقالے اور تحقیقی کتابیں بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں، کچھ باتیں نا اہل لوگ سچ مان کر لکھ دیتے ہیں،

کچھ باتیں غرض مند متعصب یا فتنہ انگیز لوگ جان بوجھ کر یا نیم شعوری طور پر بدل کر پیش کرتے ہیں اور کچھ نادان لوگ اپنی عقل کے زعم میں ناقص یا ناکافی تحقیق سے سچ مان لیتے ہیں۔

بہر حال اعداد و شمار کی حد تک یہ سچ ہے اور ہمیں اعتراف ہے کہ وہ بعض مرتبہ محض فرضی، اکثر "رنگین" اور صرف چند صورتوں میں غیر جانب دارانہ ہوتے ہیں اور شاذ و نادر ہی قابل بھروسا اہل افراد کے ذریعہ جمع کئے جاتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ سب اعداد و شمار یکلخت غلط ہوتے ہیں، نیز ہوشیار واقف کاروں یا تجربہ کار ماہروں کے لئے بلکہ ذہین نقادوں کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ان مختلف قسم کے اعداد و شمار میں فرق پیدا کر سکیں۔ علمیات اور منطق کے اصولوں کو منطبق کر کے یا محض عام معلومات اور فہم عامہ کی مدد سے ہم کھرے کھوٹے اعداد پرکھ سکتے ہیں۔

سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے اور سچ اور جھوٹ کی ملاوٹ کو تاڑنے کے لئے جو معیار منطق اور علمیات نے دریافت کئے ہیں ان ہی کی مدد سے اعداد کی درجہ بندی ہو سکتی ہے مثلاً ہمیں یہ خیال کرنا چاہئے کہ

"اعداد و شمار کا کیا ماخذ ہے؟

کیا یہ ماخذ ہر قسم کے اعداد و شمار کی صحت کا ضامن

ہو سکتا ہے؟"

ہمیں معلوم ہے کہ ہندستان کی سروے کئی بار ہو چکی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ ۱۵ لاکھ، ۱۸ ہزار پانسو دس مربع میل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ناپ یا حساب کی غلطیوں کی وجہ سے اس کا حقیقی رقبہ کچھ اور ہو یا سیاسی مقبوضات میں تبدیلی یا انتظامی تبدیلیوں کی وجہ سے اس کا صحیح رقبہ یہ نہ ہو مگر اتنا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ رقبہ پندرہ لاکھ سے زیادہ اور ساڑھے سولہ لاکھ چوکور میل سے کم ہے۔ اور یہ غلطی بھی ناپ اور حساب کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ ہم فہم عامہ کی مدد سے کوئی وجہ نہیں سوچ سکتے کہ ان اعداد کے غلط کرنے میں کسی فریق کی بھی کیا غرض ہو سکتی ہے لہذا رقبوں کی وسعت، ندیوں کی لمبائی، پہاڑی چوٹیوں کی اونچائی، سمندر کی گہرائی وغیرہ کی

حد تک تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف ہندستان بلکہ تمام دنیا کے اعداد تقریباً صحیح ہیں۔ البتہ جب ہم ہندستان کے معاشی، سیاسی اور سماجی واقعات کو اعداد و شمار کی روشنی میں معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کئی دقتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ

۱۔ توہم پرستی، یا لاپرواہی کی وجہ سے خود لوگ غلط بیانی کرتے ہیں اور صحیح واقعات بتانے سے انکار کرتے ہیں۔

۲۔ نااہل، کم تجربہ کار اور سہل کار شمار کنندے انٹ شنٹ اندراج کرتے ہیں۔ ان کے علٰحدہ کرنے اور جمع کرنے میں مزید غلطیاں ہوتی ہیں۔

۳۔ آخر میں غرض مند یا حاکم طبقہ اپنی سہولت اور فایدہ کی وجہ سے اس میں اور تبدیلیاں کرتا ہے یا من مانے طور پر کانٹ چھانٹ کرتا ہے۔

ہندستان اور ہندستان کی طرح تمام زوالی اور جمودی ملکوں میں لوگ گنادے کی نوعیت اور اہمیت سے ناواقف ہیں۔ بہتیری مائیں اپنی اولاد کی صحیح تعداد بتانے کو بدشگونی تصور کرتی ہیں! ہزاروں لوگ ہیں جو خاص کر اپنی بیٹیوں کی تعداد بتانے میں "ایشیائی شرم و غیرت" دبا، محسوس کرتے ہیں۔ بعض مشرق پرست یا مشرق پسند افراد ہیں جنھوں نے دو دو تین تین بیاہ کر لئے ہیں یا ایک باضابطہ بیوی کے علاوہ دوسرا نکاح چوری چھپے کر لیا ہے مگر یہ سب باتیں شمار کنندہ کو بتاتے ہوئے انھیں "شرم" آتی ہے! بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی بیاہتا بیوی کو "عالم برزخ" میں پہنچا دیا ہے اور کسی نئی نویلی کے ساتھ گذر بسر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ بھی کثرت ازدواج کو ظاہر نہیں کرتے۔ غرض سیکڑوں مختلف وجہوں سے لوگ جانتے بوجھتے غلط بیانی کرتے ہیں یا سچ باتوں کو چھپاتے ہیں۔ غرض مندی، مطلب پرستی، نخوت اور شرم کے علاوہ محض شیخی سے غلط بیانی کرتے ہیں اور بوڑھے اپنی عمریں لکھانے میں، پڑھے لکھے اپنی زبان دانیاں جتانے میں ایسا مبالغہ کرتے ہیں کہ اسے سفید جھوٹ سے تعبیر کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔ مردوں، بیوں اور مندروں کی تعداد چھپانا اور پڑھے لکھوں کی تعداد بڑھانا ایک عام مرض ہے۔ اضلاع

ہندستان میں بہتیرے شمار ندے گنا وے کا کام اعزازی طور پر انجام دیتے ہیں، مرکزی دفتروں میں کئی لوگ ہوتے ہیں جو شماریات کے فن اور اصول سے نا واقف یا برائے نام واقف ہوتے ہیں، اکثریت میں تساہل اور سہل کاری پائی جاتی ہے۔ بعض شمار ندے، خاص کر دیہات میں، خود نیم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں لہٰذا تو شماریاتی محکموں کی ہدایتوں کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان کی پروا کرتے ہیں۔ میں نے گشتیاں دیکھی ہیں جو ایسی پیچیدہ زبان میں لکھی تھیں کہ ان کا سمجھنا از خود ایک تحریر کی تحقیق کرنے کے برابر تھا!

عام طور پر عمر واری تقسیم کے اعداد بڑے غلط ہوتے ہیں کیونکہ خود لوگوں کو اپنی عمریں نہ تو معلوم ہوتی ہیں اور نہ یاد رہتی ہیں! شمار ندہ صاحب کسی تاریخی واقعہ یا فطری سانحہ کی مدد سے عمر معلوم کر لیتے ہیں اور اٹکل سے لکھ ڈالتے ہیں۔ ایک بوڑھے اور بچہ میں تو فرق کرنا آسان ہے مگر بیس سے پچاس برس تک کی عمر والوں میں درجہ بندی کرنا آسان نہیں، خاص کر جب کہ عورتیں پردے میں ہوں اور ـــــ مردوں کے ڈاڑھی ہو!

یہاں مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ ۱۹۴۱ء کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اصحاب کے سامنے میں اِن ہی خیالوں کو بیان کر چکا تھا۔ آخر ایک دن جب کہ ہمارے گھر ایک سکھ مہمان آئے ہوئے تھے میں نے ایک دوست سے جنھیں عمر شناسی کا بڑا دعوے تھا، اپنے سکھ مہمان کی عمر دریافت کی ان کی والدہ بھی ساتھ تھیں، جن کے چہرے پر غروب حسن کا آخری نور تھا۔ میرے دوست نے بیٹے کی عمر ۴۰ اور ماں کی عمر ۳۵ بتائی! انھیں معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ وہ بھائی بہن نہیں، بلکہ ماں بیٹے ہیں جن کی صحیح عمریں ۲۶ اور ۴۲ ہیں!

عمروں سے زیادہ وجہ موت متعین کرنا بہت دشوار ہے۔ سانپ کے کاٹے اور طاعون میں فرق کرنا یا ہیضے یا چیچک سے ہونے والی اموات میں فرق کرنا، نسبتاً آسان ہے مگر "بخار" سے واقع ہونے والی موتوں میں فرق کرنا کیوں کر ممکن ہے! یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ملیریا، ٹائیفائیڈ، دق اور گردن توڑ بخار کے مختلف اعداد نہیں ملتے اور اعداد کے نہ ہونے کو اچھے اچھے لوگ بیماری کا نہ ہونا تصور کر لیتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، چند سال پیشتر ہمارے ملک کے ایک بڑے ادیب نے جو خود فلسفہ اور منطق کے عالم ہیں اور سچائی کے مبلغ اور دعوے دار بھی، دق سے مرنے والوں کی تعداد کا حوالہ دے کر، یہ ثابت کیا تھا کہ ہمارے ملک میں دق کم ہے اور امریکہ میں زیادہ اور اپنے بیان کے ثبوت میں انھوں نے سرکاری اعداد پیش کئے تھے! ان کے ادیبانہ عذر سے کالب لباب یہ تھا "یورپ اور امریکہ کی تہذیب وترقی کے باوجود وہاں دق پھیل رہا ہے اور کتنے ہزار ہا آدمی، صحت گاہوں اور ماہروں، ہسپتالوں اور دق کے انسدادی اداروں کے ہوتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں مگر ہمارے ہاں نسبتاً اور مقابلتاً مشرقیت، خاندانی طریق زندگی کے باوجود بفضلہ خیریت ہے۔" ایک اور موقع پر موصوف ہی نے امریکہ کے مجرموں، ملزموں اور مجرمانہ مقدموں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا حوالہ دے کر ان کا تقابل ہندستان کے اعداد سے کرتے ہوئے مغربیت کی زوال پذیری اور مشرقیت کی برتری، اخلاقی عظمت اور روحانی استحکام کا ثبوت دینا چاہا تھا۔ اعداد سرکاری ماخذوں سے لئے گئے تھے اور بالکل ٹھیک تھے اور اس تقابل سے یقیناً پڑھنے والوں کی عظیم ترین اکثریت کو دھوکہ ہوا ہوگا اور وہ اعداد وشمار سے واضح کردہ بلندی وپستی کے قایل ہوگئے ہوں گے۔ اس شذرے کے جواب میں میں نے ایک معروضہ لکھا اور توقع کی تھی کہ صداقت کی خاطر اس کو بھی شایع کر دیا جائیگا کہ امریکہ کے جرمیاتی اعداد کے بڑھنے کے کئی سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ آبادی بڑھ رہی ہے اور ظاہر ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے تناسب سے اگر مجرموں، ملزموں اور مجرمانہ مقدموں میں اضافہ ہو تو یہ مطلق معنے میں اضافہ نہیں، صرف اضافی معنے میں اضافہ ہے! بلا شبہہ ہندستان کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا لہذا غیر جانب دارانہ تقابل کے لئے لازمی تھے کہ خود ہندستان کے دس بیس، و تیس سال پہلے کے اعداد دئے جاتے۔ امریکہ کے جرمیاتی اعداد کے زیادہ ہونے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ امریکہ ایک ترقی پذیر ملک ہونے کی حیثیت سے اپنی تنظیم کو بڑھا رہا ہے، اس کا جرم تفتیشی محکمہ بلند تر معیار پر پہنچ گیا ہے۔ امریکہ میں سختی سے قوانین کی پابندی کرائی جاتی ہے۔ بڑا چھوٹا امیر غریب، صدر کا بیٹا اور قلی کا بیٹا، عالم کا لڑکا اور کسان کا لڑکا، سب ایک ہیں، عدالت عالیہ سے بے نیاز

ہے۔ بلاشبہ ناانصافیاں ہوتی ہیں، رعایتیں ہوتی ہیں، مہربانیاں کی جاتی ہیں معصوموں کو پھانسا جاتا ہے مگر نسبتاً بہت کم کیونکہ عدالت اور عاملے کی تفریق سے مرعوبیت کا امکان نہیں علانیہ اطاعت گذاری اور فرماں برداری قطعی طور پر ناممکن! اسی طرح رشوت ستانی کی وہ گرم بازاری نہیں جو مشرقی ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ ان حقیقتوں کے برعکس ہمارے ہاں مجرموں کی تحقیق و تفتیش کرنا تو بڑی بات ہے، جن جرموں اور مجرموں کا پتہ چلتا ہے وہ بھی گوناگوں اسباب کی بنا پر منظر عام پر نہیں آنے پاتے اور منظر عام پر آ بھی جائیں تو انہیں رجسٹر پر نہیں چڑھایا جاتا اور نہ عدالت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور رجسٹر پر چڑھا بھی دیا جائے تو بعد میں نظرانداز کیا جاتا ہے اور کارگزاری ثابت کرنے یا کسی اور غرض یا مصلحت سے چھپا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سنی سنائی یا ردّی ناقابل بھروسہ حوالوں کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی معلومات سے میں کہہ سکتا ہوں کہ حادثے، قابل انسداد، حادثے، ہوتے ہیں جن کا ذکر سرکاری رپورٹ میں نہیں ہوتا، مشتبہ حالات کے تحت کوئی "غائب" ہو گیا مگر کھوج نہیں کیا گیا، ہٹا کٹا تن درست توانا لڑکا سانپ کے کاٹنے سے مر گیا اور لاش بغیر تفتیش نذر آتش کر دی گئی، لوگوں نے خودکشی کر لی مگر وجہ موت خاندان والوں نے چھپائی اور افسر معلومات کے باوجود انجان بن گئے وبا کے زمانے میں محلہ والے مر گئے تو تعداد کم ظاہر کی گئی یا بالکل چھپا کر لکھ دیا کہ "فلاں فلاں محلوں میں فضل رہا!"

یہ ایک عام واقفیت ہے کہ یورپی اقوام سچائی کی قربانی صرف جنگ کے زمانے میں کرتے ہیں اور حقیقی نقصان بتانے سے گریز کرتے ہیں، ہمارا یہ وتیرہ امن میں بھی ہوتا ہے! پھر بھی اچھے اچھے واقف کار منطقی اور فلسفہ کے جانے پہچانے اصولوں سے مسلح، صداقت کے مبلغ یا تو دھوکہ کھاتے ہیں، یا دھوکہ دیتے ہیں! ورد ایک نادان مبلغ کی حیثیت سے خود گمراہ ہو کر دوسروں کو مغالطے میں ڈالتے ہیں یا ایک تنگ نظر عقلیت زدہ محقق کی حیثیت سے اپنی اور دوسروں کی گمراہی کا باعث بنتے ہیں۔ امریکہ کے جرمیاتی اعداد کا مقابلہ تعلیمی نقطہ نظر سے امریکہ کے ہم درجہ اور امریکہ کی طرح آزاد ملک سے ہو سکتا ہے! ہندستان جیسے مفتوح، محکوم اور نااہل ملک سے جرمیاتی اعداد کا مقابلہ کرنا اور اس تقابل سے اپنی برتری کا ثبوت اخذ کرنا تعلیم یافتہ

مشرقیوں کی بھولی عقلیت اور برخود فریفتہ منطقیوں کی رعونت سے بھا۔

اس امر کو معلوم کرنے کے لئے کہ "کیا اعداد صحیح ہوتے ہیں ؟" ہمیں شماریات اور سیاست کے باہمی تعلق پر بھی غور کرنا چاہئے۔ ہر حکومت اپنی پالیسی کو جائز اور مفید ظاہر کرنے کے لئے اپنے مطلب کی باتوں کی تشہیر کرتی ہے اور اپنے خلاف مواد کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ خاص کر آمریت اور سامراجیت میں دروغ بافی اور جھوٹے سچے اعداد کی ملاوٹ اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ انگریزی حکومت انگلستان میں اور ہے، ہندستان میں اور! جاپان میں جاپانیوں کی حکومت کے بارے میں جو کچھ جاپانی کہتے ہیں یا اپنی صنعت وحرفت، زراعت وتجارت کے بارے میں جو کچھ اعداد پیش کرتے ہیں، اسے خواہ مخواہ غلط تصور کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں، مگر یہی جاپانی جب کوریا کی صنعت وحرفت کی ترقی کے ابھارے ہوئے اعداد[1] پیش کرتے ہیں، اور شرح اموات کو گھٹا کر بیان کرتے ہیں تو ہمیں احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ حاکم ومحکوم کے مفادوں میں تضاد ہوتا ہے اور تضاد کے باوجود ہم آہنگی ظاہر کرنے کی کوشش میں اعداد پر رنگ چڑھانا گویا لازمی ہوجاتا ہے، یہی حال، جزوی طور پر وہاں پایا جاتا ہے جہاں حکومت طبقہ وارانہ یا فرقہ وارانہ ہوتی ہے اور اس لئے ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے، اور رنگ آمیزی کے احتمال کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

ہندستان میں گناوے کی اہمیت

اعداد وشمار تمدن فہمی کے لئے ضروری تو ہیں ہی، اس کے علاوہ وہ سرکاری پالیسی اور قومی سیاست کی تشکیل میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ قومی تعمیری تحریکوں اور قومی تعمیری محکموں میں اعداد

---

[1] ابھارے ہوئے اعداد یا ابھرائے ہوئے Inflated figures

شمار کی اس قدر زیادہ اہمیت ہے۔ مستقبل کی تنظیم میں موجودہ زمانے کے اعداد سے بڑی مدد مل سکتی ہے، بشرطیکہ اعداد صحیح ہوں، ورنہ گمراہی کا خطرہ ہوتا ہے۔ البتہ یہ خصوصیتیں ہر ملک کے گماوے میں ہوتی ہیں۔ ہندستان میں گماوے کی غیر معمولی اہمیت کی دو اور وجہیں ہیں: سرکاری خدمتوں اور ملازمتوں کا ہندیانا اور قانون بنانے والی مجلسوں میں فرقہ واری نیابت!

ہندیانا یعنے INDIANIZATION دو سو سال پہلے تک تقریباً سارے ہندستان میں ہندستانیوں کا راج تھا۔ بڑے سے بڑے افسر سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے خدمتگار تک اور ملک التجار سے لے کر چلر فروش تک، بڑے بڑے ٹھیکہ داروں سے لے کر معمولی کسانوں، دہقانوں تک سب کے سب ہندستانی ہوتے تھے یا ہمیشہ کے لئے ہندستان آکر بس جانے والے ہوتے تھے۔

فرنگی حکومت کے استحکام کے ساتھ ہی ہندستان کی سیاست و معیشت میں ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی جس سے ہندستان کو اس سے قبل سابقہ نہیں ہوا تھا؛ وہ یہ کہ قدیم آریاؤں یا مسلمان حملہ آوروں کی طرح یہ فرنگی نہیں آرہے تھے اور نہ ہمیشہ کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر ہندستان میں آبسنے کے لئے آتے تھے بلکہ ان کا مقصد تجارت، خدمت، ملازمت یا حکومت ہوتا تھا، اور وہ تھوڑے عرصے میں جتنا ہو سکے کما کر اپنے وطن واپس چلے جاتے تھے، اور کبھی مستقل طور پر وطن بسائی کی خاطر نہیں آتے تھے۔

تبدیل شدہ سیاست اور حکومت کا یہ نتیجہ ہوا کہ مختصر یا طویل عرصوں کے لئے یا فوجی یا سیول خدمتوں کو انجام دینے کی خاطر آنے جانے والوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ کوئی بھولا بھٹکا قسمت کا مارا ہندستان میں رہ پڑا تو رہ گیا ورنہ عام طور پر سب عہدہ دار اور تاجر، ٹھیکہ دار اور دوسرے پیشہ ور چند برسوں کے لئے قیام کر کے اور زیادہ سے زیادہ پچیس تیس سال بعد اپنے وطن واپس چلے گئے۔ اسی لئے ہندستان میں ایک ایسا حاکم طبقہ وجود میں آیا جس کے افراد مستقل طور پر ہندستان میں نہیں رہتے تھے اور ہندستانی تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے، ہیں اور رہیں گے!

جب تک انسان ہمیشہ کے لئے ترک وطن کر کے نئے وطن میں نہیں آبستا، وہ بیگانہ ہی رہتا ہے اور

اسے اپنے ہی ملک سے لگاؤ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے برخلاف پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور ظاہر ہے سب سے بڑھ کر انگریزوں کی بدولت ہندستانیوں کو نقصان پہنچا اور ان کی تہذیب حکومت کی امداد اور سرکار کی سرپرستی سے محروم ہوگئی۔ سب سے بڑا نقصان تو یہی تھا کہ تمام بڑے بڑے عہدے غیر ہندستانیوں کے ہاتھوں میں تھے اور تمام بڑے بڑے ٹھیکے انگریزی کمپنیوں کو ملتے تھے صنعت، حرفت، تجارت، بنک کاری، وکالت، بیمہ، تعلیم اور فن کاری کے توسط اور ــــ بہانے سے ہزاروں نہیں لاکھوں انگریزوں کو براہ راست اور بالواسطہ فایدہ پہنچتا رہا، اب بھی پہنچ رہا ہے اور جب تک ان کی مطلق العنانی قائم رہے گی یہی من مانا فایدہ پہنچتا رہے گا۔ وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ فوج کے تمام چھوٹے بڑے افسر، سپہ سالار، صناع، موسیقی اور مصوری کے ماہر، عہدہ دار، تاجر سب کے سب ہندستانی ہوں۔ تمام بڑے عہدے انگریزوں کے سپرد ہوئے، اور صرف ادنےٰ ملازمتیں ہندستانیوں کے لئے مختص ہوئیں۔

اب تو چند نیم اہم یا کم اہم محکموں کے اعلےٰ انتظامی افسر ہندستانی ہیں، اور تقریباً تمام محکموں اور سررشتوں میں ہندستانیوں کا تقرر کیا جا چکا ہے مگر پچاس ساٹھ سال قبل ہماری حالت اور بھی بدتر تھی کیوں کہ اس وقت بلا استثنا تمام اچھے عہدوں پر انگریز ہی انگریز ہوتے تھے۔ جیسے جیسے ہندستانی اپنے حقوق کے لئے لڑ رہے ہیں اور عزت و آزادی کے لئے قربانیاں کر رہے ہیں، اسی قدر ملک کے انتظامی عہدوں پر ہندستانیوں کا تقرر بڑھتی ہوئی تعداد اور تناسب سے کیا جا رہا ہے اور گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سب سے پہلے ایک ہندستانی کو ایک صوبے کا گورنر بنایا گیا تھا اور اس کے بعد کئی ہندستانیوں کو اس قابل تصور کیا گیا کہ منصرمانہ طور پر گورنری کریں! مگر اب تک فینانس، مالگزاری، فوج جیسے محکموں پر کسی ہندستانی کا تقرر محکمے کے اعلےٰ ترین افسر کی حیثیت سے نہیں کیا گیا اور نہ کسی اور محکمے میں تمام اختیار ہندستانیوں کے سپرد کر دیئے گئے بلکہ ہر جگہ حتی کہ تعلیم اور صفائی کے سررشتوں میں، قواعد کی تبدیلی، نفاذ قانون کی تنسیخ، عہدہ داروں کی برطرفی یا معطلی گورنر کے ہاتھ میں ہے، اور گورنر کو ہٹانے کا حق وائسرائے کو ہے اور وائسرائے سے استعفےٰ طلب کرنے کا مجاز وزیر ہند، وزیر ہند کا مختار وزیر اعظم ہے جو صرف اپنی پارٹی اور

برطانوی پارلیمان کے ماتحت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں تک نوبت نہیں آنے پاتی یا سب محافظتیں ساتھ ساتھ یا وقت واحد میں نہیں ہوتیں مگر اصولی طور پر یہ کہنا صحیح ہے کہ تمام ملک کا سارا انتظام آج بھی دستوری طور پر انگریزوں کے ہاتھوں میں ہے گر وہ لوگ زمانے کی ہوا کے ساتھ ساتھ اپنے اختیار خود ہی کم استعمال کرتے ہیں اور پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہندستانیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرتے ہیں۔ اسی کو اصطلاحی زبان میں Indianization یعنے ہندیاؤ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کے مختلف محکموں میں اور ہر محکمے کے مختلف درجے یا نوعیت کے عہدوں پر انگریزوں کی بجائے ہندستانیوں کا تقرر کرنا، ٹھیکوں کی تقسیم میں ہندستانی کاروباریوں کا لحاظ رکھنا، سرکاری وکیل یا ماہر مقرر کرتے وقت ہندستانیوں کو بھی مد نظر رکھنا، تحقیقاتی، تفتیشی، مشاورتی، قانونی، عدالتی کمیٹیوں، کمیشنوں، مجلسوں وغیرہ میں ہندستانیوں کی تعداد اور تناسب کو بڑھانا، ان میں اہم خدمتوں پر ہندستانیوں کا تقرر کرنا۔ ہندیادی تحریک کا آغاز یوں تو گذشتہ صدی ہی میں ہوچکا تھا مگر تقسیم بنگال، روس، جاپانی جنگ، سودیشی تحریک، تحریک خودمختاری، پہلی جنگ عظیم جیسی اثر انگیز واقعات سے اس کو بے حد تقویت ہوئی اور ملک بھر میں مقبول ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں ہندستان کی دستوری اساس کا مشورہ دینے کے لئے سر جان سائمن کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس کے ارکان میں ایک بھی ہندستانی نہیں تھا۔ ایک اہم مشاورتی اور تفتیشی کمیشن میں ہندستانیوں کی عدم نمایندگی کو تمام جماعتوں، طبقوں، فرقوں اور ملتوں نے ذلت محسوس کی اور جنھوں نے اس کمیشن سے اشتراک عمل کیا، انھیں بھی ناگوار گذر رہا تھا۔ اسی قسم کا ناگوار اور عام طور پر از حد ناپسندیدہ طریق عمل حیدرآباد نے سنہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ اختیار کیا تھا جب کہ لندن کی کمپنی سے حیدرآباد کی ریلیں خریدنے سے قبل ریلوے کی مالیت مشخص کرنے کے لئے دو ریلوے انجنیر ماہروں کی خدمتیں مستعار لی تھیں اور ان کو اپنے ماہرانہ مشوروں کے لئے فیاضانہ معاوضہ دیا تھا۔ حیدرآبادیوں کو یہ بات سخت ناگوار گذری تھی کہ کروڑوں روپے کی مالیت حاصل کرتے وقت، قیمت کا تعین اور حکومت کو مشورہ دینا وہ بے ہیں جو کتنے ہی بڑے ماہر سہی مقامی حالات اور قیمتوں سے ناواقف یا کم واقف تھے اور جن کی ہمدردی انگریزوں کے ساتھ تھی

اور جن کے غیر شعوری تعصب سے حیدرآباد کو نقصان ہونے کا سخت اندیشہ تھا۔ یہ بات بھی اپنے عامہ اور سنجیدہ طبقوں کی فہم عامہ کو کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی کہ ایک طرف محکمہ انجینیری کے مستعد و عہدہ داروں کی مہارت کی تعریفیں کی جاتی تھیں اور دوسری طرف ریلوے کے خریدنے کے وقت ان کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ بہرحال یہ اور اسی قسم کے موقعوں پر لوگوں کو ہندستانیوں کی عدم موجودگی سخت ناگوار گذرتی تھی اور وہ اس بات کو بری طرح محسوس کرتے تھے کہ ملک ہمارا، دولت و جائداد ہماری، مگر قبضہ اور تصرف دوسروں کا، اور شان حکومت بھی نیم نادرشاہی جس میں ہمارا عمل دخل تو درکنار، مشاورتی تجویزیں پیش کرنے کا بھی حق نہیں! ٹیکس ہم دیں، روپیہ ہم ادا کریں مگر بڑے بڑے تنخواہ پانے والے افسر سب کے سب انگریز ہوں! محنت و مشقت ہم کریں، حکومت جتانے کے لئے فرنگی ہی فرنگی ہوں، جنھیں نہ ہم سے غرض اور نہ ہماری تہذیب سے کسی قسم کی ہمدردی! یہ خیال پھیلتا گیا کہ ہمارے ملک میں کروڑوں لوگ ہیں، ان میں لاکھوں پڑھے لکھے ہیں، ہزاروں عالم اور ماہر ہیں، یا کسی قدر کوشش سے بن سکتے ہیں، مگر پھر بھی بڑی خدمتوں پر یا اہم خدمتوں پر ان کا تقرر نہیں کیا جاتا! کیا کروڑوں میں ایک بھی اس قابل نہیں کہ کسی سررشتے یا محکمے یا تعلقے کی تنظیم و نگرانی کر سکے؟!

پبلک کے تقاضوں، مختلف اداروں کے مطالبوں اور ایک منظم جماعت کے پاثر ہنگاموں سے مجبور ہو کر حکومت نے ہندیا وے کے اصول کو مان لیا ہے اور بڑھتے ہوئے قومی شعور اور معیار ایثار کے مطابق مرکزی اور صوبائی حکومتیں مختلف خدمتیں ہندستانیوں کے لئے مختص کر رہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مطالبے کرنے والے یا ان مطالبوں کی خاطر قربانیاں کرنے والے اور ہیں اور ان کے طفیل سے خدمتیں پانے والے اور! قربانیاں ایک کرے، عہدے اور ترقیاں دوسرے کو ملیں! بوتا کوئی ہے، کاٹتا کوئی ہے! اس کا بھی نام دنیا ہے۔ غرض بڑھتی ہوئی تعداد اور تناسب سے ہندستانیوں کا تقرر ہو رہا ہے اور مختلف سرکاری خدمتیں ہندستانیائی جا رہی ہیں۔

ہندیانے کی ایک حقیقی مثال

سنہ ۱۹۳۰ء میں سرکاری ریلوں کی یورپی عہدہ داروں کی تعداد ۴،۷۷۳ تھی مگر سنہ ۱۹۳۸ء میں سرکاری ریلوں کے یورپی عہدہ داروں کی تعداد ۲،۵۰۸ ہوگئی تھی، گویا اس مدت میں جتنی جائیدادیں خالی ہوئی تھیں ان میں سے زیادہ تر جائیدادوں پر ہندستانیوں کا تقرر ہوا تھا۔ اسی کو ہندیانا کہتے ہیں۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے چونکہ کئی انگریزوں کو اہم تر اور زیادہ بھروسے کی خدمتیں تفویض کی گئی ہیں، لہذا ان کی بجائے بہت سے ہندستانیوں تقرر ہوا ہو تو کچھ عجب نہیں۔

سرکاری ریلوں میں عہدہ داروں کے فرقہ واری نیابت یعنے Communal Representation

اعداد سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۱۹۳۸ء کے درمیان میں کئی عہدے ہندستانیوں کو ملے مگر کن ہندستانیوں کو یہ عہدے ملے؟ ہندوؤں کو؟ عیسائیوں کو؟ مسلمانوں کو؟ سکھوں کو؟ اور ہندوؤں میں بھی برہمنوں کو یا ہریجنوں کو؟

ہمارا ملک محکوم ملک ہی نہیں بلکہ فرقہ واریت میں مبتلا ملک ہے! ہمیں صرف اس حقیقت سے تشفی نہیں ہوتی کہ ہمارے اپنے ملک کے انتظام میں اپنا ہی بڑھتا ہوا عمل دخل ہو، بلکہ آبادی کی مختلف جماعتوں خاص کر فرقوں میں سب کا حصہ ہو، اور یہ حصہ متعلقہ فرقے کی تعداد کے تناسب سے ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی انتظامی سررشتے میں بھی یہ ناممکن ہے کہ عہدوں کی تقسیم اور ترقیوں میں محض فرقہ واری نمایندگی کے اصول پر عمل ہو مگر فرقہ واری نمایندگی کو یک لخت نظرانداز کرنا یا کسی خاص فرقے یا جماعت ہی سے زیادہ تر ہندستانیوں کا انتخاب کرنا، بقیہ فرقوں یا جماعتوں کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کے انتظام میں سب کا حصہ ہو، ہندوؤں کا اور پارسیوں کا، عیسائیوں کا اور مسلمانوں کا، سکھوں کا اور ہریجنوں کا اور ہر ایک کو حصہ اس کی تعداد کے مطابق ملے۔ ہم آخرالذکر طریق کو فرقہ واری نیابت یعنے

Communal Representation کہتے ہیں۔

فرقہ واری نیابت کی دو حقیقی مثالیں لیجئے

سنہ ۱۹۳۱-۳۲ء میں سرکاری ریلوں کی مختلف خدمتوں اور عہدوں پر ۱۴،۳۹۸ ہندستانی عیسائی تھے۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء تک ان کی تعداد میں ۳،۶۴۳ کا اضافہ ہوا اور ہندستانی عیسائیوں کی کُل تعداد جو سرکاری ریلوں سے براہ راست مستفید ہو رہی تھی ۱۸،۰۴۱ ہوگئی۔[1]

سنہ ۱۹۳۰-۳۱ء میں سرکاری ریلوں کی مختلف خدمتوں اور بعض عہدوں پر ۷۱،۲۹۵ مسلمان مامور تھے۔ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء تک ان کی تعداد میں ۱۵،۴۴۵ کی کمی ہوئی۔ مسلمانوں کی یہ تعداد اور بھی کم ہوتی اگر ریلوں کو بعض علاقوں میں معمولی اور ادنےٰ خدمتوں پر مسلمان ہی مسلمان بھرتی کرنے کی مجبوری نہ ہوتی۔ مثلاً سرحدی صوبے میں، ریلوے کلرک، دفتری، چپراسی، پٹریاں بدلنے والا پٹریاں درست کرنے والے، چوکی دار وغیرہ زیادہ تر مسلمان نہ ہونگے تو کیا عیسائی ہونگے! مگر جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہے، مثلاً متوسط صوبے میں وہاں ان کو نظر انداز کر دیا جا سکتا ہے اور حقیقت میں نظر انداز کیا بھی جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں کے مسلمانوں کی عام شکایت ہے، جس صوبے میں پانچ فی صدی مسلمان ہوں سرکاری ریلوے میں نوکریاں حاصل کرنے والوں کی تعداد ایک فی صد سے کم ہے! چونکہ علاقہ واری یا صوبائی اعداد علٰحدہ علٰحدہ نہیں دئے جاتے اس لئے سرکاری اعداد کے حوالے سے سنی سنائی باتوں کی تصدیق کرنا ممکن نہیں مگر مختلف سمتوں، طبقوں اور فرقوں کی مسلسل اور دیرینہ شکایتوں سے یہ اندازہ لگانا غلط نہیں کہ شاکیوں کے گلے بیجا نہیں ہیں۔ اور جو نیکی یا انصاف ریلوے مجبوراً کرتی ہے وہ بھی نہ ہوتی تو مسلمانوں اور ہریجنوں کے حق میں ناانصافی اور بھی زیادہ ہوتی۔ کیونکہ خود سرکاری اعداد سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ سرکاری

---

[1] [illegible] نے مختلف اعداد کے ماخذوں کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ صرف مثال کے طور پر یہاں [illegible] دیا گیا ہے۔ Statistical abstract for Br. India کی [illegible] اشاعت [illegible] کلکتہ [illegible] کے صفحہ نمبر ۲۳۲ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

ریلوں میں جو ہند یادی طریق Indianizing process جاری ہے،
اس میں سراسر ناانصافی اور مصلحت کار فرما ہیں کیونکہ جس رفتار اور تناسب سے خدمتیں ہندیائی
جا رہی ہیں، اسی رفتار یا تناسب سے ہندستان کے سب فرقے اور جماعتیں یا علاقے اور طبقے،
نسلیں اور ملتیں مستفید نہیں ہو رہی ہیں۔

تفصیلی طور پر اعداد و شمار کا تقابل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ریلوے کے اعلےٰ یورپین
عہدہ دار سب سے زیادہ ہندستانی نژاد یورپی لوگوں یعنے اینگلو انڈین یا ہندستانی فرنگیوں پر،
اس کے بعد ہندستانی عیسائیوں پر اور آخر میں پارسیوں اور برہمنوں پر مہربانیاں کرتے ہیں
اور زیادہ تر ان ہی میں فیاضی سے خدمتیں تقسیم کرتے ہیں اور سب سے زیادہ گھاٹے میں
سکھ، مسلمان اور "نیچ" تصور کئے جانے والے اور "اچھوت" کہلانے والے ہندو ہوتے ہیں جنھیں
گاندھی جی نے ہریجن کا معزز نام بخشا ہے۔ جب مسلمانوں اور سکھوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی
تعداد مجموعی طور پر بڑھ رہی ہے، پھر بھی جو نوکریاں سرکاری ریلوں میں خالی ہوتی ہیں، ان
میں سے انھیں بہت کم ملتی ہیں تو یقینی طور پر انھیں بہت برا معلوم ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ
حکومت یہ اصول اختیار کرے کہ جہاں کہیں ہو سکے اور جہاں تک ہو سکے فرقہ واری نیابت کا
انتظام کیا جائے۔

ہندستان میں گنا وے کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو رہی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی فرقہ وارانہ
نیابت ہے جسے قانون ساز جماعتوں کی حد تک تسلیم کر لیا گیا ہے اقانون بنانے والی جتنی مجلسیں
ہیں ان کے لئے چناؤ فرقہ واری طریق پر ہوتا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی اور فرنگی
سب الگ الگ اپنے نمایندوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ کہیں کہیں علاقہ واری انتخاب بھی ہوتا ہے
مگر عام طور پر فرقہ واری نمایندگی ہوتی ہے اور زیادہ تر مذہب و ملت کے ماننے والوں کی تعداد
کی مناسبت سے قانون بنانے والی مجلسوں میں جگہیں معین ہوتی ہیں، زائد نیابت یعنے
Weightage بھی بعض فرقوں کو حاصل ہے مگر یہ زائد نیابت بھی دوسروں
کی شکایتوں کا باعث بنتی ہے لہذا ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی خواہش ہے کہ جتنی ان کی تعداد

بڑھیگی ہاسی کی مناسبت سے وہ قانون ساز مجلسوں میں اپنے نمایندوں کے اضافہ کا مطالبہ کرینگے اور آخرکار اپنے مطالبوں میں تمامتر یا جزوی طور پر کامیاب ہونگے اور جس قدر زیادہ ان کے نمایندے ہونگے اسی قدر زیادہ وہ توقع کرسکیں گے کہ صوبائی یا مرکزی حکومت کی تمدنی سیاسی معاشی اور سماجی پالیسی پر ان کا اثر پڑے گا۔ نیز یہ بھی کہ قانون ساز مجلسوں میں جتنے زیادہ کسی مذہب و ملت کے نمایندے ہوں گے وہ اپنے رسوخ اور اثر کی وجہ سے اپنے ہم فرقہ وکیلوں، ٹھیکہ داروں، ڈاکٹروں، تاجروں، سرمایہ داروں، فن کار ماہروں وغیرہ کو فایدہ پہنچا سکیں گے۔ ان ہی وجہوں کے تحت کئی لوگوں نے گذشتہ گنا وے میں اپنی اصلی تعداد بڑھا کر لکھوادی۔ اور اپنے حقیقی یا منعور مفاد کے تحت باضابطہ طور پر غلط بیانی کی اور نظم پروپگنڈہ کے ذریعے غلط بیانی کرنے کا مشورہ دیا۔ اخباروں میں، رسالوں میں، تقریروں میں، انتہا یہ کہ پوسٹروں کے ذریعہ علانیہ مشورہ دیا گیا کہ "اپنی مادری زبان اردو لکھاؤ!" "تم ہندو ہو! تمہارا کرتویہ کہے کہ دھرم کا پالن کرو اور اپنی ماتر بھاشا ــ ہندی لکھواؤ"! بعضوں نے مشورہ دیا کہ اپنے آپ کو صرف مسلمان لکھواؤ! بعضوں نے کہا نہیں اپنا اصلی فرقہ لکھواؤ ورنہ تمہاری انفرادیت فنا ہو جائے گی! کسی نے کہا اپنے آپ کو سکھ بتلاؤ، کسی نے کہا نہیں، ہندو لکھو، اور عیسائیوں کے سوا سب نے اشاروں میں یا علانیہ یہ کہا کہ اپنی تعداد بڑھاؤ۔ ایک صاحب نے مجھ سے فخریہ بیان کیا کہ انھوں نے گھروالوں کی تعداد سات کی بجائے سترہ بتائی تھی! شمارندہ Enumerator انہیں کا ہم مذہب تھا اس نے انہیں رائے دی کہ "سترہ تو ہیں ہی دو اور لکھوا دیجے"! غرض سات کے انیس ہوگئے! میں جانتا ہوں کہ ہر جگہ ایسا اندھیر نہیں ہوا مگر پھر بھی یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی تعداد بڑھا چڑھا کر لکھائی ضرور ہے۔ کیونکہ اپنی دانست میں وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنی تعداد بڑھا کر اپنے دین اور ہم مذہبوں کی بڑی خدمت کی ہے۔

غرض فرقہ داری نیابت اور ہندیانے کی پالیسی کی وجہ سے ہندستان میں گنا وے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی۔ ایسی اہمیت جس کی نظیر انگلستان یا امریکہ میں کہیں نہیں ملتی

اور جب تک ہمارے ملک میں فرقہ واریت کا بول بالا رہے گا، یہ اہمیت باقی رہے گی۔

اس غیر معمولی اہمیت کے علاوہ بھی گناوے کی عام اہمیت ہر ملک میں، خاص کر ترقی پذیر ملکوں میں، مانی ہوئی بات ہے، کیوں کہ گناوے سے ہمیں حقیقت کا علم ہوتا ہے اور خاص کر جب تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو اعداد کی روشنی میں ہم نہ صرف اپنی تہذیب و تمدن کی اساس معلوم کرسکتے ہیں بلکہ مستقبل کے لئے نظام عمل بنانے میں مدد لے سکتے ہیں!

سب سے پہلے تو ہم دنیا کے مختلف حصوں کے بڑے چھوٹے ملکوں اور ہندستان کے صوبوں اور بعض ریاستوں کے تعدادی حوالے دیتے ہیں، جن پر ایک نظر ڈالنے سے ہمیں آبادی کے چند اساسی اعداد کی سرسری واقفیت ہو جائے اور شماریات آبادی کی اضافی نوعیت معلوم ہو جائے کیونکہ ایک ملک جس کا شمار ایک لحاظ سے سب سے آخر ہوتا ہے دوسرے لحاظ سے سب سے اول ہوتا ہے، بڑا منجھلا، اور منجھلا چھوٹا اور چھوٹا بڑا، اول آخر یا آخر اوّل ہو جاتا ہے!

آبادی کا مسئلہ

چند اساسی اعداد

ملکوں، ریاستوں، صوبوں کے رقبے، آبادیاں اور گنجانی

آبادی اور شماریات کی اساس معلوم کرنے کے لئے آیندہ تین جدولوں میں ۲۲۵ مختلف علاقوں کے نام اور ان کے رقبے، کُل آبادی اور ہر چوکور میل پر آبادی کی تعداد وغیرہ دی گئی ہے۔ پہلی جدول میں ملکوں، صوبوں اور ریاستوں کی ترتیب رقبہ وار یعنی وسعت کے لحاظ سے کیا گیا ہے یعنی جو ملک وسعت میں سب سے بڑا تھا اس کو سب سے پہلے اور جو سب سے کم تھا

اسے سب سے آخر میں رکھا ہے۔

دوسری جدول میں اُن ہی ۲۵ علاقوں کی ترتیب آبادی کی کل تعداد کے لحاظ سے کی گئی ہے یعنے جہاں سب سے زیادہ آبادی تھی اس ملک کا نام سب سے پہلے اور جہاں سب سے کم آبادی تھی اس کا نام سب سے آخر میں رکھا گیا۔

تیسری جدول میں جن ملکوں کے اعداد پہلی اور دوسری جدولوں میں دیے گئے تھے ان ہی کی ترتیب گنجانی کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ گنجانی سے مراد یہ ہے کہ اوسطاً ہر چوکور میل کے رقبہ پر کتنے لوگ آباد ہیں۔ ملکوں کی گنجانیت کا لحاظ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ رقبہ اور آبادی میں کیا تناسبی بندھن ہے۔

ان تینوں جدولوں پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے معلوم ہوگا کہ جو ملک آبادی کی کل تعداد کے لحاظ سے پہلے اور دوسرے ہیں، وہ بہت زیادہ گنجان طور پر آباد نہیں اور جو ملک وسعت میں سب سے بڑے ہیں وہ گنجانیت کے اعتبار سے کم ہیں۔ مثلاً ہندستان اور چین سب سے زیادہ آبادی والے ملکوں کی گنجانی متوسط ہے اور کنیڈا جو وسعت کے لحاظ سے بڑا ہے گنجانیت کے اعتبار تقریباً سب سے آخر ہے!

۱۔ رقبہ واری ترتیب

	چوکور میل		چوکور میل
۱ کینیڈا	۳۴۶۶،۵۵۶	۲۷ حیدرآباد	۸۲،۳۱۳
۲۔ برازیل	۳،۲۷۵،۵۱۰	۲۸ کشمیر	۸۴،۲۵۸
۳ متحدہ امریکی ریاستیں	۲،۹۷۷،۱۲۸	۲۹ بنگال	۷۷،۴۴۲
۴ آسٹریلیا	۲،۹۷۴،۵۸۱	۳۰ بمبئی	۷۶،۴۴۳
۵ چین	۲،۹۰۳،۴۷۵	۳۱ بہار	۶۹،۷۴۵
۶ ہندستان	۱،۵۸۱،۴۱۰	۳۲ بلوچستان	۵۴،۴۵۶
۷ ارجنٹائن	۱،۰۷۹،۹۶۵	۳۳ انگلستان	۵۰،۸۷۴
۸ ایران	۶۲۸،۰۰۰	۳۴ سندھ	۴۸،۱۳۶
۹ اتحاد دکنی افریقہ	۴۷۲،۵۵۰	۳۵ آسام	۴۵،۹۵۱
۱۰ مہاجاپان	۴۷۰،۷۷۰	۳۶ پرتگال	۳۵،۴۹۰
۱۱ افغانستان	۲۵۰،۰۰۰	۳۷ آئیر	۳۲،۱۹۲
۱۲ مہاجرمنی	۲۴۵،۱۹۹	۳۸ سکاٹ لینڈ	۳۰،۴۰۵
۱۳ فرانس	۲۱۲،۶۵۹	۳۹ میسور	۲۹،۴۵۸
۱۴ سپین	۱۹۶،۶۰۷	۴۰ گوالیر	۲۶،۰۰۸
۱۵ جرمنی	۱۸۱،۶۳۰	۴۱ سوئٹزرلینڈ	۱۵،۹۴۴
۱۶ سویڈن	۱۷۳،۳۴۱	۴۲ جیپور	۱۵،۶۱۰
۱۷ حجاز	۱۵۰،۰۰۰	۴۳ سرحدی صوبہ	۱۴،۲۶۳
۱۸ جاپان	۱۴۷،۰۰۰	۴۴ ہالینڈ	۱۲،۷۱۲
۱۹ مدراس	۱۲۶،۱۶۶	۴۵ بلجیم	۱۱،۷۷۵
۲۰ ناروے	۱۲۴،۵۵۶	۴۶ اندور	۹،۹۳۴
۲۱ اٹلی	۱۱۹،۷۶۴	۴۷ بروڈا	۸،۲۳۶
۲۲ عراق	۱۱۶،۰۰۰	۴۸ ٹراونکور	۷،۶۶۲
۲۳ متحدہ صوبے	۱۰۶،۲۴۷	۴۹ ویلز	۷،۴۶۶
۲۴ نیوزی لینڈ	۱۰۳،۴۳۰	۵۰ بھوپال	۶،۹۲۱
۲۵ پنجاب	۹۹،۰۸۹ ۱	۵۱ ٹونک	۲،۵۴۳
۲۶ متوسط صوبے	۹۸،۵۷۵	۵۲ رامپور	۸۹۲

۲۔ آبادی کی تعداد کے لحاظ سے ترتیب

(تمام اعداد ۱۹۳۶ء-۴۱ کے درمیانی مدت کے ہیں)

۱ چین	۴۲۲،۲۷،۰۰،۰۰۰	۲۷ ہالینڈ	۸۷،۲۸،۰۰۰
۲ ہندستان	۳۸،۸۹،۰۰،۰۰۰	۲۸ اڑیسہ	۸۷،۲۸،۰۰۰
۳ متحدہ امریکی ریاستیں	۱۳،۱۶،۶۹،۰۰۰	۲۹ بلجیم	۸۳،۲۸،۰۰۰
۴ مہا جاپان	۹،۷۶،۰۰،۰۰۰	۳۰ میسور	۷۳،۲۹،۰۰۰
۵ مہا جرمنی	۷،۹۵،۰۰،۰۰۰	۳۱ آسٹریلیا	۶۹،۹۷،۰۰۰
۶ جرمنی	۶،۹۹،۰۰،۰۰۰	۳۲ پرتگال	۶۸،۲۵،۰۰۰
۷ جاپان	۶،۹۲،۰۰،۰۰۰	۳۳ سویڈن	۶۳،۷۰،۰۰۰
۸ بنگال	۶،۰۳،۰۰،۰۰۰	۳۴ ٹراونکور	۶۰،۷۰،۰۰۰
۹ متحدہ صوبے	۵،۵۰،۰۰،۰۰۰	۳۵ سکاٹ لینڈ	۴۸،۴۲،۰۰۰
۱۰ مدراس	۴،۹۳،۰۰،۰۰۰	۳۶ سندھ	۴۵،۳۵،۰۰۰
۱۱ اٹلی	۴،۲۹،۰۰،۰۰۰	۳۷ سوئٹزرلینڈ	۴۲،۶۰،۰۰۰
۱۲ فرانس	۴،۱۹،۰۰،۰۰۰	۳۸ گوالیر	۴۰،۰۶،۰۰۰
۱۳ بریزل	۴،۱۳،۰۰،۰۰۰	۳۹ کشمیر	۴۰،۲۱،۰۰۰
۱۴ انگلستان	۳،۷۷،۰۰،۰۰۰	۴۰ عراق	۳۵،۰۰،۰۰۰
۱۵ بہار	۳،۶۳،۰۰،۰۰۰	۴۱ جیپور	۳۰،۴۸،۰۰۰
۱۶ پنجاب	۲،۸۴،۰۰،۰۰۰	۴۲ سرحدی صوبہ	۳۰،۳۸،۰۰۰
۱۷ سپین	۲،۵۸،۰۰،۰۰۰	۴۳ بڑودا	۲۸،۵۵،۰۰۰
۱۸ بمبئی	۲،۰۸،۰۰،۰۰۰	۴۴ ناروے	۲۸،۱۴،۰۰۰
۱۹ ایران	۱،۸۰،۰۰،۰۰۰	۴۵ ویلز	۲۱،۵۸،۰۰۰
۲۰ متوسط صوبے	۱،۶۸،۰۰،۰۰۰	۴۶ نیوزی لینڈ	۱۵،۷۳،۰۰۰
۲۱ حیدرآباد	۱،۶۳،۰۰،۰۰۰	۴۷ اندور	۱۵،۱۳،۰۰۰
۲۲ آرجنٹائن	۱،۴۳،۰۰،۰۰۰	۴۸ حجاز	۱۵،۰۰،۰۰۰
۲۳ افغانستان	۱،۲۰،۰۰،۰۰۰	۴۹ بھوپال	۷،۸۵،۰۰۰
۲۴ کینیڈا	۱،۱۴،۰۰،۰۰۰	۵۰ بلوچستان	۵،۰۱،۰۰۰
۲۵ آسام	۱،۰۴،۰۰،۰۰۰	۵۱ رامپور	۴،۷۷،۰۰۰
۲۶ اتحاد دکنی افریقہ	۹۵،۸۹،۰۰۰	۵۲ ٹونک	۳،۵۳،۰۰۰

۳- ہر چوکور میل کی آبادیت کے لحاظ سے ترتیب

۱ [illegible]	۷۹۲	۲۷ پرتگال	۱۹۲
۲ بنگال	۷۷۹	۲۸ آسام	۱۸۲
۳ بلجیم	۷۱۲	۲۹ متوسط صوبے	۱۷۰
۴ ہالینڈ	۶۸۶	۳۰ گوالیر	۱۵۴
۵ انگلستان	۶۸۵	۳۱ اندور	۱۵۲
۶ رامپور	۵۲۸	۳۲ چین	۱۴۵
۷ بہار	۵۲۱	۳۳ ٹونک	۱۳۹
۸ متحدہ صوبے	۵۱۸	۳۴ سکاٹ لینڈ	۱۳۳
۹ جاپان	۴۶۹	۳۵ سپین	۱۳۱
۱۰ مدراس	۳۹۱	۳۶ بھوپال	۱۱۳
۱۱ جرمنی	۳۸۲	۳۷ سندھ	۹۴
۱۲ مہاجاپان	۳۷۵	۳۸ کشمیر	۴۹
۱۳ دہلی	۳۵۹	۳۹ افغانستان	۴۸
۱۴ بڑودا	۳۴۹	۴۰ متحدہ امریکی ریاستیں	۴۴
۱۵ مہاجرمنی	۳۰۸	۴۱ سویڈن	۴۰
۱۶ ویلز	۲۸۸	۴۲ عراق	۳۰
۱۷ پنجاب	۲۸۷	۴۳ ناروے	۲۲
۱۸ بمبئی	۲۷۲	۴۴ اتحادہ دکنی افریقہ	۲۰
۱۹ اڑیسہ	۲۷۱	۴۵ ایران	۱۹
۲۰ سوئٹزرلینڈ	۲۵۵	۴۶ نیوزی لینڈ	۱۵
۲۱ میسور	۲۴۹	۴۷ برزیل	۱۲
۲۲ ہندستان	۲۴۶	۴۸ ارجنٹائن	۱۲
۲۳ سرحدی صوبہ	۲۱۳	۴۹ حجاز	۱۰
۲۴ حیدرآباد	۱۹۸	۵۰ بلوچستان	۹
۲۵ فرانس	۱۹۷	۵۱ کینیڈا	۳
۲۶ جےپور	۱۹۵	۵۲ آسٹریلیا	۲

آبادی کی گنجانی

ہندستان کا مقابلہ یورپی ملکوں سے کرنا ٹھیک نہیں کیوں کہ ہندستان جغرافی اور معاشی اعتبار سے آدھا براعظم ہے۔ ہندستان کے صوبوں اور بعض بڑی بڑی دیسی ریاستوں کا مقابلہ یورپی ملکوں سے کرنا ٹھیک ہوگا کیوں کہ یہ ان کے ہم پلہ ہیں۔

اس جدول میں ہم ہندستان کی گنجانی کا مطالعہ کریں گے تاکہ معلوم ہو کہ بڑے بڑے علاقوں کے ملکوں میں آبادی کتنی ہے اور ہندستان میں کتنی۔

ملک کا نام	جس سال کے اعداد ہیں	رقبہ (چوکور میلوں میں)	کل آبادی	گنجانی (ہر چوکور میل پر لوگوں کی تعداد)
آسٹریلیا	سنہ ۱۹۳۹ء	۲۹٬۷۴٬۰۰۰	۶۰٬۰۰٬۰۰۰	۲
کینیڈا	سنہ ۱۹۴۱ء	۳۴٬۶۶٬۰۰۰	۱٬۱۴٬۰۰٬۰۰۰	۳
آرجنٹائین	سنہ ۱۹۴۱ء	۱۰٬۸۰٬۰۰۰	۱٬۳۳٬۰۰٬۰۰۰	۱۲
متحدہ امریکی ریاستیں	سنہ ۱۹۴۰ء	۲۹٬۷۷٬۰۰۰	۱۳٬۱۶٬۰۰٬۰۰۰	۴۴
چین	سنہ ۱۹۳۶ء	۲۹٬۰۳٬۰۰۰	۴۲٬۲۷٬۰۰٬۰۰۰	۱۴۸
ہندستان	سنہ ۱۹۴۱ء	۱۵٬۸۱٬۰۰۰	۳۸٬۸۹٬۰۰٬۰۰۰	۲۴۶

یہ اعداد شاہد ہیں کہ بڑے بڑے علاقوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ہندستان بہت کافی آباد ہے اور جو لوگ ہندستان کی "قلت آبادی" کو ظاہر کرنے کے لئے ہندستان کا مقابلہ بلجیم، ہالینڈ یا انگلستان سے کرتے ہیں وہ کیسی دھاندلی کرتے ہیں کیونکہ رقبائی وسعت کے اعتبار سے انگلستان ریاست حیدرآباد کا دو تہائی، صوبۂ آسام سے بھی چھوٹا اور صوبۂ سندھ سے کچھ بڑا ہے۔ کُل کو جزو کے مقابلے میں برابری سے پیش کرنا، اساسی بھول ہے۔

دنیا کی سطح زمین کا مجموعی رقبہ ۵ کروڑ چوکور میل ہے اور دنیا کی مجموعی آبادی کا اندازہ

دو ارب سے زیادہ تقریباً ۱۲۸ کروڑ کیا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ مجموعی اعتبار سے دنیا کی گنجانی ۴۰ افراد فی چوکور میل ہے اور ہندستان کی گنجانی تقریباً ۲۵۰!

جنوبی امریکہ کا ایک اور بڑا ملک برزیل ہے جس کا رقبہ ہندستان کے رقبے سے دونا ہے مگر وہاں کی آبادی صرف ۴،۱۶،۰۰،۰۰۰ ہے۔ اس لحاظ سے وہاں کی گنجانی ۲۱ ہے اور ہندستان کی ۲۴۶۔ ان اعداد سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ ہماری آبادی کس قدر گھنی ہے! اور یہ غور طلب بات ہے کہ جہاں آبادی پہلے ہی سے کافی گھنی ہوگی وہاں آبادی کے بڑھنے اور پھیلنے کی گنجائش کہاں سے آئے گی؟!

متحدہ امریکی ریاستوں کے صنعتی، کاروباری، تجارتی، زراعتی، فنی اور پیشہ وری بلند معیار کو پیش نظر رکھئے اور خیال کیجئے کہ ایسے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک میں تو ہر چوکور میل پر ۴۴ لوگ آباد ہیں مگر ہندستان میں محکومیت، غفلت اور جہالت کے ہوتے ہوئے ۲۴۶۔

ان اعداد سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کرسکتے ہیں کہ امریکہ کے تمام ملکوں میں نیز آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ میں آبادی کے بڑھنے کی بہت گنجائش ہے! اس کے برعکس یورپ اور ایشیا کے اکثر ملک "لبریز" یا "بھرپور" نہ سہی تو اپنی موجودہ سکت سے زیادہ آباد ہوچکے ہیں۔ اکثر ایشیائی ملکوں کی طرح ہندستان بھی اپنی خام کاری، محکومیت اور محدود ذرائع آمدنی اور زیادہ تعداد آبادی کی وجہ سے اضافی طور پر کثیر الآباد ہے۔ ہندستان کی اضافی کثرت آبادی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کیوں کہ ہمارے موجودہ ذرائع معاش، پیداوار، معمولی بلکہ ادنیٰ معیار معیشت کے لئے موجودہ آبادی بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ ہندستان نہایت سست رفتار پر ترقی کر رہا ہے اور اس کی عظیم ترین اکثریت صدیوں پہلے کی طرح کمل پوش، فاقہ کش، مصیبت زدہ، غافل اور ان پڑھ ہے۔

ہندستان کے مختلف حصوں میں آبادی
کی
گنجانی

ہندستان نہ صرف مجموعی حیثیت سے کافی آباد ہے بلکہ آبادی کی غیر موافقانہ تقسیم کی وجہ سے بعض حصے بہت زیادہ گنجان طور پر آباد ہیں۔ مختلف صوبوں اور ریاستوں میں آبادی کی گنجانی دکھانے کے لئے ہم ان صوبوں اور ریاستوں کی رقبہ واری اور کل تعدادی جدولیں پیش کرتے ہیں تاکہ ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے کہ کون کون سے صوبے بڑے یا چھوٹے ہیں ؛ کہاں کہاں آبادی سب سے زیادہ یا سب سے کم ہے۔

۱) ہندستانی صوبوں اور بعض ریاستوں کی رقبہ واری ترتیب

صوبے یا ریاست کا نام	رقبہ، چوکور میلوں میں	مقابلی کیفیت
مدراس	۱،۲۶،۱۶۶	مدراس کے ہم وسیع ملک جاپان، ناروے اور اٹلی ہیں
متحدہ صوبے	۱،۰۶،۲۴۷	اس کا رقبہ نیوزی لینڈ کے برابر ہے۔
پنجاب	۹۹،۰۸۹	آدھے جرمنی کے برابر۔
متوسط صوبے	۹۸،۵۷۵	رقبہ آدھے جرمنی کے برابر ہے۔ مگر پیداوار؟
حیدرآباد ریاست	۸۲،۳۱۳	انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبے کے برابر۔

صوبہ یا ریاست کا نام	رقبہ مربع میلوں میں	تقابلی کیفیت
کشمیر ریاست	۸۴،۴۱۳	انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبہ کے برابر۔
بنگال	۷۷،۴۴۲	آدھے جاپان کے برابر۔
بمبئی	۷۶،۴۴۳	جاپان کے آدھے رقبے کے برابر۔
بہار	۶۹،۷۵۴	انگلستان اور ویلز کے رقبوں سے زیادہ۔
سندھ	۴۸،۱۳۶	انگلستان سے کچھ کم، تقریباً برابر!
آسام	۴۵،۹۵۱	ہالینڈ، بلجیم اور سوئٹزرلینڈ سے بڑا!
اڑیسہ	۳۲،۱۹۴	سکاٹ لینڈ کے برابر۔
میسور ریاست	۲۹،۴۵۸	سکاٹ لینڈ سے کچھ کم۔
گوالیر "	۲۶،۰۰۸	سکاٹ لینڈ سے کچھ کم
جیپور ریاست	۱۵،۶۱۰	اس ریاست کا ہم وسیع ملک سوئٹزرلینڈ ہے۔
سرحدی صوبہ	۱۴،۲۶۳	ہالینڈ سے کچھ بڑا۔
اندور ریاست	۹،۹۳۴	اس کا رقبہ بلجیم سے کم ہے۔
بروڈا	۸،۲۳۶	اس کا رقبہ بلجیم سے کم ہے۔
ٹراونکور	۷،۶۶۲	ٹراونکور کا ہم وسیع ملک ویلز ہے۔

یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ صوبائی رقبوں میں صرف ان ہی علاقوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو براہ راست انگریزوں کے ماتحت ہے۔ مثلاً پنجاب کا رقبہ ۹۹ ہزار واضح کیا گیا ہے، مگر پنجاب ہی میں بعض دیسی ریاستیں ہیں، جہاں کی آبادی، تہذیب و تمدن سب ہی بقیہ پنجاب کی طرح ہے، جنھیں رقبہ واری وسعت میں ملحوظ نہیں رکھا گیا کیونکہ یہ علاقے دیسی راجاؤں کے ماتحت اور بالواسطہ انگریزوں کے تحت ہیں۔ پنجاب کے صوبائی اعداد میں دیسی ریاستوں کے اعداد کو شامل نہیں کیا جانا چاہئے اور سنجیدہ علمی کتابوں میں یہ فرق ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔ اگر دیسی ریاستوں کا رقبہ شامل کر لیا جائے تو کل پنجاب کا رقبہ ۱۳۷،۲۳۵،

ن سرحد کا ۳۹،۲۲۹ اور اڑیسہ کا ۳،۳۴۹،۰۵ ہوتا ہے۔

(ب) ہندستان کے صوبوں اور بعض ریاستوں کی ترتیب

(آبادی کی تعداد کے لحاظ سے)

ان ہی صوبوں اور ریاستوں کی ترتیب کل آبادی کے لحاظ سے یہ ہے۔

		تقابلی کیفیت
ن بنگال	۶،۲۴،۵۰،۰۰۰	جاپان کی آبادی، کروڑ سے کم ہے۔
صوبۂ بنگال	۶،۰۳۱،۰۰،۰۰۰	" " " " " " "
صوبۂ متحدہ	۵،۵۰،۰۰،۰۰۰	صرف دوآبے کی آبادی انگلستان، سکاٹلینڈ اور اور ویلز سے زیادہ ہے۔
ن مدراس	۵،۶۴،۰۰،۰۰۰	فرانسیسیوں کی تعداد سے ڈیڑھ کروڑ زیادہ۔
صوبۂ مدراس	۴،۹۲،۰۰،۰۰۰	اٹلی، فرانس یا برازیل کی آبادی سے ۱/۲ کروڑ زیادہ۔
بہار	۳،۶۳،۰۰،۰۰۰	انگلستان کی آبادی کے برابر۔
ن پنجاب	۳،۴۰،۱۰،۰۰۰	" " " "
پنجاب صوبہ	۲،۸۴،۰۰،۰۰۰	سپین کی آبادی سے زیادہ
بمبئی	۲۱،۸،۰۰،۰۰۰	
متوسط صوبے	۱،۶۸،۰۰،۰۰۰	ایران کی آبادی کے برابر
حیدرآباد ریاست	۱،۶۳،۰۰،۰۰۰	" " " " "
آسام	[illegible]	
اڑیسہ	۸۶،۲۸،۰۰۰	ہالینڈ کی آبادی کے برابر
میسور ریاست	۶۳،۴۲،۰۰۰	بلجیم کی آبادی سے کچھ کم

		تقابلی کیفیت
ٹراونکور ریاست	۶۰،۷۰،۰۰۰	
کل سرحدی علاقہ	۵۴،۱۵،۰۰۰	
سندھ صوبہ	۴۵،۳۵،۰۰۰	سکاٹ لینڈ کی آبادی کے برابر
گوالئیر ریاست	۴۰،۴۶،۰۰۰	
کشمیر ریاست	۴۰،۲۱،۰۰۰	
سرحدی صوبہ	۳۰،۳۸،۰۰۰	
بروڈا ریاست	۲۸،۵۵،۰۰۰	ناروے کی آبادی کے برابر
اندور ریاست	۱۵،۱۳،۰۰۰	
کل بلوچستان	۸،۵۷،۰۰۰	
بلوچستان	۵،۰۱،۰۰۰	

اسی جدول سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ محض تعداد کے زیادہ ہونے سے کیا حاصل! بھوکے، انپڑھ، جاہل اور نااہل لوگ کروڑوں کی تعداد میں ہوں تو بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو تعداد میں دس گنا کم مگر قابلیت، دولت مندی، کارگذاری، تنظیم، اہلیت اور تعلیم میں سو گنا بہتر ہوں۔ اگر ہماری قوم تاریخ، عمرانیات اور علم تمدن کی اس اٹل حقیقت کو محسوس کرے تو وہ اپنی تعداد بڑھانے کی بجائے (یا تبلیغ اور شدھی پر اپنی توتوں کو صرف کرنے سے قبل!) اپنے آپ کو اہل اور طاقت ور بنانے کی کوشش کرے گی اور کسی صورت میں بھی تحدید آبادی (ضبط تولید) کی مخالفت نہیں کرے گی۔

(ب) ہندستان کے مختلف سمتوں کی گنجانی

	رقبے کے حساب سے آبادی کی تعداد	تقابلی کیفیت
ٹراونکور	۷۹۲	دنیا کا سب سے زیادہ گنجان آباد رقبہ

	رقبے کے حساب سے آبادی کی تعداد	تقابلی کیفیت
بنگال	۷۷۹	ہندستان کا سب سے زیادہ گنجان صوبہ ہے۔ دنیا کا سب سے زیادہ گنجان ملک بلجیم ہے۔ بنگال کی گنجانی اس سے زیادہ ہے۔
بہار	۵۲۱	جاپان سے زیادہ بہار کی آبادی گھنی ہے۔
متحدہ صوبے	۵۱۸	جاپان سے زیادہ آگرہ و اودھ کی آبادی گھنی ہے۔
مدراس	۳۹۱	جرمنی کے برابر گنجان آباد ہے۔ جرمنی کے ذرائع معاش کتنے زیادہ اور اس صوبے کے کتنے کم ہیں۔ یہ بھی ایک اہم سبب ہمارے افلاس کا اور پست معیار زندگی کا ہے۔
بروڈا	۳۳۹	یہاں کی آبادی اٹلی کے برابر گھنی ہے۔
پنجاب	۲۸۷	پنجاب، بمبئی اور اڑیسہ ویلز کے برابر گھنے آباد ہیں۔ اگر ویلز کے باشندوں کی طرح یہاں والوں کو بھی مختلف قسم کے ذرائع معاش میسر ہوتے تو یہ لوگ بھی خوش حال ہوتے۔
بمبئی	۲۶۲	
اڑیسہ	۲۷۱	
میسور	۲۳۹	میسور سوئیٹزرلینڈ کے برابر گنجان ہے۔
سرحدی صوبہ	۲۱۳	
حیدرآباد	۱۹۸	فرانس کے برابر۔
آسام	۱۸۶	گنجانی پرتگال کی طرح ہے۔
متوسط صوبے	۱۷۰	
گوالیر	۱۵۴	
سندھ	۹۳	

رقبے کے حساب سے آبادی کی تعداد		تقابلی کیفیت
کشمیر	۴۹	دنیا کی سب سے زیادہ ترقی پذیر ریاست امریکہ کے برابر!
بلوچستان	۹	کینیڈا اور آسٹریلیا کی گنجانی سے تگنی! اتنا گھنے پر بھی اس قدر زیادہ!

اس جدول اور اس کی تقابلی کیفیت سے ہندستان کی نکبت اور مصیبت واضح ہے۔ میسور ہندستان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست تو ہے گر سوئٹزرلینڈ کے مقابلے میں میسور کی صنعت وحرفت، زراعت، تجارت، فن کاری، تعلیم دس گنی کم ہے! پھر بھی دونوں یکساں گھنے آباد ہیں۔ اگر ایک خاندان کی آمدنی دو ہزار ماہانہ ہو اور دوسرے خاندان کی صرف بیس بائیس گر کھانے والے دونوں خاندانوں میں بیس بیس ہوں تو ظاہر ہے کہ معیار زندگی اور معیار آرام میں کتنا فرق رہے گا اور لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت، ہنر مندی اور اہلیت میں کتنا فرق نمودار ہوگا۔

جن غریب یا تنگ دست ماں باپ کو بہت بچے ہوتے ہیں وہ کبھی اپنی اولاد کو اچھی تعلیم نہیں دے سکتے اور ہونہار افراد مشق اور تربیت حاصل کرکے اپنی کارکردگی بڑھانے اور مستقبل کو سنوارنے کی بجائے کشمکش حیات میں مبتلا ہو کر خود کمانے کھانے پر مجبور ہوتے ہیں اور اس طرح ایک اچھے شہری اور ہنر مند کاریگر یا اعلےٰ صناع بننے سے محروم رہتے ہیں۔ بہتیرے متوسط الحال گھرانوں کے افراد ہیں جو محض اعلےٰ تعلیم یا فنی تعلیم نہیں حاصل کر سکنے کی وجہ سے ترقیوں سے محروم ہیں۔ اکثر بڑے بھائی بہنوں پر چھوٹے بھائی بہنوں کا بار پڑتا ہے اور ایسے وقت جب کہ خود ان میں اپنے پانو پر کھڑے رہنے کی طاقت نہیں پیدا ہوتی یہ بار ان کی زندگی کو برباد کرتا ہے۔ بچوں کو پالتے پالتے ماں باپ پریشان ہو جاتے ہیں اور جس قدر زیادہ وہ غیور اور سمجھ دار ہوتے ہیں، اسی قدر وہ اپنی مصیبت کو محسوس کرتے ہیں اور اپنے بچوں کی مصیبتیں دیکھ دیکھ کر کڑھتے ہیں۔

ہندستان کو فیصلہ کرنا ہی ہوگا کہ وہ کب تک کچی جھونپڑیوں میں، کچے پکے کویلو کے مکانوں میں، کافی یا معقول غذا میسر نہیں کر سکنے والے گھرانوں میں، ناخواستہ اور بادِ خاطر اولاد پیدا کرتا رہے گا؟ متوسط طبقوں کو فیصلہ کرنا ہی ہوگا کہ وہ اپنے سے بہتر اپنی اولاد کے لئے تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا چاہتے ہیں یا خود مصیبتوں میں مبتلا رہ کر دوسروں کو مصیبتوں میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں؟ ہر غیور اور سمجھ دار آدمی کو فیصلہ کرنا ہی ہوگا کہ وہ اپنے معیارِ آرام کو بلند تر کرنا چاہتا ہے اور اپنے چہیتوں کے لئے اپنے سے بہتر ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے یا بن چاہے بچوں کی وجہ سے سب کے معیار کو پست کرنا چاہتا ہے! اگر وہ بہت سوں کو مصیبت اور جہالت میں پالنے کی بجائے چند کو تہذیب اور آرام کے بلند معیار پر پالنا چاہتا ہے تو خاندان کی تحدید اور ضبطِ تولید لازمی ہیں۔ اگر آپ اپنی اولاد کو اپنے سے بہتر تعلیم دینا چاہتے ہیں، اگر آپ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم اور معقول تربیت دینا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ ضبطِ تولید کے موافق بنئے یا کم سے کم ان کی مخالفت نہ کیجئے جو جنسیاتی تعلیم دے کر اچھی فضا پیدا کر رہے ہیں یا ضبط گاہیں قائم کرکے ضرورت مندوں کو بر وقت جائز مدد پہنچانا چاہتے ہیں!

اس جدول کی تیاری میں فرض غرض سے مطلوبہ اعداد یا استدلال کے موافقانہ اعداد حاصل نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ہندستان کے مسئلۂ آبادی کی نوعیت ظاہر کرنے کے لئے، جہاں تک بن پڑا ایمان داری اور غیر جانب داری سے اعداد پیش کئے گئے ہیں؛ کم سے کم اپنے مطلب کے اعداد پیش کرکے اپنے خلاف کے اعداد چھپائے نہیں ہیں۔ ان ہی اعداد کو غیر جانب دارانہ طور پر پیشِ نظر رکھنے سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ وادیٔ گنگا اور اس کے ملحقہ علاقوں کے برابر یورپ کا کوئی ہم وسیع خطہ آباد نہیں! وادیٔ گنگا کے برابر گنجانی کہیں ملتی ہے تو وادیٔ نیل (مصر)، اور وادیٔ یانگ تسی کیانگ (چین) میں! یکساں حالات یکساں نتیجے پیدا کرتے ہیں۔ اسی لئے ان وادیوں

رہنے والوں کی عظیم اکثریت جہالت اور غربت میں پیدا ہوتی ہے، جہالت اور غربت میں پلتی ہے، اور جہالت و غربت میں مرتی ہے! سیکڑوں برس سے یہی ہوتا چلا آیا ہے، کیا آپ چاہتے ہیں کہ آئندہ بھی یہی ہو؟!

بڑھتی آبادی کی رفتار

جہاں حالات موافق ہوتے ہیں اور کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا، رہنے کو مکان نصیب ہوتا ہے وہاں آبادی جس تیز رفتار سے بڑھ سکتی ہے اس کا اندازہ انگلستان کی آبادی کے اعداد سے ہوسکتا ہے۔ تین چار صدیوں سے انگلستان کا شمار ترقی پذیر ملکوں میں ہوتا ہے، خاص کر ۱۹ صدی کی ابتدا سے وہ مسلسل ترقی کر رہا ہے، انگلستان کے ماتحت ملکوں اور علاقوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور اس وقت ساری دنیا کے ایک چوتھائی حصہ پر انگلستان کا پرچم لہرا رہا ہے۔

ایک طرف تعلیم اور میکانیت کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت، زراعت و تجارت میں اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی وجہ سے دولت پیدا کرنے اور حاصل کرنے کے ذریعوں میں اضافہ ہو رہا ہے، مگر دوسری طرف عام تعلیم کی وجہ سے معیارِ زندگی کو بلند کرنے اور معیارِ آرام کو بڑھانے کا شوق بہت عام ہوگیا ہے، اس کی خاطر بچوں کی پیدائش پر بڑی روک تھام کی جاتی ہے، ایک بچے کے بعد دوسرے بچے کی پیدائش تک بہت مہلت دی جاتی ہے جسے اصطلاحی زبان میں Spacing of Children یعنے بچوں میں فاصلہ بندی کہتے ہیں۔ بار بار اور جلد جلد بچے پیدا ہونے سے نہ صرف ماؤں کی صحت بُری طرح متاثر ہوتی ہے بلکہ بچوں کی توانائی اور جانداری بھی گھٹ جاتی ہے۔ اس کے برعکس بچے موزوں وقتی فاصلوں سے پیدا ہوں تو ماں کی صحت بھی متاثر نہیں ہوتی اور بچوں کی تندرستی جانداری بھی زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے آئندہ نسل کا معیارِ صحت بھی بہتر اور بلند تر ہوتا ہے۔

غرض معیارِ زندگی اور معیارِ آرام کی خاطر ترقی پذیر یورپ کے ترقی پسند جوڑے "تین بچوں کے طریق" سے آگے نہیں بڑھتے! بہتیرے بے اولاد ہیں، بہت سوں کو ایک ہی بیٹا یا بیٹی یا ایک بیٹا اور ایک بیٹی یا صرف دو بچے ہیں اور عام طور پر زیادہ سے زیادہ تین یا چار!! اس سے زیادہ بچوں والے خاندان کشمکشِ حیات کی وجہ سے اپنے وقار اور رتبے کو سنبھال نہیں سکتے اور پست تر طبقے میں پہنچ جاتے ہیں لہٰذا ترقی پسندی کے لئے اولاد کی تعداد کو محدود رکھنا لازمی ہے جس کی خاطر حمل قائم ہونے میں نت نئے طریقوں سے روک تھام کی جاتی ہے اور حمل قائم ہو بھی جائے تو اسے جائز اور ــــ ناجائز طریقوں پر ضایع کیا جاتا ہے۔ ان کا فلسفۂ عمل یہ ہے کہ ناخواستہ اولاد نہیں ہونی چاہیئے خاص کر جب کہ ماں باپ کی مالی حالت اس قابل نہ ہو کہ وہ ہونے والے بچوں کی زندگی، تعلیم، تربیت اور معقول ذرایع ترقی کی ضمانت نہ لے سکیں یا اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت دلانے کی معقول توقع نہ کر سکیں! ایسی اولاد سے کیا فایدہ جس کی وجہ سے ماں باپ پریشان ہوں، ان کی ذمہ داریوں میں ناقابلِ برداشت اضافہ ہو، کھانے کے لئے کافی غذا میسر نہ ہو اور رفتہ رفتہ سب کی صحت اور زندگی خطروں میں مبتلا ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ماں باپ کو اپنی اولاد سے اگر واقعی محبت ہے تو وہ بھی ایسی زائد اولاد ہونے نہیں دیں گے جس سے پہلی اور دوسری یا تیسری اولاد کی تعلیم اور تربیت یا صحت و زندگی مخدوش ہو جائیگی بلکہ سچ پوچھئے تو یہ ماں باپ کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے سے بہتر اپنی اولاد کے لئے ذرایع زندگی اور ذرایع ترقی پیدا کریں۔ اگر ان کے حاصل کرنے کی کوئی توقع نہیں تو پھر ماں باپ کو بھی اولاد پر اولاد پیدا کرنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے، خاص کر جب کہ ماں باپ دماغی اور جسمانی اعتبار سے خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہوں اسی لئے یورپ کی بعض ترقی پذیر ریاستوں میں لاعلاج اور خطرناک بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو جبری طور پر "بانجھ دیا" جاتا ہے تاکہ ان کی وجہ سے خطرناک معذوروں کی

تعداد میں اضافہ نہ ہو سکے بعض لوگ اپنی رضامندی سے بانجھ ہو جاتے ہیں تاکہ کثرتِ اولاد کا نشا ہی نہ رہے۔ مختصر یہ کہ ترقی پسند ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی آبادی کو محدود کرنے والے بہت سے اسباب کارفرما ہیں۔ پھر بھی آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ ان اعداد سے ہو سکتا ہے:

۱۹ صدی کی ابتدا سے انگلستان اور ویلز کی آبادی

	کُل تعداد	گنجانی یعنی ہر مربع میل پر لوگوں کی تعداد
۱۸۰۱ء میں انگلستان اور ویلز کی آبادی	۸۹،۰۰،۰۰۰	۱۵۲
۱۸۳۱ء " " " "	۱،۳۹،۰۰،۰۰۰	۲۳۸
۱۸۵۱ء " " " "	۱،۷۹،۰۰،۰۰۰	۳۰۷
۱۸۶۱ء " " " "	۲،۰۰،۰۰،۰۰۰	۳۴۴
۱۸۹۱ء " " " "	۲،۹۰،۰۰،۰۰۰	۴۹۷
۱۹۰۱ء " " " "	۳،۲۵،۰۰،۰۰۰	۵۵۸
۱۹۱۱ء " " " "	۳،۶۰،۰۰،۰۰۰	۶۱۸
۱۹۲۱ء " " " "	۳،۷۸،۰۰،۰۰۰	۶۴۹
۱۹۳۱ء " " " "	۴،۰۰،۰۰،۰۰۰	۶۸۸
۱۹۴۱ء " " " "	۴،۱۷،۰۰،۰۰۰	۷۱۷

ان اعداد پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ۱۸۰۱ء اور ۱۸۵۱ء کی آدھ صدی میں انگلستان اور ویلز کی آبادی دوگنی ہو گئی اگر ۱۸۹۱ء سے ۱۹۴۱ء تک کی آدھ صدی میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا تو وہاں کی آبادی دوگنی ہو کر ...... یعنی تقریباً چھ کروڑ ہو گئی ہوتی مگر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں آبادی [illegible] ہی تھی۔ اس سے

ظاہر ہے کہ انگلستان میں اضافۂ آبادی کی رفتار کم ہوتی جارہی ہے۔

یورپ کے بعض ملکوں میں اضافۂ آبادی کی رفتار اتنی دھیمی ہوگئی تھی کہ آبادی تقریباً مساوی رہنے لگی تھی اور سیاسی اور فوجی نقطۂ نظر سے رہنماؤں کی تشویش کا باعث ہوگئی تھی۔

انگلستان اور ویلز میں تو ہمہ گیر ترقیوں کی وجہ سے آبادی میں اضافہ ہوا مگر جہاں ذاتی پرچم ہے نہ فوج، حکومت ہے نہ دولت، طاقت ہے نہ میکانیت، مفبوضہ ہیں اور نو آبادیاں وہاں بھی تیز رفتار سے آبادی میں اضافہ ہورہا ہے چنانچہ غاقوں، تھایا طاعون، ہیضے، چیچک اور دوسری قابلِ انسداد بیماریوں کے باوجود ہندستانیوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے محض "روحانیت" کے برتے پر۔

۱۸۹۱ء میں ہندستان کی آبادی				۲۷،۹۴،۰۰،۰۰۰
۱۹۰۱ء	"	"	"	۲۸،۳۹،۰۰،۰۰۰
۱۹۱۱ء	"	"	"	۳۰،۳۰،۰۰،۰۰۰
۱۹۲۱ء	"	"	"	۳۰،۵۷،۰۰،۰۰۰
۱۹۳۱ء	"	"	"	۳۳،۸۱،۰۰،۰۰۰
۱۹۴۱ء[له]	"	"	"	۳۸،۹۰،۰۰،۰۰۰

دونوں جدولوں کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ

گزشتہ پچاس برس میں انگلستان اور ویلز کی آبادی میں خالص اضافہ

له ۔ ۱۹۳۷ء میں برما ہندستان سے علحدہ کر دیا گیا تھا لہذا ۱۹۴۱ء میں برمی آبادی کا شمار یوں بھی نہیں کیا جاتا۔ چونکہ ۱۹۳۱ء تک برمی آبادی کا شمار ہندستان کی آبادی میں ہوتا تھا اس لئے ضروری تھا کہ ۱۸۹۱ء اور ۱۹۳۱ء تک کی تعداد سے برمی آبادی منہا کی جائے۔ چنانچہ پیش کردہ اعداد خالص ہندستان سے متعلق ہیں۔ اس کے برعکس ۔

۱۹۴۱ء۔۔۔۔ اور اسی مدت میں ہندستان کی آبادی میں خالص اضافہ ۱۲۴،۰۰۰،۰۰۰ کا ہوا۔ انگلستان کی آبادی کو ہزاروں نئے ذرایع معاش، ملک کے باہر بھی نوکریاں، گتے، ٹھیکے نصیب ہوئے۔ اس لئے انگلستان نہ صرف زائد آبادی کو پال سکا بلکہ اپنا معیارِ آرام اور معیارِ زندگی بھی بہتر کر سکا۔ اس کے برعکس ہندستان نے جو معمولی ترقی کی وہ آبادی کی زائد تعداد کے نذر ہوگئی اور ملک نے مجموعی حیثیت سے کوئی ترقی نہیں کی جس بری بھلی حالت میں ہم سو دو سو برس پہلے زندگی بسر کر رہے تھے اسی طرح اب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ زائد پیداوار بڑھتی ہوئی آبادی کے نذر ہو جا رہی ہے۔

اگر ہم بھی دوسری ترقی یافتہ اور ترقی پذیر قوموں کی طرح ترقی کرنا چاہیں تو ہمارے لئے دو مسئلوں کا حل کرنا ضروری ہے؛ ایک تو یہ کہ زیادہ دولت حاصل کریں جس کے لئے زیادہ ذرایع معاش حاصل کرنا ضروری ہے اور پیدا کردہ اور حاصل شدہ دولت کو معقول طور پر تقسیم کریں جس کے لئے آبادی کو محدود کرنا لازمی ہے۔ اگر واقعی "ایک انار اور سو بیمار ہوں" یا پچاس روپے ماہانہ کمانے والے کے ہاں ایک درجن کھانے والے موجود ہوں تو ترقی کے لئے تعداد کا گھٹانا لازمی ہوگا۔ یہی صورت حال ہندستان میں پیدا ہو چکی ہے اور یہاں کی غربت

، سیشمس، ٹیربک وغیرہ میں برما کے اعداد شامل رکھے گئے ہیں۔ عامیانہ اور غیر ماہر واقف کاروں کے اندازوں میں، اکثر غلطی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ ان اہم تغیرات سے ناواقف ہوتے ہیں۔

بعض کتابوں میں انگلستان کے تحت، انگلستان اور ویلز کے اعداد دیے جاتے ہیں اور بعض میں برطانیہ عظمیٰ کے اعداد ہوتے ہیں حالانکہ انگلستان سے ویلز اور ان دونوں سے سکاٹ لینڈ اور ان تینوں سے شمالی آئرستان علحدہ ہیں۔ ان جزوی باتوں پر خاص طور پر توجہ اس لئے دلائی جا رہی ہے تاکہ معترض بھی احتیاط کریں اور من مانے طور پر اعداد کو غلط نہ قرار دے دیں۔ احتیاط کی توقع غیر ماہروں سے ناممکن اور نام نہاد ماہروں سے بھی کم ہو سکتی ہے۔

اور مصیبت کی ایک وجہ ہمارے ملک کی اضافی کثرتِ آبادی ہے۔

محدود ذرایع آمدنی اور سست رفتار ترقی کے مقابلے میں آبادی کس قدر بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ گذشتہ دہائیوں کی گنجانی سے ہوگا۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں ہندستان میں اوسطاً ۱۷۹ لوگ ہر چوکور میل پر تھے
سنہ ۱۹۱۱ء " " " " ۱۹۱ " " "
سنہ ۱۹۲۱ء " " " " ۱۹۳ " " "
سنہ ۱۹۳۱ء " " " " ۲۱۳ " " "
سنہ ۱۹۴۱ء " " " " ۲۴۶ " " "

گویا اس صدی کے شروع سے اب تک ۶۷ افراد کا بار فی چوکور میل بڑھ گیا ہے! اور زمانے کی رفتار کے مطابق جتنی ترقی ہم نے کی تھی وہ بڑھتی آبادی کی وجہ سے فنا ہوگئی۔ اگر اسی مدت میں آبادی مساوی رہتی یا گھٹ جاتی تو بے شک جابجا ترقی کے آثار دکھائی دیتے۔ شہروں اور قصبوں یا گانو کے مہاجنوں کے بہی کھاتوں سے زیادہ عوام کی ظاہرہ حالت میں! شرح موت کے گھٹتے ہوئے اعداد میں! بڑھتی ہوئی مدتِ حیات میں! مگر آج حالت اتنی اچھی نہیں ہے۔ ہم اُسی نقطے کے قریب ہیں جہاں اس صدی کی ابتدا میں تھے۔ ہماری قوم کی عظیم اکثریت بھوکی ہے، ان پڑھ ہے۔ چیتھڑوں اور کچی جھونپڑیوں پر قناعت کرنے پر مجبور ہے۔ اور دین و دھرم کے نام سے قناعت کا بے موقع سبق دینے والے بہتیرے غرض مند ہیں جو قوم کو محکومیت اور غربت میں مبتلا رکھے ہوئے ہیں۔

تنقید وتبصرہ

The Social Contract and the Islamic State

مصنفہ الیاس احمد، ام اے، لکچرار شعبۂ مدنیات وسیاسیات، جامعہ الہ آباد۔ مطبوعہ دی اردو پبلشنگ ہاؤس، گرانڈ ٹرنک روڈ، جمومسجد، الہ آباد، ۱۹۴۲ء، قیمت ۸/- قسم اول، ۳/- روپیہ قسم دوم۔

موجودہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ نہ صرف اسلامی سیاسی تخیل کی ایک مستند تاریخ لکھی جائے بلکہ خاص خاص اسلامی سیاسی نظریوں کا بھی تقابلی مطالعہ ہو۔ اس طرح ایک طرف ہمیں سیاسی تخیل کی تاریخ میں اسلام کے صحیح مقام سے واقفیت ہو جائے گی تو دوسری طرف ان سرچشموں کا بھی پتہ چلے گا جن کا بعض مغربی نظریوں کو سیراب کرنے میں نمایاں حصہ رہا ہے۔ سیاسی فلسفیوں نے مملکت کے آغاز کے متعلق متعدد نظریے پیش کئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک معرکۃ الآرا نظریہ "معاہدۂ معاشری" کے نام سے مشہور ہے۔ بیشتر منتقدین نے اسے ایک غیر تاریخی اور خیالی نظریہ قرار دیا ہے لیکن الیاس احمد صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں اس نظریہ کی تاریخی اور حقیقی حیثیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اس سلسلہ میں ہمیں عرب کی ماقبل اسلام اور آغاز اسلام سے متعلقہ تاریخ سے کافی مواد ملتا ہے۔

معاہدۂ معاشری کے مصنفین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سیاسی معاشرہ کے وجود میں آنے سے پہلے "حالتِ فطری" پائی جاتی تھی لیکن اس کے تحت جو ناخوشگوار کیفیات پائی

جاتی تھیں ان سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے لوگوں نے ایک باہمی سمجھوتہ کرلیا اور اپنے حقوق ایک شخص یا جماعت کے سپرد کر دیئے۔ اور یہاں سے سیاسی معاشرہ کا آغاز ہوتا ہے۔ الیاس احمد صاحب نے یہ واضح کیا ہے کہ فطری حالت کا جو خاکہ ہابس نے پیش کیا ہے وہ عرب کے ایام جاہلیت کے حالات کے مطابق ہے۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایام جاہلیت کے حالات حد درجہ غیر تشفی بخش تھے، جنگ وجدال کا بازار گرم تھا اور ہر طرف پراگندگی وانتشار کا دورہ دورہ تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس زمانے میں قبیلہ واری تنظیم پائی جاتی تھی۔ ہر قبیلہ کے افراد اپنے سردار سے وفاداری کو ضروری تصور کرتے تھے اور ان میں کافی سیاسی شعور موجود تھا۔ لہذا یہ سوال نہایت ہی اہم ہے کہ محض افراتفری، قبیلہ واری اختلاف اور اخلاقی پستی کو کس حد تک "حالتِ فطری" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مذکورۂ بالا نزاعی بحث کے بعد لائق مصنف نے ان تمام اہم معاہدات کے تفصیلات پیش کئے ہیں جو بالخصوص آنحضرتؐ کے زمانہ میں طے پائے۔ اس سلسلہ میں آپ نے معاہدۂ عقبہ کے مضمرات اور خطبۂ حجۃ الوداع کی سیاسی و معاشرتی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ عہدِ نبوی میں نہ صرف اسلامی معاشرہ کے قیام بلکہ اس کے استحکام کے لئے بھی کئی معاہدات ہوئے شروع میں مدینہ کی شہری مملکت اور اس کے بعد سارے عرب کی مملکت کا قیام بھی اسی قسم کے معاہدات پر مبنی ہے۔ اسلامی ملّت کی شیرازہ بندی کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ نسلی یا جغرافی عناصر کے بجائے چند لازوال روحانی اقتدار کو سنگ بنیاد قرار دیا گیا۔ الغرض جملہ معاہدات کا مقصد ایک ایسے معاشرہ کی داغ بیل ڈالنا تھا جو کہ نہ صرف انسان کی سیاسی زندگی بلکہ اس کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہو۔

کتاب کا اختتامی حصہ جس میں مصنف نے روسو کے تعلیمات کی اسلامی حیثیت اور خود اس مفکر کا مسلمان ہونا بیان کیا ہے دلچسپ ضرور ہے لیکن مزید شہادتوں کا محتاج ہے۔ ہم لائق مصنف کے مشکور ہیں کہ انھوں نے ایک پرانے موضوع کی نئی تعبیر پیش

نے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اسلامی سیاسی تخیل پر کام کرنے والوں کے لئے یہ دلچسپ ور فکر انگیز کتاب ایک نشانِ راہ کا کام دے گی۔

محمد عبدالقادر

مشاہیر یونان و روما ــــ پلوتارک کی کتاب المسیر کا اُردو ترجمہ جلد اول مترجمہ سید ہاشمی صاحب فرید آبادی۔ طبع دوم۔ شایع کردہ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔ قیمت مجلد للعہ؍ غیر مجلد ہیر۔

'مشاہیر یونان و روما' نئی کتاب نہیں ہے۔ یہ آج سے بیس پچیس سال پہلے شایع ہو چکی تھی۔ چنانچہ اکثر اُردو حلقے اس کتاب سے ناواقف نہیں ہیں۔ اُردو دانوں کے لئے، جو مغربی کتابیں بالکل نہیں جانتے اس کتاب کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہے، اس سے یونان اور روما کی عظمت کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ یونان اور روما نے دنیا کی تاریخ و تمدن پر جو اثر ڈالا ہے وہ ظاہر ہے۔ ان قدیم ممالک سے بڑے مشاہیر پیدا ہوئے اور دنیائے علم و عمل میں بڑی ہلچل پیدا کر دی۔ ان ہستیوں کے حالات سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہیئے۔ بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جن کے نام عام طور پر زبان زد نہیں، لیکن ان کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کو کوئی نہیں جانتا۔ مثال کے طور پر حکیم افلاطون اور ارسطاطالیس کو سب ہی جانتے ہیں لیکن ان کی حیات اور کارناموں کی کسی کو خبر نہیں کہ آخر ان لوگوں نے دنیا میں کیا کام کیا تھا۔ یورپ تو یونان اور روما کا بہت ممنون ہے۔ یورپ کی زبانوں میں اس موضوع کی بہتیری کتابیں مل جاتی ہیں جو ان قدیم مشاہیر کے حالات پر روشنی ڈالتی ہیں، لیکن اُردو میں کوئی مواد نہیں ہے۔ اسی وجہ سے انجمن ترقی اُردو نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے عوام کے سامنے پیش کیا تھا جس کو اُردو میں ایک بڑا اضافہ سمجھنا چاہیئے۔ اُردو زبان کی خدمت کا بڑا ذریعہ یہ بھی ہے کہ اس میں دوسری قوموں کی قدیم و جدید تاریخ، علوم و فنون اور سیاست و تمدن کے قیمتی معلومات منتقل کئے جائیں۔ جس مقصد کے لئے اس کتاب کا ترجمہ کیا گیا تھا وہ بہت کچھ پورا ہوا۔ جب یہ کتاب پہلی مرتبہ شایع ہوئی تھی اس کا اُردو حلقوں میں بہت خیر مقدم ہوا۔ اس وقت یہ کتاب اکثر بڑے کتب خانوں میں پائی جاتی ہے۔

یہ کتاب اصل میں ایک مشہور یونانی انشاپرداز پلوتارک کی تالیف ہے جو انگریزی توسط سے اُردو میں پیش کی گئی تھی۔ یہی کتاب ترجمہ کے لئے موزوں ہوسکتی ہے کیونکہ رومی و یونانی ہی اپنے مشاہیر کی ذہنیت اچھی طرح سمجھ سکتے اور پیش کرسکتے ہیں۔ بہت دنوں سے یہ بات محسوس ہورہی تھی کہ اس کتاب کی جدید اشاعت ہونی چاہئے۔ اول تو اس کے نسخے کمیاب ہوگئے تھے، دوسرے ترجمے کی نظرثانی بھی ضروری تھی تاکہ زبان زیادہ سے زیادہ سلیس ہو جائے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اُردو نے یہ ضرورت محسوس کی اور زبان کی اصلاح کرکے اس کو دوبارہ شایع کیا۔ اس سے ایک بڑی کمی پوری ہوگئی۔ اس کی دوسری جلدیں بھی جلد شایع ہو جائیں تو اچھا ہے جس طرح مترجم نے اُمید دلائی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ترجمے کی ایسی نظرثانی نہیں ہوئی جس طرح ہونی چاہئے۔ زبان میں زیادہ سلاست کی ضرورت ہے۔ کتاب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہی ترجمہ ہے۔ ویسے بھی کتاب میں یونانیوں اور رومیوں کے جو نام ملتے ہیں وہ غیر مانوس ہیں۔ ناموں کے لئے تو مجبوری ہے، اس خصوص میں مترجم صاحب کیا کرتے لیکن ترجمے کی زبان زیادہ سلیس ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ حاشئے میں اشخاص اور مقامات کا تلفظ انگریزی میں بھی لکھ دیا جاتا تو ناظرین کو بڑی سہولت ہوتی۔ کیونکہ جو لوگ انگریزی جانتے ہیں وہ انگریزی وضاحت بھی چاہتے ہیں۔

صدیقی

جنگ اور راتب بندی ——— از سعید احمد بینائی، بی۔ اے (عثمانیہ) چھوٹی تقطیع۔ صفحات (۱۱۶) قیمت ندارد۔ شایع کردہ ادارۂ ادب جدید۔ حیدرآباد دکن۔

راتب بندی سے متعلق یوں تو اکثر اخبارات ورسائل میں مضامین شایع ہوچکے ہیں، لیکن اول تو یہ بہت کچھ انگریزی زبان میں ہیں اور دوسرے مخالف یا موافق جذبے کے تحت لکھے گئے ہیں اس لئے عوام خصوصاً انگریزی نہ جاننے والے حضرات

کے لئے مسئلہ زیر بحث سے متعلق معلومات کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے اس کی اصولی ضرورت و اہمیت اور مختلف نوعیتوں کا اندازہ ہوسکے۔ راتب بندی پر اُردو زبان میں یہ بہت ہی پُر از معلومات کتاب ہے جس کے مطالعہ سے نہ صرف راتب بندی کی غرض و غایت اور اس کی اصولی ضرورت و اہمیت کا علم ہوسکتا ہے بلکہ مختلف ممالک میں جن طریقوں پر راتب بندی کا نفاذ عمل میں آتا رہا ہے اور اس سلسلے میں جن باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے ان سے واقفیت ہوجاتی ہے اور اس کے بعد ہندوستان اور خود حیدرآباد میں اس مسئلہ نے کیا صورت اختیار کی اس کا بھی علم ہوجاتا ہے، اس لئے کہ لائق مصنف نے پہلے اصولی بحث کی ہے اور اس کے بعد مختلف مغربی ممالک کے طریقِ کار کا ایک حد تک تفصیلی ذکر کرتے ہوئے ہندوستان میں باوجود اختلافات کے کیوں کر اور کس نوعیت پر اس کا نفاذ ہوا، اس پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس سلسلے میں عام طور پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ راتب بندی کا منصفانہ اصول اور نقطۂ نظر کیا ہونا چاہیئے۔ غرض بہ حیثیت مجموعی بہت بہتر اور جامع ہے جس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے مفید ہوسکتا ہے جو جنگ کے پیدا کردہ دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ راتب بندی کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

س ۔ ف ۔ ح

گوتم بدھ ــــ از ــ ڈاکٹر امام حفیظ سید، ام۔ اے۔ پی ایچ، ڈی۔ ڈی لٹ

شایع کردہ ــــ انجمن ترقی اردو ہند (دہلی)

قیمت مجلد عہ/ بلاجلد عہ/

اس چھوٹی سی کتاب میں مہاتما بدھ کی زندگی کے حالات، بدھ مذہب کے اصول، اس کی تبلیغ اور بدھ ممالک میں اس کی موجودہ صورت کے واقعات کو مختصر لیکن دلچسپ اور سیدھی سادی زبان میں تصنیف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صاف دل

نیک نیتی اور صحیح تحقیق کی غرض سے لکھا گیا ہے۔

چونکہ کتاب چھوٹی سی ہے اور مضمون وسیع اور ہمہ گیر ہے اس لئے بہت سے پہلو چھوٹ گئے ہیں اور بہتسوں کا خاکہ کچا ورنا مکمل رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایسی باتیں بھی درج کی گئی ہیں جو پوری حقیقت کو ظاہر نہیں کرتیں۔

ناموں کے ہجوں کو بھی صحیح نہیں لکھا گیا ہے۔ گوتم بدھ کی جگہ گوتم بدھؑ، انندا کی جگہ آنند، اجات سترو کی جگہ اجات شترو، ویسالی کی جگہ ویشالی ہونا چاہیئے۔ اسی طرح کئی اور بھی نام ہیں۔ کم از کم تاریخی کتابوں میں ناموں کے صحیح ہجے پوری علامتوں کے ساتھ دیے جانے چاہئیں۔

اُردو زبان میں اس طرح کی بہت کم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اُمید ہے کہ انجمن ترقی اُردو ہند اور دوسری انجمنیں اس طرح کی کتابوں کی اشاعت کو اور بھی زیادہ فروغ دیں گی۔

و۔ د

History and Problems of Indian Currency (1835 - 1943) از۔ پروفیسر ڈی، کے، ملہوترا، استاد معاشیات جامعہ پنجاب۔ شائع کردہ منروا بک شاپ، لاہور۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت ۸ روپے۔

پروفیسر ملہوترا کی کتاب کا پہلا ایڈیشن موجودہ جنگ شروع ہونے سے کچھ روز پہلے شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن میں جنگ سے پہلے کے ہندوستانی زر کے مسائل کو اختصار کے ساتھ آسان اور سلیس زبان میں پیش کیا گیا ہے، تاکہ ان مسائل کو طالب علم اور ایسے تعلیم یافتہ اشخاص جنھیں زر کے پیچیدہ مسائل سے دلچسپی ہے سمجھ سکیں۔ شروع میں اُنیسویں صدی میں ہندوستانی زر کی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد سیاربجادلہ کے مسئلہ سے ذرا تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ جنگ عظیم اور اس کے فوراً بعد کے حالات کو اختصار سے سمجھانے کی

بشش کی گئی ہے۔ زیادہ تفصیلی بحث ہلٹن ینگ کمیٹی کی رپورٹ کی سفارشات اور اس کے بعد کے واقعات، خاص طور پر کساد بازاری کے دوران میں ہندوستانی زر کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ سونے کی برآمد، چاندی کی فروخت اور شرح تبادلہ جیسے دقت طلب مسئلہ کو اس قدر آسان اور دلچسپ پیرائے میں پیش کیا گیا ہے کہ بہت سے اشخاص اس کو سمجھ سکتے اور استفادہ کر سکتے ہیں۔

یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی اور مصنف کو دوسرا ایڈیشن شایع کرنا پڑا۔ یہ ایڈیشن اپریل ۱۹۴۴ء میں شایع ہوا ہے۔ موجودہ جنگ نے ہندوستانی زر کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے اور زر کے بہت سے نئے نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ موجودہ گرانی کی وجہ سے زر کے مسائل میں لوگ زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ نئے ایڈیشن میں ان مسائل سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ نگرانی تبادلہ کی تفصیلات ملتی ہیں۔ افراطِ زر کے اسباب، اس کا تعلق حکومت ہند کی مالیاتی پالیسی سے، اور ہندوستانی معاشرہ خاص طور پر زرعی طبقہ پر اس کے اثرات سے تسلی بخش بحث کی گئی ہے اسی کے ساتھ ساتھ افراطِ زر کے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ غرض افراطِ زر کے سلسلہ میں جو کچھ مباحث ہوئے ہیں ان کا خلاصہ بہت خوبی سے دیا گیا ہے۔ اسٹرلنگ کے فاضلات کے مسئلہ کی تفصیلات بھی کتاب میں ملتی ہیں۔

آخری باب میں ہندوستانی زر کے مستقبل عنوان کے تحت امریکی، برطانوی اور کنیڈائی حکومتوں کی طرف سے جو بین الاقوامی زر کے منصوبے پیش کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ ملتا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ کن شرائط کے ساتھ ہندوستان کا بین الاقوامی زر کی تنظیم میں شریک ہونا مفید ثابت ہوگا۔ یہ ہیں وہ چند اہم مسائل ہیں جن سے نئے ایڈیشن میں بحث کی گئی ہے اور جن کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں دو چند اضافہ ہو گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں چند مفید ضمیمہ جات دیئے گئے ہیں، ان میں خاص طور پر کتابوں کی فہرست بہت ہی مفید ہے، اور مسائل کی تفصیلات معلوم کرنے والوں کو ان کتابوں سے بہت بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں اور بھی زیادہ مقبول ہوگا اور معاشیات کے زیادہ سے زیادہ طلبا اور تعلیم یافتہ حضرات اس سے استفادہ کریں گے۔ (ا۔ ح۔ خ)

مجلۂ طیلسانین

۱۔ مجلۂ طیلسانین انجمنِ طیلسانین جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس کا شمار حیدرآباد کے معیاری رسالوں میں ہوتا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں: ایک حصۂ عام اور دوسرا حصۂ معاشیات۔

۲۔ حصۂ عام میں ادبیات، سیاسیات، عمرانیات، اخلاقیات، نفسیات، قانونیات، فلسفہ، دینیات اور جمالیات پر ماہرین کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

۳۔ حصۂ معاشیات صرف معاشی عنوانات کے لئے وقف ہوتا ہے۔ اس میں نظری اور عملی معاشیات پر اہلِ قلم کے مضامین شامل ہوتے ہیں۔ مقامی اور بیرونی مسائلِ حاضرہ پر ٹھیٹ علمی پیرائے میں بحث کی جاتی ہے۔

یہ رسالہ رائل سائز کے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اعلیٰ مضامین اور اس قدر زیادہ حجم کے باوجود اس کا سالانہ چندہ مقامی خریداروں سے پانچ روپے سکۂ عثمانیہ اور بیرونی خریداروں سے پانچ روپے بارہ آنے سکۂ انگریزی مع محصول ڈاک رکھا گیا ہے۔ قیمت فی پرچہ (۱۲؍) ہے۔

(مجلہ طیلسانین عثمانیہ۔ نشان کلام باغ عامہ۔ حیدرآباد دکن طیلسانین ۲ (۲۰۰۳)

فہرست مضامین

جلد (۶) جون ۱۹۳۵ء شمارہ (۲)

پروفیسر لاسکی کا نظریۂ تکثیریت

(بسلسلۂ گذشتہ)

وفاقی مملکت یہاں تک پہنچنے کے بعد یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم تکثیریت اور اقتدار اعلیٰ پر بحث ختم کرنے سے قبل وفاقی مملکت کے اقتدار پر بھی غور کرلیں۔ مملکت کے کل افراد حکومت کے نظم ونسق میں مساوی حصہ لینے کے خواہش مند ہیں۔ انہیں اس امر کا پوری طرح احساس ہو چلا ہے کہ حکومت ایک فرد یا چند افراد کا پیدائشی حق نہیں۔ ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی آواز کو موثر بنائے اور امور نظم ونسق کی انجام دہی کے لئے اس کی رائے بھی شمار کی جائے۔ اس طرح ایک نئی بحث شروع ہوتی ہے کہ فرد کی رضامندی Consemt کو علم سیاست میں کہاں تک دخل حاصل ہے اور اس کی اہمیت کا کیا عالم ہے۔ لاسکی اس مسئلہ کے حل کے ساتھ فرد کے حق نیابت کو بھی پیش کرنا چاہتا ہے۔

لاسکی نے بتلایا کہ حکومت اور فرد میں ایک وسیع خلیج حائل ہے اور اس امر کی ضرورت ہے کہ اپنے مطالبات کو حاصل کرنے کے لئے حکومت کے سامنے تجاویز پیش کی جائیں اور یہ ثابت کیا جائے کہ نظم ونسق کو وسیع اختیارات کے تحت انجام دینا فرد کا حق ہے۔ حکومتی کاروبار چلانے کے لئے افراد مملکت کی رضامندی ناگزیر ہے اور فرد اس خواہش کا اظہار اپنے تجربات کی روشنی میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ فرد کی رضامندی اور تجربات کو اپنی مشنیری کے اہم اجزا تصور کرے۔ اس طرح لاسکی نے حکومت کو باہمی تعلقات کا

مجموعہ بتلایا ہے جس کی افادیت اسی وقت ظاہر ہوگی جبکہ ان تعلقات کو ہم آہنگ رکھنے کے لئے ایک بہترین تنظیم پیدا کی جائے۔ ایسی حکومت جو افراد مملکت کی خواہشات کے خلاف تشکیل پائے سود مند نہیں ثابت ہوسکتی۔ اسی لئے حکومت افراد کے تجربات کو مسائل کے حل میں جگہ دے جس سے ان کی ایسی خواہشات جو تجربات ہی پر مبنی ہوں پوری ہوں گی۔ حکومت کے بہت سے مابہ النزاع مسائل غیر تشفی بخش معلومات کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس خرابی کو دُور کرنے کے لئے حکومت سے توقع کی جاتی ہے کہ صحیح معلومات بہم پہنچانے کے ذرائع اختیار کرے گی اور ساتھ ہی محکمہ جات کے صدر اپنے متعلقہ امور کی انجام دہی کے لئے محکمہ کے عمال کے تجربوں سے استفادہ کریں گے۔ ان کی خواہشات اور آراء کو جن میں معقولیت نظر آئے عملی جامہ پہنانے کی ممکنہ سعی کریں گے۔ صرف اس پر اکتفا کافی نہیں بلکہ اس کا انتظام بھی ہو کہ فرد کو اپنے تجربات کے ظاہر کرنے کے نہ صرف مواقع بہم پہنچائے جائیں بلکہ اس کی ہمت افزائی بھی کی جائے۔ اگر کوئی حکومت اس اہم مقصد سے آنکھ پھیر لے تو اس کی افادیت کا مسلم ہونا ممکن نہیں۔ آزادی رائے کا حق دینا اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ فرد سے اس کے مطالبات کو پورا کرنے کے لئے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ فرد کے تجربات اسی وقت افادہ پیدا کردیں گے جبکہ اس کے مطالبات پورے ہوں۔ اگر کسی تنظیم میں فرد کی رائے کو ٹھکرا دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی احتیاجات پوری طرح ظاہر نہیں ہوں گی۔ اس طرح جہاں فرد کی احتیاجات کا تعین حکومت کی جانب سے ہو اور فرد ہی کو نظر انداز کردیا جائے۔ ایسے نظم کی کامیابی کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ عمومی تنظیم کے مرکز میں شہریوں کو جذب کرنا عمومیت کا جزو اولین ہے۔ مملکت کا ارادہ شہریوں کے ارادے سے افضل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرد حکومت کے ساتھ کس حد تک اشتراک عمل کرے۔ ہر مسئلہ کے حل میں اشتراک و تعاون پوری طرح ہونا چاہئے۔ اتحاد و یگانگت کے جذبات جس حد تک کم ہوں گے اسی طرح اختلافات کی خلیج وسیع ہوگی۔ یہاں تک غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فرد از روئے قانون حکومت سے

کہاں تک وابستہ رہے گا۔ دوسرے الفاظ میں قانون کی حدود کتنی وسیع ہیں ۔کیا قانون افراد کے خانگی معاملات میں جس سے دوسرے فرد کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے دخل انداز ہوسکتا ہے؟ مثلاً مذہب کو لیجئے ۔ قانون کا افراد کے مذہبی معاملات میں دخل در معقولات کرنا بڑی بڑی پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے ۔ یہ پہلی صورت تھی ۔ دوسری صورت میں فرد بہ حیثیت ایک اجتماعی حیوان Associative Animal. پیش ہوتا ہے جس کا تعلق مذہبی اداروں، انجمن مزدوران اور بین اقوامی انجمن کارکنان سے ہوتا ہے ۔ ان اداروں میں زندگی اور نمو ہے جن کو ہم اجتماعی شخصیتیں کہہ سکتے ہیں اور جن کے ذریعہ فرد اپنی خواہشات کا اظہار کرتا ہے ۔ ایسے اداروں کی افادیت سے انکار کرنا ایک اندوہناک امر ہوگا۔ تیسری صورت میں مملکت افراد کے مابین مکمل اتحاد کے مواقع فراہم نہیں کرتی بلکہ بعض اوقات مجبوراً اتحاد کے کچھ اسباب پیدا کرتی ہے۔ اس طرح قانون کو جا و بیجا مقامات پر پیش کرنا کوئی بہتر خدمت متصور نہ ہوگی ۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد لاسکی اہم مسئلہ کو غور و فکر کے لئے پیش کرتا ہے ۔ وہ یہ کہ حکومت کی وجہ سے افراد کے مابین رشتۂ اتحاد پیدا کیا جاتا اور برقرار بھی رکھا جاتا ہے ۔ اس لئے حکومت کی فرمانبرداری فرد بہ طیب خاطر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اس امر پر بھی غور کرنا ہے کہ حکومت کی مذکورہ کوشش کس طریقہ سے روبہ عمل لائی جائے ۔ مملکت چونکہ اتحاد برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہے، اس خدمت کے صلہ میں فرد دیگر اداروں کے مطالبات کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی فرمانبرداری کا ثبوت دے۔ یہ مسئلہ اتنا سیدھا نہیں کہ اسے ہم اپنے لئے فوراً قابل قبول بنالیں حکومت کے اداروں اور اس کے اعلانات پر بھروسہ کرکے اس کی افادیت بتلانا حد درجہ گمراہ کن ہے۔ لاسکی یہ نصیحت کرتا ہے کہ فرد حکومت کی نیتوں پر غور نہ کرے بلکہ اس کے طریقۂ عمل کا جائزہ لے جو فی الحقیقت اول الذکر سے بہت مختلف ہوگا۔ اپنے بیان کی تائید میں لاسکی نے قوانین کے نفاذ اور اپنے دائرہ عمل پر بحث کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ قانون دراصل حکومت کے جذبات کی نمائندگی کرتا ہے حالانکہ اسے رائے عامہ کو منعکس کرنا چاہئے تھا

ملک کے سربرآوردہ طبقہ کی نیابت کرنا اور اس پر نہایت کامیابی سے رائے عامہ کا ملمع کرنا دورِ حاضرہ کے اکثر و بیشتر ممالک کی خصوصیت رہی ہے۔ کیا صرف حکومت ہی ملک کی نفسیات کی نمائندگی کرتی ہے یا اس کے علاوہ اور ادارے بھی ہیں جو افراد پر مملکت کی طرح مساوی اثر رکھتے ہیں، غور طلب مسئلہ ہے۔ فرد مملکت کو چھوڑتا ہے اور کلیسا کی تائید کرتا ہے، مملکت کو نظر انداز کرتا ہے اور انجمن مزدوران کو قبول کرتا ہے۔ اگر قانون رائے عامہ کا مظہر ہے تو پھر کیوں کوئی مملکت کے جاری کردہ قوانین کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ قانون، سیاسیات کا افریدہ نہیں بلکہ معاشری حالات کا ناگزیر نتیجہ ہوا کرتا ہے جیسا کہ راسکو پونڈ نے بھی ثابت کیا ہے۔ قانون، معاشری رجحانات کو منعکس کرنے سے قاصر رہتا ہے اس کی خلاف ورزی فطرت کے عین مطابق ہوتی ہے۔ اس طرح جو نتیجہ نکالا جائے گا وہ یہ کہ قانون سازی میں جس طرح مملکت دخل رکھتی ہے اسی طرح دیگر ادارے اور انجمنیں بھی مساوی حقوق رکھتی ہیں۔ فرد مملکت کی فرمانبرداری پر قانوناً مجبور ہے اور اپنی انجمن کی اطاعت ضمیر کی آزادی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہاں یہ غور کرنا ہوگا کہ جماعت کی وہ کیا افادیت ہے جو فرد کو سکون و چین عطا کرتی ہے اور جو مملکت کے بس کی بات نہیں۔ ادارے اپنے اراکین کے مطالبات اور خواہشات کی روح پالیتے ہیں جو مملکت سے ممکن نہیں۔ ان مطالبات کو خلوص اور نیک نیتی سے پیش کرتے ہیں، جس کی نظیر مملکت میں نہیں ملتی۔ "جس طرح مملکت ایک حقیقت ہے اسی طرح جماعت بھی ایک حقیقت ہے"[1] ماحول کے اندر جماعت کا نشو و نما ہوتا ہے۔ جماعت کی مدد سے فرد اپنی جدوجہد کے راستہ کو پاتا ہے۔ اخلاقی اور معاشری اصولوں کا معین کرنا جماعت ہی کے فرائض میں داخل ہے۔ مختصر یہ کہ جماعت اپنے اراکین کی معاشی، عمرانی اور اخلاقی حالت کو سدھارتی ہے جماعت کے ہٹ جانے سے فرد ایک خلاء سا محسوس کرتا ہے۔ ہر جماعت چاہے وہ معاشی ہو یا عمرانی، سیاسی ہو یا مذہبی، علمی ادارہ ہو یا کھیلوں کی انجمن اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں

---

[1] Grammar of Politics, Laski P. 255

مصروف ہے اور اپنے اراکین کی ذاتی صلاحیتوں کو برابر اجاگر کرتی رہتی ہیں۔

ان اداروں کے افادی پہلو پر ہم نے غور کیا۔ اب ذرا دوسرے رُخ پر بھی غور کرنا مناسب ہوگا۔ قومی مملکتوں کی طرح جماعت بھی اپنے اراکین میں شخصی اعتماد کو قابل بھروسہ نہیں بتلاتی۔ فرد ہر مصیبت کے وقت جماعت کی دست گیری کا متمنی ہوگا۔ ایک ادارہ دوسرے ادارہ کی روایات، چاہے ان کا افادہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، اپنے اراکین کے لئے قابل قبول نہیں محسوس کرتا۔ فرد اپنے ادارہ پر نکتہ چینی نہیں کر سکتا، کیونکہ سختی کے ساتھ تنقید کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ جماعت کا ایقان ہے کہ وہ خامیوں سے بالاتر ہے اور کسی قسم کی لغزش ممکن نہیں۔ گورنروں کی طرح جماعتی لیڈر اپنے بلند خیالات کی اشاعت کرتے ہیں، چاہے ان میں عمیت ہو یا نہ ہو۔ ادارہ کی کونسل سے اختلاف کر جاتے ہیں۔ کسی ادارہ کی رکنیت کے معنے وسیع النظری کو خیرباد کہہ کر کوتاہ فہمی پیدا کرنا، منکسرالمزاجی کے بجائے سخت گیری کو پرورش کرنا اور باعزت معاہدوں کے بدلہ بغیر چون وچرا کے اطاعت کرنا ہوگا۔[۱]

ہم نے اداروں کے حُسن وقبح کی جانچ ضرور کرلی اور ایسا محسوس کیا کہ جو نقائص مملکت میں دکھلائی دیں ان کی صحیح تصویر اداروں کی زندگی میں بھی رقصاں ہے لیکن اس کے باوجود مملکت اور دیگر اداروں میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ بنظر تعمق دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جماعتیں دراصل اعزازی ادارے ہیں جن کے پاس کوئی آخری اور قطعی اقتدار نہیں۔ اگر فرد اپنی جماعت سے ناراض ہے تو اس کی رکنیت سے وہ مستعفی ہو سکتا ہے لیکن جماعت کی اس کمزوری کے یہ معنے نہیں لئے جا سکتے کہ مملکت ایک قوی عنصر ہے۔ فی الحقیقت جماعت بہ نسبت مملکت کے اپنے اراکین کے جذبات، خواہشات اور مطالبات کو کامیابی کے ساتھ پیش کرتی اور انہیں منواتی رہتی ہے۔ لاسکی کے اس خیال سے بعض مفکرین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آخر ش اس نے اقتدار مملکت کو غیر دانستہ طور پر حکومت کے نظم ونسق پر محیط کر دیا۔ یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔

۱۔ Grammar of Politics, Laski P. 258

اگر لاسکی یہ نہ بتلایا ہوتا کہ جماعت اپنے اراکین کے مطالبات کو بہ نسبت مملکت کے زیادہ کامیابی سے پیش کرتی ہے تو پھر اقتدار مملکت کے حامیوں کے اعتراض میں واقعیت نمودار ہوجاتی۔غور کیجئے کہ لاسکی نے کس طرح جماعت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ "جماعت کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق منظم ہونا پڑے گا۔اس کو اپنے اصول و قوانین میں بہ نسبت مملکت کے زیادہ ترمیم کرنی پڑے گی تاکہ فرد کے مقاصد بہتر طریقوں سے حاصل کئے جاسکیں"[لہ]۔ جس ادارہ نے قانون سازی کی بنیاد سیاست پر نہیں، معاشرت پر رکھی ہو اور بدلتے ہوئے حالات سے اپنے ضوابط کو ہم آہنگ کیا ہو وہ اپنے وجود کے برقرار رکھنے میں بہ نسبت مملکت کے زیادہ کامیاب ہوگا۔جماعتی اقتدار کی بنیاد حقیقت یہ ہے کہ اس کے فطری اصول ہیں جن کی بنا پر اسے اپنے اراکین کا اعتماد حاصل ہے اور وہ ان پر مقتدر ہے۔لاسکی نے جس مسئلہ کی حمایت میں اس کامیابی سے وکالت کی ہو اس کا رائیگاں جانا ممکن نہیں۔ان امور پر غور کرنے کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جماعت ہی دراصل فرد کی بقا کی ضمانت دلاتی ہے۔جو ادارے حقائق زندگی سے بحث کرتے ہیں انہیں حکومت کے نظم و نسق میں نظر انداز کرنا قرون وسطیٰ کی جابریت سے کم نہیں۔ان وجوہ کی بنا پر لاسکی حکومتوں کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ جماعتوں کے تعاون اور اشتراک سے حکومت کریں۔اس طرح لاسکی نے وفاق کی تائید کی جس میں ممالک متحدہ امریکہ کی طرح مملکت اور ادارے برابر کے شریک ہوں گے اور اقتدار مملکت اور اداروں کے مابین تقسیم ہوگا جس طرح مملکت کو حکومت کا حق حاصل ہوگا بالکل اسی طرح جماعتیں بھی نظم و نسق چلاتی رہیں گی اور ہر ایک کے فرائض کا دائرہ معین ہوگا۔ان ہی اصولوں کے پیش نظر لاسکی نے یہ بتلایا کہ "جس چیز کی میں تلاش میں ہوں وہ ایسا مرکز نہیں جہاں میری انفرادیت ہی غائب ہوجائے، بلکہ ایک ایسا مرکز ہے جس کے کارناموں میں میرا نام بھی برقرار رہے"[ٹلہ]۔ آگے چل کر لاسکی لکھتا ہے کہ جس حکومت میں فرد کی آواز موثر ثابت نہ ہو اور اداروں کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہو وہ اتحاد کے پیدا

لہ۔ Grammar of Politics, Laski P. 254

کرنے میں کامیاب نہیں ہوگی۔ اگر فرد کو یقین ہو جائے کہ اس کے تجربات کے ظاہر کرنے میں اسے آزادی ہے اور وہ قابل قبول بھی ہوں گے تو ایسی حکومت کے معمار قوم کے کل افراد ہوں گے۔ بہرحال لاسکی معاشرہ کی تنظیم کو وفاقی بنیاد پر کرنا چاہتا ہے تاکہ اس میں پائیداری پیدا ہو جس کی بناء پر فرد اور مملکت، اداروں اور ان کے تعلقات میں ہم آہنگی نمودار ہو سکے[1]۔ مملکت کے نظم ونسق کی تبدیلی اسی وقت عوام کی تائید حاصل کر سکتی ہے جبکہ حکومت کے مقاصد نیک ہوں اور وہ یہ ثابت کر دے کہ حکمرانی کے اصول کسی غیر جماعت کے عاید کردہ قیود نہیں بلکہ جماعتوں اور اداروں کے تجربات ہیں۔

لاسکی، معاشرہ کی تنظیم وفاقی طرز پر کر کے ایک طرف مملکت کا دائرہ محدود کرتا ہے اور دوسری طرف فرد اور جماعت کی ترقی کے جملہ ذرائع فراہم کرتا ہے۔ یہ تجویز فی الحقیقت لاسکی کے بین اقوامی مسلک کی حیات افروز مثال ہے۔

مملکت اور اس کے اداروں کے باہمی تعلقات پر ہم نے تفصیل سے بحث کی لیکن یہ بحث اس وقت تک تشنہ رہے گی جب تک کہ، وفاقی مملکت کے طریقۂ نیابت پر بھی غور نہ کرلیں۔ یہ امر واضح ہے کہ لاسکی نے مملکت کے قطعی اقتدار کو غیر فطری اور ناپائیدار ثابت کیا اور مملکت فرد کو جن بنیادوں پر حق نیابت عطا کرتی ہے، اسے بھی لاسکی پسند نہیں کرتا۔ لاسکی نے لپ مئین کے خیال کو کہ ہر رکن مقننہ اپنے مقام اور رائے دہندوں کے خیالات کی صحیح ترجمانی کرتا اور مرکز کو بہترین مشورے دے گا، رد کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ انتخابات کی بے ہنگامیوں کی بناء پر معمولی دماغ کے لوگ منتخب ہو جاتے ہیں۔ نمایندے بہت کم صحیح حالات کو پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ عام طور سے نمایندے پیش نظر مسائل کے دوران میں ہاں یا نہیں کے سوا کچھ کہتے ہی نہیں۔ مقننہ کے چند ہی اراکین ایسے ہوں گے جو بحث ومباحثہ میں حصہ لے سکیں اور اپنے رائے دہندوں کے خیالات کو منعکس کر سکیں۔ مختصر یہ کہ نمایندہ ان مقاصد کو

---

[1] Grammar of Politics, Laski P. 262

بروئے کار لانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا جس کی توقع رائے دہندگان نے انتخابات کے وقت کی تھی
ان حالات کے تحت لاسکی یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ قانون سازی کی انجام دہی کے لئے اراکین مقننہ کا
جو مساوی مقتدر رہیں تھوڑے عرصہ کے لئے تبدیل کیا جائے (وہ اراکین مقننہ ضرور
رہیں گے) اور ان وقفوں کے دوران میں جماعتیں اپنے اثرات کو مضبوط کریں تاکہ مقننہ پر اثر باقی رہے
اس طرح اراکین مقننہ کو نامزد کرنے والی جماعتیں ہوں گی جو مقننہ کی کارروائیوں پر نگرانی رکھتی ہیں
اداروں پر سرمایہ دار طبقہ کا اثر نہیں ہوتا اور ساتھ ہی مقننہ کو صحیح معلومات بہم پہنچانے کا ذریعہ یہ
جماعت ہی ہوگی۔ معلومات کی سربراہی کے ساتھ لاسکی ایک اور مسئلہ کو پیش کرتا ہے کہ مواد کا
فراہم کرنا ایک بات ہے اور اس کو منطبق کرنا دوسری بات ہے معلومات حاصل ہونے پر ان سے
متعلق بحث ہوسکتی ہے لیکن قانون سازی کے وقت متعلقہ جماعتوں کی رائے بھی معلوم کی جائے
اور اسی روشنی میں قانون کی تدوین ہو۔ افراد کی جماعتیں اور مقننہ کے اراکین ایک دوسرے سے
قریب تر ہیں۔ جس حد تک ان دونوں میں ارتباط برقرار رہے گا اسی قدر نیابت کامیاب ہوسکے گی۔

اس بحث کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وفاقی مملکت کی افادیت پر غور کریں۔
جب یہ اتنی مسلم ہے تو کیوں نہ اسے اختیار کیا جائے۔ وفاق دراصل قوموں کے اختلاف کو
مٹا کر سب کو ایک سطح پر لاتا ہے۔ ممکن ہے یہاں یہ اعتراض اٹھایا جائے کہ جب وفاقی نظام
عوام کی خوش حالی کا ضامن ہے تو ہندوستان کے دستور میں وفاقی اجزا کیوں نہ شامل کئے جائیں
وفاق کو کامیاب بنانے میں ہندوستانیوں کی کوششیں ناکام رہیں، اس لئے حقائق کی روشنی میں
لاسکی کا خیال کہ افراد مملکت کے اختلافات مٹ سکتے ہیں اور مملکت کی جماعتوں اور مملکت کے
تعلقات میں ہم آہنگی وفاق ہی کے ذریعہ قائم کی جاسکتی ہے، دلائل کی کسوٹی پر پورا نہیں
اترتا۔ معترضین کو یہ جان لینا چاہئے کہ وہ مملکت کے اقتدار اعلیٰ کو زائل کرنے اور وفاقی
نظم ونسق کے لئے فرد کی تعلیم وتربیت پر ہمیشہ زور دیتا ہے۔ وفاق کو کامیاب بنانے کے لئے
تعلیم یافتہ افراد بہر نوع ضروری ہیں جس کو لاسکی نے ایک سے زاید مرتبہ پیش کیا۔ ہندوستان میں
جہاں کا تعلیمی اوسط گرا ہوا ہو وفاق کیسے کامیاب ہوگا؟ افراد اور مملکت یا ریاستوں اور

مملکت کے مابین معاشری کاروبار چلانے کے لئے جو سمجھوتہ ہوتا ہے اسے وفاق کہتے ہیں سمجھوتہ کے معنے چند حقوق سے دست برداری اور چند کی حفاظت ہے ۔ یہ صورت اسی وقت پیدا ہوگی جبکہ ذہن میں روشن خیالی پائی جائے ۔ وسیع النظری پیدا کرنے کی اولین شرط تعلیم ہے جس کا ہندوستان میں فقدان ہے ۔ اس طرح لاسکی نے یہ ثابت کرکے کہ "معاشرہ دراصل وفاقی بنیاد پر قائم ہے"[1] انسانیت کی بڑی خدمت انجام دی ہے ۔ آگے چل کر اس نے بتلایا ہے کہ چونکہ معاشرہ میں وفاقی تصورات موجود ہیں اس لئے اقتدار کو بھی وفاقی پہلو لئے ہونا چاہیے ۔ اگر مملکت اپنی زندگی کی متمنی ہے تو اسے فرد اور اس کے انجمنوں کو اپنے جملہ کاروبار حکومت میں موثر بنانا چاہیئے ۔ اگر آپ کلیسا کی اصلاح کریں اور اس کے اراکین کی شکایات برقرار رہیں تو یہ اصلاح نہیں بلکہ ایک فریب ہے ۔ اگر آپ معاشرہ کی سدھار پر کمربستہ ہوں اور فرد کو نظرانداز کردیں تو ایسی اصلاح کے نتائج صرف مملکت کے لئے سودمند ہوں گے جو شاید فرد کے لئے نقصان دہ ثابت ہوں ۔ بہرحال ان دلائل سے لاسکی یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مملکت دراصل وفاقی اصولوں پر چلائی جائے جس میں فرد بہ حیثیت ایک ہم رتبہ کارکن کے شرکت کرے گا ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مملکت کے اداروں کو جن کی معاشری اور صنعتی اہمیت واضح ہو چکی ہے وفاقی دستور پر چلایا جائے اور مملکت اس کو قبول بھی کرے اگر وہ اپنے ارادوں میں واقعیت کا پہلو پیدا کرنا چاہتی ہے ۔ لاسکی اس تجویز سے مملکت پر جماعتوں کے حلقۂ اثر کا سکہ بٹھا کر اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ان اداروں کو اپنی طرح مساوی مقتدر قرار دے ۔ اس تصویر کی عملی شکل وفاق ہے ۔ اس تجویز کا ایک اور نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ مملکت کا بالراست نظم و نسق کم ہو رہا ہے اور اس کے قوانین کا اطلاق جن کو جماعتوں نے شہریوں کے لئے قابل قبول بنایا بدلتے ہوئے حالات پر ہوگا ۔ مملکت کے قوانین شہریوں کے مسائل کو پوری طرح نہیں حل کرسکتے اس لئے جماعتوں کو وقتاً فوقتاً اختیار ہوگا کہ وہ ترمیم پیدا کریں ۔

---

[1] Grammar of Politics, Laski P. 270

تجاویز کے نتائج لاسکی کہتا ہے کہ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں بڑی بڑی دقتوں کا سامنا ہوگا لیکن نتائج مسائل حیات سے قریب تر ہوں گے مملکت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے افراد کو مساویانہ درجہ عطا کرے۔ مملکت کا یہ فرض ہے کہ وہ افراد کی مکمل معاشری مرفہ الحالی کے انتظامات روبہ عمل لائے۔ ان تجاویز کو نظم ونسق میں داخل کرنے کے معنے یہ ہوں گے کہ نہ تو کوئی یہودی ہے اور نہ عیسائی، نہ آقا ہے اور نہ غلام۔ مملکت اگر اپنے ماحول کو پیش نظر رکھے جو فی الحقیقت ہر فرد کی اہمیت کو نمایاں کر رہے تھے تو یقیناً ان مقاصد کا پیدا ہونا لابدی ہے۔ اس طرح مملکت معاشرہ کی اصلاح دیانت دارانہ بنیادوں پر انجام دے گی۔ یہ نئی مملکت چند کی خوش حالی کی وکالت نہیں کرتی بلکہ عوام کی خواہشات کی ترجمان ہوگی۔ افراد کے تجربات کو اس کے نظام نامہ میں پوری اہمیت حاصل ہوگی۔ یہ مملکت معاشرہ کی صحیح ترجمان ہوگی۔ اس کے قواعد و قوانین جبر و تعدی سے عوام پر منطبق نہیں ہوں گے بلکہ عوام انہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے کیونکہ انھوں نے ہی تو ان کی تشکیل دی ہے۔

لاسکی اپنی تجاویز کو پیش کر کے ان سے خوش آئند نتائج نکالنے کو مناسب نہیں خیال کرتا۔ اس نے اپنی پیش کردہ مملکت پر جس میں افراد مساویانہ درجہ رکھتے ہیں دو شرائط عائد کی ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ مملکت اپنے نظم ونسق پر تنقید کو قبول کرے۔ اس کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ عوام اس کی تجاویز پر غور نہیں کریں گے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ اس کے انجام دئے ہوئے اُموریں کہاں تک افراد کی بھلائی مضمر ہے۔ لاسکی بتلاتا ہے کہ اس کے معنے ایک ایسی جماعت کی تنظیم ہے جو ہر وقت حکومت کی غلطیوں پر نکتہ چینی کرنے کے لئے تیار ہوگی۔ یہ افراد بہترین دماغ کے لوگ ہوں گے جو حکومت کو صحیح مشورے دے سکیں گے۔

دوسری شرط افراد مملکت کے لئے ہے کہ وہ مواقع سے فائدہ اٹھاکر اپنے روزمرہ معلومات میں خاطرخواہ اضافہ کریں تاکہ ان کے روبرو زمانہ کے حالات صحیح روشنی میں پیش ہوں۔ فرد کو چاہیئے کہ وہ اپنے ماحول کا جائزہ لے، اور ماحول سے پیدا ہونے والے واقعات پر کافی غور وخوض کرے۔ افراد مملکت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے کاروبار زندگی کو

صت کے ساتھ تحریری شکل میں رکھ چھوڑیں تاکہ مقاصد کی صحیح تصویر نظر آئے۔

لاسکی نے جہاں مملکت پر شرط عائد کی وہیں اس نے افراد کے دوش پر بھی ذمہ داری کا بوجھ رکھا جو اس کے صحیح تفکر کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اگر لاسکی ان دو قیود کو مٹا کر کے اپنی نئی مملکت کے خواب دیکھتا تو ہم سمجھتے کہ اس کے ذہن میں خامی رہ گئی لیکن لاسکی نے یہ بتلایا کہ ان تجاویز کو معاشری کمزوریوں کا قطعی حل سمجھنا ایک خوش کن تفکر ہے۔ انسان کی طرح معاشرہ میں زندگی اور نمو ہے اس لئے سیاست کے ڈھانچہ کو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینا چاہئے۔ بہرحال لاسکی خواہاں ہے کہ اگر کوئی فرد اس نئی مملکت کی مخالفت کرے تو اسے روکنا چاہئے کیونکہ مخالفت کی روک تھام میں کل افراد کی خواہشات کی گونج ہے۔ شکایتیں اور مخالفتیں انقلاب نہیں پیدا کرتیں بشرطیکہ وہ دائمی نہ ہوں اور ان کی بنیاد قوی تر نہ ہو۔ شکایات کا ازالہ بہتر ذرائع سے ہوسکتا ہے۔

یہاں تک ہم نے لاسکی کے تجاویز پر جو مملکت کے اندرونی مسائل سے متعلق تھے، غور کیا۔ مملکت کے خارجی مسائل کس بنیاد پر حل کئے جائیں ایک حل طلب سوال ہے۔ لاسکی نے یہ ثابت کیا کہ قومی مملکت معاشری خرابیاں پوری طرح دُور کرنے سے قاصر ہے۔ ان مملکتوں کے اقتدار اعلیٰ کا تصور خارجی مسائل کے حق میں دشواریاں پیدا کرتا ہے۔ مثلاً ایک قومی مملکت آزاد ہے کہ وہ کوئلہ جتنا چاہے اپنی کانوں سے نکالے لیکن کیا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کوئلہ کے مارکٹ حدود مملکت کے باہر بآسانی فراہم ہوں گے؟ یقین ہے کہ دوسری مملکتیں تحدید عاید کریں گی اور یہیں سے جنگ کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ ان حالات کے تحت لاسکی چاہتا ہے کہ مملکت کے معاشی رجحانات بین اقوامی بنیادوں پر حل کئے جائیں تاکہ مملکتوں کے مابین مفاہمت کا پہلو نکل آئے۔ حصول مقصد کے لئے لاسکی ایک بین اقوامی ادارہ پر زور دیتا ہے لیکن قومی مملکتیں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں آڑے آتی ہیں۔ اس دقت کو دُور کرنے کے لئے لاسکی نے مملکت کے اقتدار اعلیٰ کو بین اقوامی تعلقات میں حد درجہ خطرناک ظاہر کیا ہے اور چاہتا ہے کہ مملکت کی یہ قوت چھین لی جائے۔ (نظریۂ تکثیریت اور وفاقی مملکت کی تجویز سے یہ ممکن ہے) اور مملکتوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ ان کے

مطالبات پُرامن ذرائع سے حل کئے جائیں گے جہاں قوت و اقتدار کا تخیل تک نہ ہوگا۔ اس طرح جنگ کا تصور دُور ہوگا اور وہ ممالک جو اپنے مقاصد بذریعہ جنگ حاصل کرنا چاہیں ان کی پوری توانائیوں سے مخالفت کرنی چاہئے۔ ان توانائیوں کو مرکزیت دینے کے لئے مملکتوں کو وفاقی اساس پر منظم کرنا پڑے گا۔ یہ صحیح ہے کہ مملکت کا اقتدار اعلیٰ اس کی حدود سے باہر نکل آئے گا، اور اس اقتدار کو واپس لینا ایک کار دشوار ہوگا۔ لاسکی کا یہ خیال حقائق سے قریب تر ہے کہ اسی طریقہ سے ایک طرف جنگ کی خون آشامیوں کو ختم کیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف قوموں کے قوموں کے مابین معاشی مساوات کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے۔[1]

وفاق پر ہم نے ابھی بحث کی اور اب تکثیریت پر تنقیدی نظر سے روشنی ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ آیا اس نظریہ میں اتنی قوت ہے کہ وہ زمانہ کی ہَوا کا ساتھ دے۔ واضح رہے کہ تکثیریت کے حامیوں نے جو عملی تجاویز پیش کی ہیں ان کا مقصد کسی طرح ملک میں ترابی کیفیت پیدا کرنا یا جماعتوں کو مملکت کے اثر سے بالکل آزاد کر دینا نہیں ہے۔ میٹ لینڈ نے قانونی اقتدار اعلیٰ کے ساتھ کہیں اپنے شخصیتوں والے نظریہ کو پیش نہیں کیا۔ گیرکے اگرچہ اس بات کا قائل تھا کہ افراد اور انجمنوں کے آزادانہ وجود کو مملکت کے اثر سے آزاد ہونا چاہئے لیکن وہ اس کو بھی تسلیم کرتا تھا کہ جہاں مفاد عامہ کے تحفظ کے لئے قوت کے استعمال کرنے کی ضرورت ہو وہاں مملکت مقتدر اعلیٰ کی حقیقت کی وجہ سے دوسرے معاشی اداروں سے ممتاز ہے کیونکہ صرف مملکت ہی کسی برتر اجتماعی وجود کے تابع نہیں ہے۔ پال بونکر مملکت کو مفاد عامہ اور قومی یکجہتی کا تنہا نمائندہ تصور کرتا ہے اگرچہ کہ وہ دیگر انجمنوں کو مددگار یا مساوی مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے تاہم مملکت سے ان کے تعلقات کے سلسلہ میں ان کو اس طرح مملکت کے تابع بنا دیتا ہے کہ مملکت کا روایتی اقتدار اعلیٰ صاف ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اس کے خیال میں مملکت کا یہ فرض ہے کہ وہ انجمنوں کے دستور کا خاکہ تیار کرے۔ ان کو اپنے مخصوص دائرۂ عمل ہی تک محدود رکھے اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ناجائز طریقوں کے استعمال سے روکے۔ بالفاظ دیگر اس کے نزدیک ایک انجمن کو دوسری انجمن کے خلاف یا خود اپنے اراکین کے خلاف

---

[1] Grammar of Politics, Laski P. 286

کوئی قابل اعتراض طرز عمل اختیار کرنے سے روکنا مملکت ہی کا حق ہے۔ ڈاکٹر فیجس نے مملکت کو انجمنوں کی انجمن قرار دیا ہے اور مختلف انجمنوں میں مطابقت اور ملاپ پیدا کرنے کے کارکن کی حیثیت سے اس کی فوقیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ زیادہ تر ایسی انجمنوں کو منظم کرنے اور انصاف کی حدود سے تجاوز کرنے سے روکنے ہی کے لئے مملکت کو اہمیت دی گئی ہے۔ آرنسٹ بارکر تکثیریت کو حد سے تجاوز ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ کہتا ہے کہ مملکت زندگی کی عام اور ہمہ گیر اسکیم کی حیثیت سے لازمی طور پر اپنے اور دیگر انجمنوں کے تعلقات اراکین انجمن اور خود انجمنوں کے آپس کے تعلقات میں ہم آہنگی اور توازن قائم رکھنے کا حق رکھتی ہے۔ اپنے اور دیگر انجمنوں کے تعلقات میں توازن اس لئے ضروری ہے کہ قانون کے آگے انسانی مساوات باقی رہے اور اراکین کے لئے اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ ان کو انجمنوں کے امکانی تشدد سے بچایا جائے۔

لاسکی نے جو معاشی ادارات کی تجاویز پیش کی ہیں ان کے لحاظ سے بھی مختلف معاشی اکائیوں پر مرکزیت پسند سیاسی قوت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے چنانچہ اس مرکزیت پسندی کا تذکرہ وہ اس طرح کرتا ہے کہ حکومت سب سے اہم ادارہ ہے جس کی اہمیت سے سوائے چند مذہبی لوگوں کے شاید ہی کوئی اور انکار کرے۔ علاوہ ازیں مملکت اور دیگر اداروں کی تفریق کو بھی مانتا ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک مملکت ایک ایسی انجمن ہے جس کی رکنیت لازمی ہے۔ اس کو بھی مانتا ہے کہ مشترکہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دوسری انجمنوں پر ان کی ضروریات کی حد تک اس کا قبضہ ضروری ہے اور پھر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس طرح کا کام انجام دینا یقیناً تمام دوسرے امور سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس توجیہ کا مطلب یہ برآمد ہوا کہ انسانی مقاصد کی تقسیم کی جائے، کچھ اداروں کے حوالہ کئے جائیں اور چند مملکت کے۔ لاسکی کہتا ہے کہ اداروں کے قیام کا مقصد مفاد عامہ کا حصول ہے اور اس کے لئے "اقتدار اعلیٰ کا محدود کرنا جو سیاسی فلسفہ کا بنیادی پہلو ہے" ضروری ہوگا۔ ان قیود کے عاید کرنے میں لاسکی نے ایک اور بحث چھیڑ دی کہ ایک سے زاید اداروں کا قیام اولین ہے۔ اس کے ساتھ ہی

Grammar of Politics, Laski P. 63 .۴

وہ فرد کے ارادوں کی دو طرح تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جو اس کی ذات سے متعلق ہوں اور دوسرے وہ جو اس کے جماعتی رکن ہونے پر پیدا ہوں جن کے ذریعہ وہ اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے۔ فرد کے مقاصد زندگی کئی ہوں گے لیکن سب کے لئے ایک ادارہ کی ضرورت لاسکی نے نہیں پیش کی۔ ایک مقصد کے لئے ایک ادارہ ہوگا جو دوسرے مقصد کی تکمیل سے قاصر ہوگا۔ اس طرح ملک میں کئی ادارے موجود ہوں گے جو افراد کی خواہشات کی تکمیل کریں گے۔ لاسکی کی اس دلیل سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فرد پر مختلف النوع اثرات کام کرتے ہیں اور ان سے مختلف ارادے تشکیل پاتے ہیں، جن کا اظہار بہ یک وقت ممکن نہیں جیسا کہ روسو نے اعتراف کیا ہے[۵]۔ اس لئے ایک سے زاید اداروں کا وجود افراد کی معاشری خدمات انجام دینے کے لئے ناگزیر ہے۔

نظریۂ تکثیریت پر تنقید

اس بیان سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ایک طرف جہاں تکثیری مفکرین محض نظری طور پر مملکت کے مقتدر اعلیٰ کے منکر ہیں تو دوسری طرف جب مختلف ادارات کی تنظیم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو ان کے معیار کے تعین اصول وضوابط کی ترتیب ان کے جائز حدود کی نگرانی اور ان کی حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کا کام مملکت ہی کے سپرد کردیتے ہیں۔ جس طرح لاسکی کے خیال کے مطابق یہ صحیح ہے کہ افراد کو مختلف ادارات کے سامنے اپنی مساویانہ اطاعت گذاری کا اظہار کرنا پڑتا ہے، اس لئے مملکت ان کو بالکلیہ اپنا فرمانبردار نہیں بناسکتی۔ اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ افراد کو بسا اوقات اس اطاعت گذاری کے سلسلے میں ایک دوسرے سے متصادم ہوجانا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف ادارات کی کشمکش شروع ہوجاتی ہے اس لئے ایک ایسے منظم اور با اقتدار ادارہ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے جو ان کے آپس کے تصادم کو روکے، ان میں ہم آہنگی پیدا کرے اور بعض مشترکہ مفاد کے امور بھی انجام دے۔ اس قدر اہم ادارہ کی ناگزیر ضرورت کو تسلیم کرنے سے کسی طرح دیگر معاشرتی ادارات کی قدر وقیمت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح مملکت کا امتیازی حیثیت سے اس کے مخصوص اور مفوضہ اختیارات تسلیم کرلینا درحقیقت

۵۔ Grammer of Politics, Laski P. 67

مطلق العنانی اور مرکزیت کی اشاعت کرنا مقصود نہیں ہے۔ مملکت اور اداروں کی طرح ایک ادارہ ہے جس کو کل جماعتوں نے آپس کے نزاعی مسائل کے حل کے لئے بہ حیثیت ایک رکھوال مقرر کر رکھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لاسکی نے مملکت کی رکنیت ہر فرد پر لازمی گردانی ہے[1]۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مملکت کو دیگر اداروں پر فوقیت و برتری حاصل ہوگی اداروں کی جدوجہد کو آگے بڑھانے کا فرض مملکت کے دوش پر رکھا گیا ہے۔ یہاں پر یہ اعتراض اٹھایا جائے گا کہ لاسکی نے مملکت کی رکنیت کو لازمی قرار دے کر دبی زبان سے اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیا لیکن اس امر کو ذہن نشین رکھا جائے کہ جہاں لاسکی نے مملکت کی رکنیت پر زور دیا وہیں اس کے فرائض بھی گنوا دئیے۔ جب اداروں کی جدوجہد کو مملکت منظم کرے گی تو اس تنظیم سے استفادہ کرتے ہوئے فرد اپنی جماعت سے بھی وابستہ رہے گا۔ اس طرح مملکت کسی حالت بھی اپنے اقتدار اعلیٰ کو نہیں منوا سکتی۔

تکثیریین اس امر میں تو پوری طرح متفق ہیں کہ مملکت کو اس بڑے درجہ سے گرا کر ایک محدود ادارہ بنا دیا جائے اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو چھین کر دوسرے اداروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن جو تجاویز انہوں نے پیش کی ہیں ان میں اکثر اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس قسم کا اختلاف فروعی ہے، اساسی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ واحدیت کے حامی اس نظریۂ تکثیریت کو ایک ناممکل اور غیر معقول نظریہ قرار دیتے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ تکثیری نظریہ محض ایک غیر مفید نظریہ ہے اور واحدی اقتدار اعلیٰ پر اس کی تنقید بالکل سطحی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نظریہ نے سیاسی خیالات میں اہم تغیر پیدا کیا۔ اس نظریہ کے حامی مملکت کو اخلاقی پابندیوں سے آزاد دیکھنا نہیں چاہتے۔ اور خصوصاً لاسکی نے یہ ثابت کر دکھایا کہ مملکت کا کوئی قانونی اقتدار اعلیٰ نہیں۔ جب مملکت بغیر اداروں کی مدد کے قانون سازی نہیں کر سکتی تو اسے قانونی اقتدار اعلیٰ کیسے حاصل ہوگا؟ لاسکی کے ہاں قانون، معاشرتی رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سیاسی اور معاشرتی رجحانات کی صحیح تصویر فرد اور ان کی جماعتیں ہیں۔

---

[1] Grammar of Politics, Laski P 70

اس حیثیت سے نظریۂ تکثیریت مملکتی نصب العین کے خلاف ایک معقول ردعمل کو ظاہر کرتا ہے، پھر اس
مخالفت کرتا ہے کہ مملکت تمام اخلاقی قیود سے آزاد ہے۔ نظریۂ تکثیریت سب سے پہلے اقتدار اعلیٰ
تنگ اور محدود قانونی تخیل کے نقائص کو واضح اور ایک نہایت ہی وسیع سیاسی تخیل کی طرف
مبذول کرواتا ہے۔ تکثیری مفکرین کا کہنا یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ کو صرف قانونی حدود تک
محدود نہیں ہونا چاہئے۔ اگر معاشری مقاصد کی گوناگونیت کا وہ حقیقی مظہر ہے تو اس کے
اور ذرائع بھی بہت وسیع اور حیات افروز ہونے چاہئیں۔ بالفاظ دیگر اس کا فرض صرف
معاشری جماعت کے سیاسی مفاد ہی کی نیابت کرنا نہیں ہے بلکہ اس میں معاشی، تمدنی، اخلاقی
اقتصادی اور دیگر اُمور مملکت بھی شامل ہیں۔ تکثیری مفکرین اس پر زور دیتے ہیں کہ مملکت
اور بہت سی انجمنوں میں سے ایک ہے، اور چونکہ اس کا مقصد محدود اور مخصوص ہے اس
اس کو اقتدار اعلیٰ نہ تو حاصل ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ کسی ایک انجمن کا اجارہ نہیں
بلکہ اس کا انطباق پورے معاشرہ پر ہوتا ہے۔ اس منزل پر لاسکی صداقت وحقانیت سے قریب تر
لاسکی نے مملکت کو عقل اور عملیت کی کسوٹی پر رکھا اور اپنے کو افلاطونی سیاسی گلگشت سے محفوظ
رکھا۔ جہاں اس نے مملکت کی کمزوریاں اجاگر کیں وہیں افراد کی کم عقلیوں
آرام طلبی کو بھی بتلایا ہے۔

مملکت کا وجود لاسکی کی نظروں میں یہی ہے کہ مملکت دراصل کوئی مقصد یا غایت نہیں
بلکہ مقصد زندگی کو پانے کا ایک ذریعہ ہے جو صرف خوش حالی کا راستہ دکھلاتا ہے۔ مملکت
ستائش اسی وقت کی جاسکتی ہے جبکہ اس کے نظم نامہ میں شہریوں کی فلاح کے سامان نظر آئیں
یقیناً کل شہری مملکت کے تابع ہیں جس سے انکار کرنا خود اپنے وجود سے انکار کرنے کے مترادف
ہوگا۔ لیکن یہ اطاعت خود افراد کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہے نہ کہ مملکت
اس طرح افراد کا مملکت کی رکنیت قبول کرنا مملکت کے مقاصد کی سربراہی کے لئے نہیں بلکہ خود
افراد کے مقاصد حاصل کرنے کا ایک درمیانی زینہ ہے۔ افراد کی خوش حالی مملکت کی خوش حالی
اور افراد کی زبون حالی مملکت کی خرابی کا موجب ہوگی۔ مملکت فرد کو نظر انداز نہیں کرسکتی اور نہ فرد

ملت کچھ بھی نہیں ۔ بہر حال ہر مملکت کی بقا ادا فراد مملکت کے کردار پر منحصر ہے اور فرد جتھہ بنانے والا انسان ہے۔ مملکت صرف اس کے کردار کو منعکس کرے گی۔ اس طرح مملکت خاندانوں کا ایک بڑا خاندان ہے جس کا فرض ہے کہ وہ اپنے افراد خاندان کی مرفہ الحالی کی ضمانت دے۔ لاسکی کا ادعا ہے کہ اس مملکت کو مملکت کہیں گے جس نے اپنے نظام حکومت کو افراد کی خواہشات کی بنا پر تشکیل دیا ہو، کیونکہ حکومت نے افراد ہی سے یہ اختیارات حاصل کئے ہیں اور ان ہی کے سامنے وہ جواب دہ ہوگی۔ مملکت دراصل کلیسا اور انجمن مزدوران کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ وہ تمام افراد جو حدود مملکت میں سکونت پذیر ہوں مملکت کے رکن ہوں گے۔ اس طرح ہم شعوری طور پر محسوس کر رہے ہیں کہ لاسکی اپنے نظریۂ تکثیریت کو وسیع کرتا چلا جاتا ہے اور ایک نئے تفکر کا آغاز کرتا ہے جس میں مملکت کو بہت کم اہمیت حاصل ہے اور متعدد مملکت جماعتیں Groups ہیں۔ لاسکی کا ہرگز یہ ادعا نہیں کہ مملکت ایک جسد بے جان ہے۔ اس نے مملکت کو عزت ضرور دی ہے لیکن اصل عزت کے رکھوال افراد یا ان کی جماعتوں کو قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اگر مملکت اپنے اختیارات کی حفاظت چاہتی ہے تو اسکے پاس کوئی خاص قوت ضرور ہونی چاہئے لیکن شاید یہ قوت جو خیر محض کی بقاد اور نمو کے لئے مملکت کو دی گئی ہے خود مملکت کے ہاتھ سے افراد کے حق میں ایک تازیانۂ ظلم نہ بن جائے اس لئے منکسر المزاج اور معمولی انسان ہی حکومت کی مشنری چلانے والوں کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے کہ آیا وہ اپنے مفوضہ امور کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

نظریۂ اقتدار اعلیٰ اور اس کے فطری ردعمل یعنے نظریۂ تکثیریت پر مختلف زاویۂ نگاہ سے بحث کرنے کے بعد ہماری اس طویل بحث کا ملخص یہ ہے کہ سیاسی مفکرین نے اپنے اپنے ماحول کے تحت متعدد مملکت کو تقویت پہنچائی۔ استقرائی مفکرین کا جن میں آسٹن پیش پیش ہے یہ استدلال رہا ہے کہ قانونی نظریہ کی رو سے مقتدر اعلیٰ کو ایسی قوت عطا ہوتی ہے جو اخلاقی، معاشری، ورعقلی پابندیوں سے آزاد ہو۔ ان کا یہ ادعا تھا کہ مملکت اس نوعیت کے کسی ادارہ کے سامنے ذمہ دار نہیں ہوسکتی۔ اس لئے وہ ایک معینہ رقبہ میں دیگر تمام

اداروں اور جماعتوں سے قانونی طور پر اعلیٰ و برتر ہے۔ ان کے اس استدلال میں، ہم۔ عصر اور مفکرین کے ساتھ ساتھ لاسکی کے دلائل بھی پیش کئے جس کی روشنی میں اس نظریہ کی کمزوری اور بے عملی ظاہر ہوگئی۔ فی الحقیقت استقرائی مفکرین کی کوششوں کی داد دینی پڑے گی کہ انہوں نے امکان بھر مملکت کے اقتدار کو اچھالا لیکن "فوارہ چوں بلند شود سرنگوں شود" کا مصداق بن کر رہ گئے۔ زمانہ نے پلٹا کھایا اور نظریۂ تکثیریت نے عقلی دلائل کی قوت کے ساتھ مقتدر مملکت کی کمزور رگ پر ہاتھ ڈالا۔ لاسکی نے یہ ثابت کرتے ہوئے کہ فرد فطرتاً جہاں مملکت کے آگے جواب دہ ہے وہیں جماعت کے روبرو بھی مساویانہ طور پر ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔ واحدی اور استقرائی مفکرین کی عمر بھر کی کمائی پر پانی پھیر دیا۔ حق تو یہ ہے کہ اگر مقتدر مملکت کے نظریہ میں صداقت ہوتی تو آج دنیا تکثیریت کو شمع ہدایت نہ بناتی۔ لاسکی نے صاف طور سے بتلا دیا کہ مملکت دیگر جماعتوں کی طرح ایک جماعت ہے جسے کسی وقت بھی اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں ہوا۔ اس مملکت کے سد باب کے لئے نظریۂ تکثیریت وجود میں آیا۔ ایسی مملکت کی جتنی بھی مخالفت کی جائے کم ہے جو افراد کو ان کی خواہش کے خلاف قلم اٹھانے پر مجبور کرے۔ ایسی مملکت کی بیخ و بن اکھیڑنا فطرت انسانی کا خاصہ ہے کیونکہ زمانۂ حاضرہ کی "مملکت اس امر کی مجاز ہے کہ انسانوں کے بے زبان گلہ کو میکانی طور پر اپنی قوت و اقتدار سے جدھر چاہے ہانکے۔ اگر مملکت افراد سے قتل و غارت کروانا چاہتی ہے تو ان کو کرنا ہوگا، اور اگر وہ مذہب و اخلاق کے سارے ضابطوں کو توڑنے کی دعوت دے تو اس میں بھی کوئی عذر نہ ہونا چاہئے۔ مملکت کی قوت و جبروت کے فلک نما طلسم کو بے بس انسانیت آج غم زدہ آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور چوں نہیں کر سکتی"[1]۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہو چکا کہ مقتدر مملکت زمانۂ حاضرہ میں بھی اتنی ہی بھیانک اور روح فرسا ہے جیسی کہ تویں چودھویں کے زمانہ میں تھی۔ ان ہی مملکتوں کی فلک بوس عمارتوں کو ڈھانے کے لئے جن میں غریب کی محنت و مشقت سے امارت کے گلستاں تیار ہو رہے ہیں نظریۂ تکثیریت،

---

[1]۔

پیش ہوا جو برابر مملکت کے اقتدار اعلیٰ پر ضرب کاری لگا رہا ہے۔ ایسی مملکت سے فایدہ ہی کیا جس کے فرائض کا تصور غیر ذمہ داری کے چکاچوند لباس میں لپٹا ہو، جو اپنی خواہش کو ظاہر کرتا ہو اور کسی کے ارادہ کا تابع نہ ہو۔"[1] جب مملکتیں اپنے اقتدار کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی ہیں تو اندوہناک مصائب پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا جیسے جیسے ترقی کرتی جائے گی ویسے ویسے مملکتوں کے تعلقات میں وسعت پیدا ہوگی اور اس وسعت کی وجہ سے مملکتوں کا ایک دوسرے سے ٹکرانا ایک امر ناگزیر ہے جس کا بدیہی نتیجہ جنگ کی صورت میں نمودار ہوگا، اور جنگ کی ہولناکیوں سے دُور رہنا اقتدار اعلیٰ کو سرے سے ختم کرنے میں مضمر ہے۔ عوام کوشش میں ہیں کہ منقدر مملکت سے نجات حاصل کریں۔ بدیں وجہ لاسکی کا نظریۂ تکثیریت مقبولیت تامہ حاصل کر رہا ہے۔ عوام اس پر عمل پیرا ہونے کے متمنی ہیں، کیونکہ اول تو تکثیریت معاشری رجحانات کے عین مطابق ہے اور دوسرے آسٹن کے نظریہ میں فرد اپنی بھلائی کے سامان نہیں پاتا۔ زمانہ کی ہوا بدلی ہوئی ہے اور ہم ان پرانے تخیلات کو جن میں افادیت کا بطلان ہوگا نظر انداز کریں گے۔

---

[1] Grammar of Politics, Laski P. 662

منگولی فتوحات اور ایرانی تہذیب پر اس کا اثر

جناب ابونصر محمد خالدی صاحب ام اے (عثمانیہ)

چنگیز خاں کے ابتدائی مشیر زیادہ تر مسلمان تاجر تھے اور انہیں نے اسلامی دنیا کے خلا
تاتاری مہموں میں عملی مدد کی تھی چنگیز خاں کی یہ مخالفت سلطان محمد خوارزم شاہ کی کارستانیوں کی وجہ
پیدا ہوئی تھی۔ ہوا یہ کہ آخر الذکر کے ایک عامل نے اُرتاز واقع ترکستان کے سرحدی شہر پر
منگولیا سے آنے والے ایک کاروان کو لوٹ لیا اور کاروان کے ساتھ جو ساڑھے چار سو مسلمان تا
آرہے تھے ان سب کو تہ تیغ کردیا۔ یہ ۱۲۱۸ء عیسوی کا واقعہ ہے۔ منگولوں نے ترکستان اور خوارز
۱۲۲۱-۱۲۲۲ء عیسوی میں فتح کر لیا لیکن مغربی ایشیا میں انہیں متعدد مرتبہ فوجی مہمیں سر کرنی پڑیں
اور ۱۲۵۸ء عیسوی تک وہ بغداد فتح نہ کر سکے۔ اس کے بعد منگولی سلطنت وجود میں آئی اس
علاوہ ایران کے الجزیرہ اور ایشیائے کوچک بھی شامل تھے۔ ساتھ ساتھ اسماعیلیوں ...
فصیل بند قلعے بھی منہدم کر دیئے اور نئے قلعے بنانے کی اجازت نہیں دی جنوبی ایران ...
مقامی حکمران بغیر لڑے بھڑے منگولوں کے مطیع ہو گئے اور چودھویں صدی عیسوی ...
جا کر کہیں ان کے اختیارات سلب کر لیے گئے۔ فارس اور کرمان کو منگولوں نے تباہ نہیں ک...
اس لیے یہاں کے بڑے بڑے شہروں خصوصاً شیراز میں حالات حسب سابق برقرار ر...
...سی طرح پیش نظر دور میں فارس کو ایرانی تہذیب میں وہ اہمیت حاصل ہونی شروع ہوئی۔

ے پہلے کبھی اس کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ سلغریوں اور مظفریوں کے شاہی خاندان فارسی شاعری کے
ے سرپرست تھے۔ سلغری منگولی فتح کے بعد بھی بچ گئے تھے۔ اور مظفری منگولی فتح کے زوال کے
ت صدی بعد گذرے ہیں۔ سلغریوں کے ساتھ سعدی (تیرھویں صدی عیسوی) اور
فریوں کے ساتھ حافظ (چودھویں صدی عیسوی) کا نام وابستہ ہے۔ ان شاعروں کا کلام
وصاً حافظ کی غزلیں بعد کے دوروں میں بھی ان تمام ملکوں میں پڑھی اور مطالعہ کی جاتی
ی ہیں جہاں اسلامی تہذیب پہنچ چکی تھی۔ بل کہ آج تک حافظ کے پھولوں کی خوش بوئیں کوئی
ں نہیں آیا ہے۔ شیراز نے اسلامی دنیا کے بہت بڑے ہیئت داں قطب الدین (متوفی
۱۳۱ء عیسوی) اور قوام الدین (متوفی ۱۴۳۹ء عیسوی) جیسا عظیم المرتبت تعمیرکار پیدا کیا۔
ب الدین نے علم ہیئت میں تحقیقات کرنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کرنے کی کوشش کی اور
ام الدین نے مشہد میں مسجد گوہرشاہ تعمیر کی۔ اس مسجد کے متعلق بعض مورخوں کا خیال ہے کہ
رانی فن تعمیر کی یادگاروں میں یہ مسجد تمام عمارتوں پر گوئے سبقت لے گئی ہے۔

بہرطور یہ خیال کرنا سخت غلطی ہوگی کہ تمدنی و تہذیبی کوشش صرف ان ہی علاقوں میں جاری
ہی جو منگولی فوجوں کی تاخت و تاراج سے بچ رہے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مہذب ملک پر ایک
ہی وحشی قوم نے قبضہ کیا تھا جو ابھی تک انسانی قربانی پر اعتقاد رکھتی تھی۔ جب کسی شہر پر
بضہ کیا جاتا تو سوائے کاریگروں کے تمام شہری آبادی بلا استثناء تہ تیغ کر دی جاتی تھی۔
ری گروں کو اس لیے باقی رکھا جاتا تھا کہ فاتحوں کو ان کی ضرورت تھی۔ جو لوگ اس
فناک تباہی سے بچ جاتے تھے ان کا یہ خیال کرنا ایک قدرتی بات تھی کہ کم از کم ایک ہزار
سال تک ملک کا دوبارہ ابھرنا ناممکن ہے۔ اس عہد کے مورخوں کی رائیوں سے متاثر ہو کر
مغربی علماء بھی یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ ایشیا اور مشرقی یورپ کی تہذیب پر منگولوں نے اس سے
یادہ مہلک ضرب لگائی تھی جیسی کہ مثلاً قوموں کی اس عظیم الشان نقل پذیری نے جنوبی یورپ کی
مذیب پر لگائی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ مان بھی لیا جائے کہ فاتحوں نے مفتوحہ ملکوں میں
ن اختیار نہیں کیا تب بھی منگولی حملہ کے نتائج اتنے خطرناک نہیں رہے جتنے کہ عام طور پر فرض کیے

جاتے ہیں۔ منگولوں کی ایک فوج ہوتی تھی جس کے سپاہیوں کی تعداد کبھی بے انتہا نہیں ہوتی ۱۱ور ام
فوج کے علاوہ ان کے ساتھ نہایت تہذیب یافتہ، اور علم وفضل سے آراستہ مشیروں کی جماعت
ضرور ہوتی تھی، اور یہی مشیر تھے جن کی مدد سے انہوں نے نو مفتوحہ علاقوں میں وہ باقاعدہ منا
شہری اور فوجی حکومت قایم کی جس کی داغ بیل پہلے ہی سے چنگیز خاں کے زمانے میں پڑ چکی تھ
منگولوں نے جن ملکوں کو فتح کیا یعنے چین، اسلامی دنیا اور روس۔ وہاں تیرھویں صدی
عیسوی کے بعد سیاسی استقلال پہلے سے زیادہ پائیدار نظر آتا ہے۔ بلاشبہ خان مقامی ادب
بے اعتنائی برتتے تھے اور مسلمان ہونے سے پہلے اسلامی دینیات سے بھی ان کو قدرتاً کوئی لگا
نہیں تھا لیکن خود اپنے مادی فوائد کے مد نظر انہوں نے نہ صرف تمدنی زندگی کو از سر نو تشکیل
دینے میں مدد دی بلکہ صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے علاوہ ان علوم کی سرپرستی بھی کی جن کو و
عملی حیثیت سے مفید خیال کرتے تھے۔ ان علوم میں طب اور ریاضی بھی شامل تھے کیوں کہ ریاضی
وجہ سے ٹھیک ٹھیک حساب کتاب رکھنے میں مدد ملتی تھی اور نجوم پر اعتقاد رکھنے کی وجہ سے
ان کو ہیئت سے بھی دلچسپی تھی۔ چنگیز خاں کے پوتے اور فاتح ایران ہلاکو نے نصیر الدین طو
کے لیئے شہر مرج واقع آذربائیجان میں ایک رصدگاہ تعمیر کرائی جس میں اس وقت کے
بہترین آلات جمع کیئے گئے تھے۔ منگولوں کی وحشت وبربریت کے باوجود ان کے زمانۂ حکومت م
نہ تو زرعی نظام کی بجائے اشیا کا تبادلہ ہونے لگا۔ جب کہ یورپ میں جرمن فتوحات ک
وجہ سے ہوا تھا اور نہ شہری زندگی کی بجائے پھر سے خانہ بدوشانہ طرز زندگی پیدا ہ
باج جنس کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔ زیادہ تر روٹی اور کپڑے کی صورت میں لیکن
یہ صورت حال چنگیز خاں کی موت کے صرف چند سال بعد تک ہی رہی۔

اس کے پوتے زری نظام سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ سونے کے زری نظام کی بجا
چاندی کے سکوں کا دوبارہ رواج ہوا لیکن چاندی کی قدر مقرر کر دی گئی تھی۔ اور رفتہ رفتہ
تانبے کے درہموں کا مسکوک ہونا بند ہو گیا۔ نہ صرف برباد شدہ شہر دوبارہ تعمیر کیئے گئے
بلکہ جدید شہر بھی بسائے گئے۔ جیسے مثلاً تبریز اور طہران کے درمیان سلطانیہ کا نیا شہر

بسایا گیا۔ منگولوں ہی کے زمانہ میں آذربائیجان کا دارالسلطنت تبریز ایک بہت بڑا شہر بن گیا جہاں کے باشندے متمول اور خوش حال تھے۔ حتیٰ کہ ایران کے تمام پُرانے شہروں کے مقابلے میں اس کا شمار درجہ اوّل کے شہروں میں ہونے لگا۔ چودھویں صدی عیسوی میں خانوں کے زیر سرپرستی شان دار عمارتیں تیار ہوئیں۔ اس سے ایرانی فن تعمیر کی مزید ترقی کا ثبوت ملتا ہے۔ چنان چہ سلطانیہ میں الجیت (سنہ ۱۳۰۴ء تا سنہ ۱۳۱۶ء) کی مسجدیں اور طہران کے مشرق میں بمقام ورامن اس کے بیٹے ابوسعید کی مسجدیں اس پر شاہد ہیں۔

منگولی سلطنت میں مشرق قریب اور مشرق بعید کے مہذب ممالک ایک ہی قوم اور ایک ہی خاندان کے زیر سیادت متحد ہو گئے تھے۔ اس چیز کا تجارت اور تہذیبی قدروں کے تبادلہ میں ممد و معاون ہونا ناگزیر تھا۔ مغربی ایشیا اور چین میں کاروانی تجارت کو اس درجہ ترقی ہوئی کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی نہیں ہوئی۔ ان کاروانی رستوں سے یورپی تاجر بھی فایدہ اُٹھاتے تھے جن میں اہل وینس کے پولو سب سے پیش پیش تھے۔ سلطنت کے بہت سے ٹکڑے ہو جانے کے بعد بھی ایران اور چین کی منگولی سلطنتوں میں جہاں چنگیز خاندان کی ایک ہی شاخ کے حکمران حکومت کرتے تھے، انتہائی قریبی تعلقات قایم رہے۔ علاوہ ازیں منگولی حکمرانوں کی وجہ سے اہل ایران اور اہل یورپ میں قریبی تعلقات قایم کرنے میں بڑی مدد ملی، کیوں کہ مصر کے مسلمانوں سے دشمنی رکھنے میں دونوں مشترک تھے۔ چنان چہ انہیں تعلقات کی بنا پر یورپی تاجروں اور مبلغوں نے نہ صرف وسط ایشیا کے کاروانی رستوں سے بلکہ ہندوستان و چین میں سفر کرنے کے لیے ایرانی بندرگاہوں سے ہوتے ہوئے بحری رستوں سے بھی فایدہ اُٹھایا۔ اس واقعہ کی توجیہہ مصری حکمرانوں سے اہل ایران و اہل یورپ کی اسی مشترکہ دشمنی سے ہوتی ہے جس کا ذکر ہوا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں اہل یورپ کی ترقی انہیں تجارتی تعلقات کی رہین منت ہے گو میدان تہذیب و تمدن میں اس وقت بھی اسلامی دنیا خصوصاً ایرانی مسلمانوں کو تفوق حاصل تھا۔ اپنی طویل تاریخ میں اگر ایرانیوں نے کبھی دنیا کی تہذیبی قیادت کی ہے تو وہ یہی زمانہ ہے جب کہ ان کے ملک پر منگولوں کی حکومت تھی۔ لیکن بہت سے عالم آج تک یہی خیال کرتے رہتے ہیں کہ

یہ دور وحشیوں کے ہاتھوں تہذیب و تمدن کی بربادی کا زمانہ ہے۔

اس زمانے کے یورپی سیاح اپنے مسلمان پیشروؤں اور ہم عصر مسلمانوں کی معلومات کے اتنے ہی دست نگر تھے جتنا کہ آج کل مسلمان اہل یورپ کے دست نگر ہیں۔ مارکوپولو ان ملکوں کے حالات بیان کرتے ہوئے جن کی اس نے بذات خود سیاحت کی تھی، بہت سے جغرافیائی ناموں کو فارسی شکل ہی میں استعمال کرتا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں چینی ہئیت داں ایران میں نظر آنے لگے تھے لیکن خود چین میں ایرانی ہئیت دانوں کی کتابیں بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھیں جہاں مقامی طور پر ہئیت کا مطالعہ پورے کا پورا ایرانیوں کے زیر اثر تھا۔ یہ اثر چودھویں صدی عیسوی میں منگولوں کا تسلط ختم ہو جانے کے بعد بھی باقی رہا، بلکہ سترھویں صدی عیسوی میں اُس وقت جاری رہا جب کہ مغربی یورپ کے یسوعی فرقہ کے پادریوں نے اس کو زائل نہیں کیا۔ چودھویں صدی عیسوی تک بھی بازنطیہ میں فارسی زبان میں لکھے ہوئے ہئیت کے رسالے یونانی زبان میں ترجمہ کیئے جاتے تھے۔ ایران کے ایک منگولی حکمران کی سرپرستی میں ایک زبردست تالیف کی تجویز ہوئی۔ اور ایک حد تک یہ تجویز عمل میں بھی آئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ چینیوں سے لے کر فرنگیوں (یا مغربی یورپ) تک ان تمام قوموں کی کل تاریخی روایتوں کو جو منگولی سلطنت کا حصہ تھیں یا منگولوں سے تعلق رکھتی تھیں، ایک ہی کتاب میں بطور مجموعۂ قوانین جمع کیا جائے۔ اس کام کی تکمیل ایک یہودی نومسلم رشید الدین کے تفویض ہوئی۔ اس کے رفقا میں منگولی روایتوں کا ایک ناقد، دو چینی عالم، کاشغر کا ایک بدھ مت کا بھکشو، چند ایرانی عالم اور غالباً ایک فرنگی راہب شامل تھے۔ رشید الدین نے قصداً اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہر قوم کی تاریخی روایتوں کو اسی شکل میں پیش کیا جائے جس میں مختلف قوموں کے نمایندوں نے ان کو پیش کیا تھا۔ اسی لیئے اس نے فراہم شدہ مواد میں اپنی طرف سے نہ کچھ اضافہ کیا اور نہ ان روایتوں کی صحت و عدم صحت کو جانچنے کی کوشش کی۔ اس وجہ سے رشید الدین کی کتاب موجودہ معنوں میں کوئی تحقیقی تاریخی کتاب نہیں ہے۔ لیکن طریق کار کی جامعیت کی بنا پر اس کو دنیا کے ادب میں ایک بالکل بے مثالی درجہ حاصل ہے۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد آج تک ایسی کوشش نہیں کی گئی کہ ایک کتاب میں قدیم دنیا کی

تمام مہذب قوموں کے نمایندوں کی مدد سے عمومی تاریخ کی روایتوں کو جمع کیا جائے۔ انیسویں صدی عیسوی میں بھی یورپی علما تاریخ کے صرف اس حصے کو عمومی تاریخ کہتے تھے جس میں مغربی یورپ سے بحث کی جاتی تھی۔ جیسا کہ رشید الدین کے ایک مسلمان رفیق کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں بھی ایران میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ عمومی تاریخ ایک ناپید اکنار سمندر ہے۔ اور عربی و ایرانی تاریخ کی حیثیت اس سمندر میں گرنے والے محض ایک دریا کی سی ہے۔

اگرچہ دوسرے ملکوں پر علوم و فنون اور ادب کے سلسلے میں ایرانی اثرات صرف ایران کی سیاسی سرحدوں ہی تک محدود نہیں تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑی حد تک واقعہ ایسا ہی تھا۔ دریائے والگا اور آمو دریا کے کنارے بسنے والوں میں مدت دراز سے قریبی تعلقات موجود تھے اور جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں انہیں تعلقات کی وجہ سے وادئ والگا کے بلغروں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن یہ واقعہ صرف منگولوں کے زمانہ میں چنگیز خاں کے بڑے بیٹے جوجی کے جانشینوں کے عہد میں پیش آیا کہ یہ دونوں علاقے ایک ہی سلطنت کا جزو بن گئے۔ اس واقعہ کا اثر والگا کے بلغروں کے قدیم پائے تخت "بڑے بلغر" اور منگولوں کے بنائے ہوئے جدید پائے تخت سرائے اور دونوں کی زندگی پر پڑنا ناگزیر تھا۔ حال ہی میں ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ "طلائی گروہ" میں ترکی زبان میں شعری ادب موجود تھا، یہ ادب فارسی کے زیر اثر ترقی پایا تھا۔

ترکستان کے ترک قبیلوں میں اسلام کی اشاعت دسویں صدی عیسوی ہی میں شروع ہو چکی تھی۔ سو سال بعد کاشغر کے ایک خان کے لیے ترکی میں پہلی اسلامی کتاب لکھی گئی۔ یہ ایک اخلاقی نظم تھی جس میں حکمرانوں، وزیروں اور امیروں وغیرہ کے فرائض نظم کیے گئے تھے۔ نصرت قدیم زمانہ میں بلکہ قرون وسطیٰ میں بھی اس طرح کا ادب تمام قوموں میں بہت مقبول تھا۔ ان کتابوں کی عام صورت یہ ہوتی تھی کہ ان میں باپ اپنے بیٹے کے لیے ہدایتیں لکھ دیتا تھا۔ گیارھویں صدی عیسوی کے فارسی ادب میں قابوس نامہ اس قسم کی کتاب ہے جس میں بحیرۂ خزر کے ایک حکمران نے اپنے بیٹے کو بہت سی اخلاقی نصیحتیں کی ہیں۔ یہ کتاب بہت مشہور ہوئی اور بعد میں ترکی زبان میں بھی منتقل کی گئی۔ ایران اور دوسرے ملکوں میں جہاں کا ادبی اولتیا اکم و بیش

بیرونی امداد کے بغیر ہوا تھا، اس قسم کی کتابیں زمانۂ حال کے قاریوں کے لیئے بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ کیوں کہ ان میں نصیحتوں کے ساتھ ساتھ بطور وضاحت تاریخی واقعات اور حکایتیں وغیرہ نقل کی جاتی ہیں۔ یا ایسی مثالیں دی جاتی ہیں جو روزمرہ زندگی میں پیش آتی رہتی تھیں۔ ترکی کتابوں میں ہم کو اس قسم کی دلچسپی نہیں ہوتی کیوں کہ ان میں سوائے روکھی پھیکی نصیحتوں کے اور کچھ نہیں ہوتا، اور نہ ان میں اہم عصر زندگی کے واقعات کا کوئی ذکر ملتا ہے۔ ان کتابوں میں انصاف کو حکمراں اور مسرت کو وزیر وغیرہ بنا کر پر آور دتمثیلوں کے پیرائے میں بہ مذاقی سے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کو دیکھنے سے ایک یورپی قاری کو پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھی ہوئی جرمن کتاب تھے کُرڈیانک کا خیال آتا ہے۔ اسلام لانے سے قبل بھی ترکی قوموں میں تحریری ادب موجود تھا لیکن نئے مذہب اور فارسی ادب کا اثر اس قدر قوی تھا کہ اسلام اختیار کرنے کے بعد ترکوں نے گویا اپنے زمانۂ قبل اسلام کی یاد بھی بھُلا دی۔

گیارھویں صدی عیسوی کی یہ نظم باوجود خامیوں کے کچھ نہ کچھ مقبول ضرور ہوئی۔ اس نظم کے چند اشعار چودھویں صدی عیسوی کے ایک گل دان (جو دریائے ارال کے دہانہ کے قریب بمقام سراچیک دریافت ہوا تھا) پر لکھے ہوئے ملے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر کی تقلید نہیں کی گئی۔ بارھویں صدی عیسوی کے بعد سے ترکوں میں مذہبی احساس قوی کرنے اور ان کو مذہبی فرائض کا پابند کرنے کے لیئے اسلامی مبلغوں نے ترکی میں بھی مذہبی کتابیں لکھنی شروع کیں۔ یہ کتابیں نظم و نثر دونوں میں ہوتی تھیں۔ اس قسم کی کتابوں میں احمد عیسوی کی ایک مثنوی بھی شامل ہے۔ عام ترکی شاعروں کے لیے یہ مثنوی آج بھی نمونہ کا کام دیتی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ ابھی کچھ زمانہ تک فارسی شاعری ہی سے لطف اندوز ہوتا رہا، اس لیئے کہ فارسی کو خاتونوں کی سرپرستی کا بھی شرف حاصل تھا۔ بہرطور عربی و ایرانی تہذیب کے اثرات اُن ترکوں پر زیادہ آسانی سے مرتب ہوئے جنہوں نے ایران و ایشیائے کوچک فتح کیا تھا، کیوں کہ جس وقت یہ ترک اسلام سے واقف ہوئے ہیں اس وقت ان کی تہذیبی سطح ان ترکوں سے بہت پست تھی جنہوں نے ترکستان فتح کیا تھا۔ بظاہر تو یہ لوگ پہلے ہی سے کچھ نہ کچھ

ادبی مذاق رکھتے تھے۔

منگولوں کی فتوحات نے خانہ بدوشوں کو اپنی روایتوں، اپنی طرزِ زندگی اور اپنی زبان سے بہت زیادہ اہمیت وابستہ کرنے میں بڑی تقویت پہنچائی۔ منگولی اور ترکی زبان میں بڑا فرق تھا، اور ترکوں کے مقابلہ میں منگولوں کا تہذیبی معیار بھی پست تھا۔ بایں ہمہ خانہ بدوشانہ زندگی جن اصولوں پر مبنی تھی وہ ہر جگہ یکساں تھے۔ علاوہ ازیں مغرب کی طرف سے آنے والے منگولی خانہ بدوشوں کی تعداد ترکوں کی تعداد سے بہت ہی کم تھی اور ان ملکوں میں جہاں آبادی مختلف قوموں کے خانہ بدوشوں پر مشتمل تھی جیسے ترکستان اور "طلائی گروہ" وہاں منگولی فاتحوں کی اولاد نے بہت جلد اپنی زبان بھول کر ترکی زبان اختیار کر لی۔ منگولوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ خود منگولی زبان میں اپنا ذاتی ادب پیدا کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہندی قصّوں کے ایک مجموعہ کلیلہ و دِمنہ کو فارسی سے منگولی زبان میں منتقل کیا گیا لیکن اب تک یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ آیا اس ادب نے منگولی زندگی یا ادبی زبان پر بھی کوئی اثر ڈالا تھا یا نہیں۔ اس دور کے منگولوں اور کلموکوں میں ایک رزمیہ قصہ بہت مقبول تھا۔ اس میں بو غاتر جو رگیر (جو گیر غالباً فارسی لفظ جہاں گیر سے ماخوذ ہے) کے کارنامے بیان ہوئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس رزمیہ داستان کی بنیاد ایران میں پڑی تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ منگولوں کے جانشینوں نے افغانستان میں آج تک اپنی زبان محفوظ رکھی ہے لیکن اس میں کوئی ادب حتیٰ کہ عوامی ادب بھی موجود نہیں ہے۔ بہ حیثیت مجموعی معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں خاص اپنی قوم کی عظمت و نام آوری کے لیے منگولی خانوں نے جو کچھ کام انجام دیئے ان سے منگولوں کے مقاصد پورے ہونے کے بجائے درحقیقت ترکی قومیت کو فایدہ پہنچا۔ رشیدالدین نے اپنی تالیف کے ایک حصہ میں چنگیز خان، اس کے آبا و اجداد اور دوسرے منگولوں نیز ترک قبیلوں کی خانہ بدوشانہ زندگی کا جو شاندار نقشہ کھینچا ہے اس سے منگولوں نے نہیں بلکہ ترکوں نے فایدہ اُٹھایا۔ رشیدالدین کی کتاب کے متعلقہ حصوں کو متعدد مرتبہ ترکی زبان میں منتقل کیا گیا۔ اس قسم کا ایک ترجمہ روس میں بورے، تودوناف

کے بیٹے بھی

کیا گیا۔ رشید الدین کے زیر اثر ترکوں نے اور غیزی ترکوں کی روایتوں کو خود اپنی قومی روایتیں بنا کر ادبی رنگ میں پیش کیا۔ چنانچہ ایران اور ایشیائے کوچک کے ترک فاتح اپنا سلسلۂ نسب اسی قبیلہ سے جوڑتے ہیں اور افسانوی اوغزخان کو اپنا جد اعلیٰ مانتے ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی کے ایشیائے کوچک کے رہنے والے ایک ترک مورّخ نے ایشیائے کوچک کی ایک تاریخ لکھی ہے اس میں اوغزخاں کے حالات لکھتے ہوئے اس نے ان تمام اقوال کا ترجمہ کر دیا ہے جو رشید الدین نے اپنی کتاب میں چنگیز خاں سے منسوب کئے تھے اور نہایت دلیری سے ہر جگہ چنگیز خاں کی بجائے اوغزخان کا نام لکھ دیا ہے۔ جیسا کہ "اوغزنامہ" کے عنوان سے ظاہر ہے قومی روایتوں کو ادبی معیار پر لانے میں فارسی ادب کا بھی اثر رہا یہ نام ــــ اوغزنامہ ــــ ان افسانوں کو دیا گیا تھا جو دہقانی لوگ اوغیزی قبیلہ کے متعلق سنایا کرتے تھے۔

چونکہ ترکوں میں اپنی تازہ قوت کا احساس بہت شدید تھا اس لیے قدرتاً ان سے یہ توقع تھی کہ وہ عربوں اور ایرانیوں کے تہذیبی کاموں کو جاری رکھیں گے اور اسلامی شائستگی میں ایک نئی زندگی پیدا کر دیں گے۔ ایشیائے کوچک اور ترکستان دونوں جگہ ترک خود اپنی زبان پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان لوگوں نے بیرونی نمونوں کی تقلید ضرور کی تھی لیکن بیرونی محاوروں اور بیرونی طرز ادا کی غلامانہ نقل نہیں اتاری۔ ایشیائے کوچک میں ایک عرب سپہ سالار بطّال کا افسانہ مشہور تھا جس نے بنو اُمیّہ کے زمانہ میں دین کے لیے لڑتے ہوئے اپنی جان دی تھی۔ ترکوں نے یہ افسانہ اپنے ادب میں شامل تو کر لیا تھا مگر عرب بطّال کو ایک ایسے عثمانی مجاہد کا لباس پہنا کر جو اپنے نمونہ سے بہت زیادہ مختلف تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں کورخوت کے متعلق ایک کتاب تالیف ہوئی۔ کورخوت دراصل اوغیزی قبیلہ کا مداح اور اس کا سردار تھا غرضیکہ اس طرح دوسروں سے لی ہوئی شخصیتوں کو پورے سلسلے کو ترکوں کے قومی خصوصیات سے متصف کیا گیا۔
ایشیائے کوچک میں تیرھویں صدی عیسوی فارسی کے بہت بڑے شاعر و صوفی جلال الدین رومیؒ زمانہ ہے۔ یہ مولوی درویشوں کے فرقہ کے بانی ہوئے ہیں بعض عالموں کا خیال ہے کہ جلال الدین مسلمانوں کے سب سے بڑے صوفی ہیں۔ شروع شروع میں ان کے حلقہ کے لوگ صرف فارسی ہی میں

نہیں بلکہ ترکی میں بھی اپنی کتابیں لکھتے تھے۔

درویشی مسلک اور صوفیانہ شاعری کی نشوونما کے لیے ایران کی بہ نسبت ایشیائے کوچک کی فضا زیادہ سازگار تھی۔ یہاں صوفیانہ شاعری کا ارتقا ایک بالکل مختلف اور جداگانہ طریق پر ہوا۔ اس صدی میں ترکی زبان ایشیائے کوچک میں سرکاری زبان بن گئی تھی۔ رفتہ رفتہ ایک ایسی انتہائی پرتصنع زبان وجود میں آئی جو سرکاری کارروائیوں کے علاوہ ادب کے لیے بھی موزوں تھی لیکن تقریری زبان سے مختلف ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا دشوار تھا۔ اس میں عربی و فارسی الفاظ کثرت سے ہوتے تھے۔ البتہ ان کی شکلیں خالص ترکی صرف ونحو کے تابع ہوتی تھیں۔ فارسی ادب کے اثرات کے علاوہ ترکوں پر ایرانی فن تعمیر کا اثر بھی معلوم ہوتا ہے۔ ایرانی طرز کی عمارتیں زیادہ تر قونیہ اور سیروسیہ میں تعمیر ہوتی تھیں لیکن ان میں بھی کسی طرح ایرانی نمونوں کی غلامانہ تقلید نہیں کی جاتی تھی۔ قونیہ میں ایرانی طرز کی عمارتوں کے پہلو بہ پہلو زمانۂ قبل اسلام کا مقامی طرز صاف طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔

ایشیائے کوچک کو ایران کے ترکوں نے فتح کیا تھا۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی سے یہاں بھی اسی خاندان کی حکومت ہوگئی جو ایران پر حکومت کر رہا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں ایشیائے کوچک پر ایران کے منگول خانوں کا تسلط قایم ہوگیا۔ دوسری طرف جب دسویں صدی عیسوی میں ترکستان میں سامانیوں کو زوال ہوا تو چند صدیوں تک ترکستان اور ایران کے تعلقات میں خلل پڑ گیا۔ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں خوارزم کا سلطان محمد ترکستان اور ایران کو ایک ہی حکومت کے ذریعہ متحد کر دینے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن اس کی حکومت اتنی قلیل المدت رہی کہ اس سے تہذیبی اور تمدنی زندگی متاثر نہ ہو سکی۔ چنگیز خاں کے جانشینوں کے زمانہ میں ترکستان میں ایک مخصوص منگولی حکومت قایم ہوگئی جس کی وجہ سے ترکستان اور ایران کے تعلقات مخاصمانہ ہوگئے۔ بایں ہمہ اس دور میں ایرانیوں کے زیر اثر ترکستان میں بھی ترکی ادب پیدا ہوا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں ترکی دنیائے اسلام کی تیسری ادبی زبان سمجھی جاتی تھی۔ جمال قرشی کی شاعری چودھویں صدی

عیسوی کے ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ اپنے بڑے ہم عصر شیخ حسام الدین کے متعلق لکھتا ہے:

''شیخ نے تینوں زبانوں میں بہترین شاعری کی ہے'' شیخ کی عربی شاعری میں فصاحت و بلاغت، فارسی شاعری میں بلند پروازی و نازک خیالی اور ترکی شاعری میں حقیقت و صداقت نمایاں تھی۔ اس لحاظ سے خلیفۂ مامون کے زمانہ کی طرح اب بھی عربی ادب کا معیار فضیلت، فصاحت و بلاغت اور فارسی ادب کا معیار فضیلت نازک خیالی تھا۔ عربی و فارسی اثرات کی وجہ سے ترکی زبان نے فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ نازک خیالی میں بھی ترقی کی لیکن سلاست و سادگی کی بناء پر ترکی شاعری اپنی ایک خاص دل کشی رکھتی ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کا آخری اور پندرھویں صدی عیسوی کا زمانہ ترکستان میں نہایت شاندار رہا۔ اس سے پہلے ترکستان میں ایسی ترقی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ تیمور اور اس کے جانشینوں کے زمانہ میں ترکستان اور ایران دوبارہ ایک ہی حکومت کے تحت متحد ہوگئے۔ تیموری فوجوں کا سیلاب تو اس سے بھی بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ چنان چہ مغرب میں اس کی فوجیں بروسہ و سمرنا تک، جنوب مغرب میں دہلی تک اور شمال میں ارتاش تک پہنچ گئی تھیں۔ چنگیز خاں کے حملوں میں جتنا خون خرابہ ہوا تھا تیموری حملوں میں اس سے کچھ کم نہیں ہوا۔ چنان چہ تیموری حملوں میں انتہائی بھونڈے قسم کی سفاکی کے ساتھ افسردہ کن بہیمت بھی شامل تھی۔ بایں ہمہ تیمور نے جس ہیبت ناک پیمانہ پر تباہی پھیلائی تھی اسی رعب دار پیمانہ پر اس نے اپنی تخلیقی قوت سے کام لینے کی بھی کوشش کی۔ چنان چہ ایک طرف تو یہ حال تھا کہ بڑے بڑے شہروں کے ہزاروں افراد قتل کیے جارہے ہیں، مقتولوں کی کھوپریوں سے بڑے بڑے منار بن رہے ہیں، اور لاتعداد انسانوں کو اذیتیں دی جارہی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ تعمیری بھی بڑے زبردست پیمانہ پر ڈھالی جارہی تھیں اور عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہورہی تھیں خصوصاً فاتح کے دارالسلطنت سمرقند میں جہاں بعض وقت فاتح تیمور اپنے تباہ کیئے ہوئے ملکوں سے کاری گروں اور عالموں کو پابجولان بلواتا تھا۔ سمرقند کے گرد و نواح میں جو بستیاں بسائی گئیں تھیں ان کے نام بڑے بڑے اسلامی شہروں کے نام پر رکھے گئے تھے۔ مثلاً کسی

ماؤں کا نام دمشق تھا، کسی کا مصر، دقاہرہ، کسی کا شیراز اور کسی کا سلطانیہ وقس علیٰ ہذا۔ گویا اسطرح تیمور تمام دوسرے شہروں پر اپنے دارالسلطنت کی فوقیت جتانا چاہتا تھا! عمارتوں کا طرز تعمیر تو وہی ایرانی تھا لیکن تناسب کے لحاظ سے یہ عمارتیں ایرانی نمونوں سے بہت بڑی ہوتی تھیں۔ تیمور کو اپنی عمارتوں کے اس امتیازی وصف پر بڑا اصرار تھا، چنانچہ وہ شخصی طور پر خود بھی معماروں کو ہدایتیں دے کر انھیں اپنی فنّی قوت اختراع سے حیرت میں ڈال دیتا تھا کیوں کہ اکثر و بیشتر یہ قوت اختراع اس وقت کے اصول فن سے بظاہر قابو میں نہیں آتی تھی۔ تیمور کے زمانہ کی عمارتوں کا بیشتر حصہ تو اب کھنڈر ہوگیا ہے بلکہ سولھویں صدی عیسوی ہی میں یہ مرمت طلب ہوگئی تھیں۔ ان عمارتوں میں سب سے زیادہ شاندار سمرقند کی جامع مسجد تھی جو مسجد بی بی خانم کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کا یہ حال تھا کہ خود تیمور کے زمانہ میں اس کی حالت مخدوش تھی اس لیے کہ اس زمانہ میں ایک روز جمعہ کی نماز ہو رہی تھی کہ نمازیوں نے بڑے خوف سے پتھروں کے گرنے کی آواز سُنی جو غالباً گنبد سے گر رہے تھے۔

تیمور کے جانشینوں کے زمانہ میں تخریب و تعمیر قدم بہ قدم نہ چل سکے۔ حربی منصوبے اب پرانے دہشت ناک پیمانہ پر انجام نہیں پاتے تھے بل کہ سلطنت کی سرحدیں بھی رفتہ رفتہ زیادہ محدود ہو رہی تھیں۔ لیکن خاص خاص شہروں خصوصاً سمرقند و ہرات میں عمارتیں بنانے کا شوق برابر کار فرما معلوم ہوتا تھا۔ تیمور کے زمانہ میں علماء و شعراء اور فن کار شاہی دربار میں جبراً ٹھہرائے جاتے تھے لیکن اس کے جانشینوں کے دربار میں یہ لوگ بطیب خاطر آنے لگے تھے۔ تیمور کے پوتے الغ بیگ نے چالیس برس (۱۴۰۹ء عیسوی تا ۱۴۴۹ء عیسوی) حکومت کی۔ اس دور میں بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں جن میں بخارا اور سمرقند کے مدرسے خاص شہرت رکھتے تھے۔ بخارا کے مدرسہ پر یہ حدیث کندہ کرائی گئی تھی:-

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ" سمرقند کے مدرسہ میں قاضی زادہ دینی علوم پر درس دیتے تھے۔ ان علوم کے علاوہ یہاں ہیئت بھی پڑھائی جاتی تھی۔ رصدگاہ میں جو کام انجام پاتا تھا وہ اگرچہ مختصر تھا لیکن اس کے شاندار ہونے میں کلام نہیں۔ الغ بیگ نے یہ رصدگاہ

ایرانی ہئیت والوں اور ان کے شاگردوں کے لئے بنوائی تھی۔ ان شاگردوں میں خود بادشاہ وقت اُلغ بیگ بھی شامل تھا۔ زیچیں اور ستاروں کی فہرستیں اُلغ بیگ ہی کے نام سے ترتیب پاکر شائع ہوئیں۔ یہ زیچیں گویا قرون وسطیٰ کے علم ہئیت کی آخری تحقیقات ہیں۔ بہ الفاظ دیگر دُوربین کی دریافت سے پہلے تک علم ہئیت جتنی ترقی کر سکتا تھا یہ اس کی آخری حد تھی۔ تخت شاہی پر ایک عالم کی حیثیت سے دنیائے اسلام کی تاریخ میں اُلغ بیگ ایک لاثانی حکمران گزرا ہے۔ اُلغ بیگ کے ہم عصر اس کو صرف ارسطو کے شاہی شاگرد یعنی اسکندر سے تشبیہہ دے سکتے تھے۔ اُلغ بیگ "انسانی ترقی بلالحاظ مذہب و ملت" کے خیال پر شدت سے یقین رکھتا تھا۔ زیچوں پر اس نے جو پیش لفظ لکھا تھا اس میں ہم کو قابل توجہ لیکن اصلاً غلط نظریہ ملتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

علوم صحیحہ کے مطالعہ سے ایسے نتیجے نکلتے ہیں جن میں قطعاً کوئی تغیر نہیں ہوتا اس لئے کہ مذہب، قومیت یا زبان کی تبدیلی سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا جیسا کہ معلوم و معروف ہے۔

قدیم عالموں کی کتابیں درحقیقت صرف تاریخی دلچسپی رکھتی ہیں لیکن قدیم ادیبوں کی تحریروں میں اب بھی تازگی باقی ہے۔ گو جس زبان میں یہ تحریریں لکھی گئی تھیں ان کو مٹے ہوئے مدت دراز گزر چکی ہے۔ اُلغ بیگ کی رائے اسلامی تہذیب کے ایسے نمایندہ کی رائے کا نمونہ ہے جو یونانی علوم پر تو پورا عبور رکھتا تھا لیکن یونانی ادب سے بے بہرہ تھا۔ اُلغ بیگ کا ایک درباری علی کوشجی جس کو اُلغ بیگ بیٹا کہہ کر پکارتا تھا اُس کا خاص شاگرد تھا لیکن سمرقند کی فضا علوم صحیحہ کی نشوونما کے لئے زیادہ سازگار نہیں تھی اس لیے بادشاہ کے مرنے کے قریباً فوراً بعد ہی اس کی بنائی ہوئی رصدگاہ بند ہوگئی۔ سولھویں صدی عیسوی کے ابتدائی زمانہ ہی میں اس رصدگاہ کے صرف کھنڈر رہ گئے تھے۔ اور بیسویں صدی عیسوی میں صرف کھدائی سے اس کے آثار دریافت ہوسکے۔ علی کوشجی پہلے ایران گیا اور پھر وہاں سے نکل کر ترکی میں سکونت اختیار کرلی جہاں اس کے چند شاگرد پیدا ہوئے۔

سلطان حسین کا دورِ حکومت ہرات کا بہترین زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ (۱۴۶۹ء تا ۱۵۰۶ء) وسط ایشیا کے باشندے تو یہ سمجھتے تھے کہ تمام دنیا میں ہرات کے جیسا کوئی دوسرا

شہر موجود نہیں ہے۔ یہ خیال ہرات کی تہذیبی خوبیوں پر مبنی تھا نہ کہ اس کی وسعت پر۔ اس لیئے کہ
سعت میں تو یہ سمرقند سے بھی کم تھا۔ سلطان حسین کا دورحکومت ایک عجوبۂ روزگار معلوم ہوتا تھا
ں لیئے کہ اس دور میں بلالحاظ مشرب و ملت جو شخص جس کام کو کرتا تھا اس کا قصد تھا کہ اس
م میں کمال حاصل کیجیے۔[۱]

اس زمانہ میں میر علی شیر نامی ایک امیر علوم و فنون کا بڑا قدر دان گزرا ہے۔ اس کے
دراس کے آقا کے نام کے ساتھ فارسی کے آخری بڑے شاعر جامی اور مورخ میر خواند کے
رنامے وابستہ ہیں۔ میر خواند نے ایک تاریخ تالیف کی تھی جس کے متعلق اب بھی یہ خیال کیا
اتا ہے کہ فارسی میں اس قسم کی کتابوں میں بھی سب سے زیادہ مقبول ہے۔

الغ بیگ کی سلطنت کا دائرہ اس تمام علاقہ تک وسیع تھا جس میں آج کل بخارا، کاشغر،
مرقند اور فرغانہ کی خانات اور سیر دریا کے قلعوں کا ایک بہت بڑا حصہ شامل ہے۔ اور
لطان حسین کی سلطنت میں خراسان، خوارزم اور افغانستان کا ایک حصہ شامل تھا لیکن
رانی تہذیب کا اثر ان سلطنتوں کی سرحدوں سے بہت آگے تک پھیلا ہوا تھا ونیز ان کے مشرقی
سائے بہت سی عمارتیں، تیمور اور تیموریوں کی عمارتوں کے نمونہ پر تعمیر کیا کرتے تھے۔ کلجی کے
ذب مغرب کی وہ مسجد جو غالباً چودھویں صدی عیسوی میں بنی تھی اس کو عام روایت تغلق تیمور کا
قبرہ بتاتی ہے جس کا انتقال ۱۳۶۳ء عیسوی کے شروع میں ہوا تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے
روع میں مشہور کاروان سرائے "تاش رباط" تعمیر ہوئی۔ یہ سرائے جنوبی حصہ میں کاشغر جانے والی
م بڑی سڑک پر واقع تھی۔ توک ماک کے قریب جو منارہ "بوران" کے نام سے مشہور ہے
ں کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اس لیئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی دستاویز نہیں ہے جس میں
س کا ذکر کیا گیا ہو، اور نہ خود عمارت پر کوئی کتبہ ہے جس سے اس کا حال معلوم ہو سکے۔

تیمور اور اس کے جانشینوں کی مادری زبان ترکی تھی لیکن جہاں تک ان کے کاموں سے

---

[۱] ترجمہ تزک بابری صفحہ ۲۱۸۔

اندازہ ہو سکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ترکی قومیت کا زیادہ احساس نہیں تھا۔ بایں ہمہ ان کے ہم نسل لوگوں نے ترکی زبان و ادب کی اہمیت کو بڑھانے کے لیئے ان کے دربار کی شان و شوکت سے پورا فایدہ اٹھایا۔ ترکی شاعری تقلیدی تھی لیکن ترکی شاعر یہ ماننے کے لیئے تیار نہیں تھے کہ ان کی شاعری فارسی شاعری سے کسی طرح کم درجہ رکھتی ہے۔ دوسری طرف وہ یقین رکھتے تھے کہ یہ احساس ہم سری ترک حکمرانوں کی قوت و شوکت کا لازمی نتیجہ تھا۔ الغ بیگ کو مخاطب کر کے شاعر سکاکی کہتا ہے ؎

بسے دور باید کہ چرخ ظفر بیارد کسے چو تو بار دگر

میر علی شیر کی شہرت و نام آوری کی وجہ سے اس کے تمام پیشرو نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ گو علی شیر کی شاعری فارسی میں ہے لیکن اس کی شہرت زیادہ تر ترکی شاعر کی حیثیت سے ہے۔ چنانچہ قسطنطنیہ سے توبولسک تک ترکی بولنے والی پوری دنیا اس کے کلام کا شمار ترکی کلاسکس میں کرتی ہے۔ علی شیر ایک محب وطن بھی تھا اس لیے اس نے قصداً یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس کی زبان فارسی سے کسی طرح کم رتبہ نہیں اور یہ کہ شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لیئے ترکی بھی اتنی ہی موزوں ہے۔ جتنی کہ فارسی۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس نے ترکی میں ان تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے جو فارسی میں مشہور اور متداول تھے۔ اس طرح ترکی زبان کا کلاسکی شاعر بھی نہ تو فارسی سے لیئے ہوئے اصناف سخن ترک کر سکا اور نہ ترکوں کے قومی فسانوں کو اپنا موضوع فکر بنایا۔ بایں ہمہ اس کی شاعری کچھ پر آواز ضرور معلوم ہوتی ہے تاہم فارسی نمونوں کے مقابلے میں زیادہ سلیس، زیادہ عام فہم اور حقیقت سے قریب تر ہے۔ علی شیر کی شاعری میں ہم کو تخلیقی توانائی کے وہ رجائی جذبات نظر آتے ہیں جو تیموریوں کے دور کا امتیازی وصف ہے۔ شاعر کے الفاظ میں کاہلی و بے کاری موت کے مساوی ہے۔ ان سب خیالات کا اطلاق سلطان بابر (۱۴۸۲ء تا ۱۵۳۰ء) کی تصنیفوں پر اور زیادہ وسیع پیمانہ پر ہوتا ہے جس کو نئے فاتحوں یعنی ازبکوں کے دباؤ کی وجہ سے ترکستان سے بھاگ کر ہندوستان میں اپنے لیئے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالنی پڑی۔ چند نظموں کے علاوہ بابر نے خود نوشت سوانح بھی اپنی

یادگار چھوڑی ہے سولھویں صدی عیسوی میں بھی اس کو ترکی نثر کی کلاسکی کتاب خیال کرنا درست اور بجا تھا۔ اسلامی ادبیات اور ایرانی تمدن کی پوری واقفیت بھی اس کو اپنی مادری زبان میں سلیس و سادہ نثر لکھنے سے نہ روک سکی۔ چوں کہ اس کے پڑھنے والے بھی ان صفات کی قدر کرتے تھے اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں صحت بخش ادبی فضا، موجود تھی۔ سلطان حسین کا ہم عصر دولت شاہ اپنے زمانہ میں فارسی ادب کا ایک بہترین نقاد گزرا ہے۔ جب ہم اودکی کی سادا زبان اور بعد کے عثمانلی مصنفوں کی "قبیح ترکی" کے متعلق اس کی حقارت آمیز رائے پڑھتے ہیں تو یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ یہ قبیح ترکی وہی زبان تھی جس میں عثمانلی ترکوں کے آبا و اجداد لکھتے پڑھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بابر نے اپنے زمانہ کے مصنفوں سے جن چیزوں کا مطالبہ کیا ہے وہ نہ صرف تیموری دور کی رائے کا نمونہ ہے بلکہ خود اس کے زمانہ کے معاشرہ کی اکثریت اور تیموریوں کے عہد کی رائے کا نمونہ ہے۔ بابر کو اس بات پر اصرار تھا کہ مصنفوں کو اس طرح لکھنا چاہیئے کہ تعلیم یافتہ لوگ ان کی تحسین کر سکیں، ساتھ ہی غیر تعلیم یافتہ طبقے بھی ان کو سمجھ سکیں۔ ان کی نظریں مستقبل پر لگی رہیں نہ کہ ماضی پر۔ قدما کی عقل مندی پر بے سمجھے بوجھے آنکھ بند کئے ایمان لانے کے مقابلہ میں بابر ایک سیدھا سادا اور واضح اصول پیش کرتا ہے۔ "ہاں جس سے جو عمدہ طریقہ جاری ہو وہ برتنا چاہیئے، اگر باپ نے کوئی بُری رسم جاری کر دی تو اس کو اچھی رسم سے کیوں نہ بدلیں۔"[1]

۱۔ ترجمہ تزک بابری اردو، نصیرالدین حیدر صفحہ ۱۹۱۔

سلطنت دہلی
اور
اس کا نظام عدل گستری

از

جناب عبدالحفیظ صدیقی صاحب بی ایس سی، ایل ایل ایم (عثمانیہ)

مسلمان ہندوستان میں

ہندوستان کی سرزمین سے مسلمانوں کا سیاسی تعلق[1] اس وقت سے شروع ہوا جب کہ

---

[1] فتح سندھ سے قبل ہی حضرت عمرؓ کے دور میں مسلمان ہندوستان آگئے تھے لیکن اس کا تذکرہ ہمارے موضوع سے خارج ہے کیوں کہ اس کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سندھ کا نظم و نسق، رسالہ اسلامک کلچر د ۱۹۳۳ء ص ۱۱۹۔

محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تھا (۷۱۱ء - ۷۱۳ء) ۔ اور سندھ ایک عرصے تک اموی اور عباسی خلافت کا ایک مشرقی صوبہ بنا رہا ۔ چنانچہ سندھ کی مقامی حکومت کی تشکیل ایسی ہوتی تھی جیسے خلافت کے دوسرے صوبے تھے ۔ البتہ اندرونی نظم ونسق کے تمام امور والی وقت کے اختیار تمیزی پر موقوف تھے ۔ فاتح سندھ نے خاص طور پر مذہبی رواداری پر بہت زور دیا ۔ علمائے دمشق سے یہ فتوی حاصل کیا گیا کہ ہندوستان میں ہندو مندروں کی وہی حیثیت ہوگی جو خلافت کے دیگر صوبوں میں عیسائی کلیساؤں یا یہودی معبدوں کو حاصل ہے ۔ برہمنوں کو وہ تمام حقوق عطا کئے گئے جو ہندو راجاؤں کے زمانے میں حاصل تھے ۔ بلکہ ان کو وصول مالگزاری کے لیے عہدے بھی دیے[1] اور خود راجہ داہر کے وزیر کو حسب سابق اس کے قدیم عہدے پر بحال رکھا گیا[2] نیز جن برہمنوں کو راجہ داہر کے زمانے میں نظم ونسق میں ذمہ دار عہدے حاصل تھے، وہ حسب حال رہے[3] اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کا نظم ونسق خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں رہا جس میں فاتح کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے[4]۔ فصل خصومات میں شاستر پر عمل کیا جاتا تھا[5]۔ ہندوؤں کے مقدمات میں شرع داخل نہیں کی گئی بلکہ سچ تو یہ ہے کو ذمی قانون بھی ان پر عاید نہیں ہوا[6] دیوانی مقدموں میں ہندوؤں کی قدیم پنچایتیں ہی فیصلہ کرتی تھیں[7]۔ اب رہے مسلمان جو زیادہ تر سپاہی تھے، تو ان کے لیے قاضی مقرر تھے اور قاضی، مفتی کے مشورے سے شرع کے مطابق مقدمات فیصل کرتے تھے[8]۔

---

۱ ۔ قریشی ص۳

۲ ۔ الفنسٹن، ہسٹری آف انڈیا ۔ (لندن ۱۹۱۶ء) ۔ ص۳۰۳ ۔

۳ ۔ محمد اللہ ص۵ ۔

۴ ۔ الفنسٹن ص۳۰۲، ۳۰۳ ۔ الیٹ: اربس ان سندھ ص۳۶۲ ۔

۵ ۔ واحد حسین ص۱۸ ۔

۶، ۷ ۔ ایشوری پرشاد، ہسٹری آف میڈی ایول انڈیا ص۴۶، ۴۷ ۔

۸ ۔ محمد اللہ ص۵ ۔

البتہ عام اور سیاسی جرائم کی صورت میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں تھا۔ قاضیوں اور مفتیوں کے فیصلوں کا مرافعہ گورنر کی عدالت میں ہوتا تھا۔[1]

محمد بن قاسم نے سندھ میں نظم و نسق کی جو نظیر قایم کی تھی، اس کی بعد کے مسلمان فاتحوں نے پیروی کی۔[2]

پنجاب کی حکومت

فتح سندھ کے تقریباً تین صدی بعد غزنویوں نے پنجاب میں اپنی حکومت قایم کی۔ لیکن بدقسمتی سے مورخ اس کی اہمیت کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کی معلومات سے ہم بے بہرہ ہیں خود بیہقی کی "تاریخ آل سبکتگین" کا مکمل نسخہ دستیاب نہیں ہوتا اس لئے اس زمانے کے تفصیلی حالات معلوم کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سلاطین دہلی نے آل سبکتگین کی دو سو سالہ حکمرانی کے تجربوں سے ضرور فایدہ اٹھایا۔[3] اور خود غزنویوں نے سندھ سے خوشہ چینی کی ہے۔[4]

غزنوی دراصل سامانیوں کے خوشہ چین تھے اور یہ سامانیوں کے دست آورده بھی تھے ابتدائی دور میں خود محمود نے اپنے سکوں پر اپنے کو سامانی گورنر ظاہر کیا ہے۔[5] البتہ ۹۹۹ء سے محمود غزنوی نے "امیر" کا لقب اختیار کر لیا[6]، اور سامانیوں کا نام سکوں سے خارج کر دیا۔[7] اور راسنہ

---

[1] واحد حسین ص۱۸۔
[2] قریشی ص۳۔
[3] " "
[4] " ص۱۳۔۱۴۔
[5] ایڈورڈ تھامس، کا ئنس آف دی کنگس آف غزنی ص۲۔
[6] ترپاٹی ص۹۔
[7] تھامس ص۲۔

خلیفۂ بغداد سے اپنے آزاد سلطان ہونے کی سند منگوائی[1]۔

لاہور، ہندوستان میں شاہان غزنی کا مرکز تھا، یہاں ان حکمرانوں نے حکومت اور نظم ونسق کا جو نقشہ مرتب کیا وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اول تو یہ کہ ان لوگوں نے سندھ کے سیاسی تجربوں سے بھی فایدہ اٹھایا تھا، چنانچہ مذہبی رواداری کے مسلک میں جو ہندو رعایا کیساتھ ہوتی تھی، غزنویوں نے سندھ کے عرب فاتحوں کی پیروی کی اور ہندو عہدہ دار مقرر کئے[2]۔ دوسرے یہ کہ غزنویوں نے سیاسی ادارات سے بھی استفادہ کیا۔ پہلے تو سامانیوں کے توسط سے اور پھر راست خلافت کے ذریعہ یہ ادارات غزنی اور لاہور پہنچے۔ یہ ادارات بہت کام آئے اور سلطنت دہلی کے لیے اس کے کئی نقوش باقی رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ غزنی اور دہلی کے بہت سے ادارات ایک دوسرے کے مشابہ بلکہ مشترک معلوم ہوتے ہیں[3]۔

"اس دور کے نظام عدل گستری کے متعلق ہمارے پاس کوئی مواد نہیں"[4] لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ غزنویوں نے سندھ کی عرب حکومت کی طرح دیوانی معاملات میں خود ہندوؤں کی پنچایتوں سے کام لیا، اور ہندو پنڈتوں کو فصل خصومات کا اختیار دے دیا، اور مسلمانوں کے معاملات قاضی سے متعلق رہے۔ البتہ عام اور سیاسی جرائم میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں تھا۔ عدل گستری کے دوسرے معاملات میں غزنویوں نے عباسیوں کی کبھی براہ راست اور کبھی بالواسطہ پیروی کی۔ اس موقع پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ان غیر عربی اداروں میں جن کو غزنویوں نے بغداد سے حاصل کیا، ایک عہدۂ وزارت بھی تھا[5] جسے

---

[1]۔ ترپاٹھی ص ۹۔

[2]۔ قریشی ص ۳۔

[3]۔ " ص ۳۔

[4]۔ محمد اللہ ص ۵۔

[5]۔ ترپاٹھی ص ۱۶۱۔

ایران قدیم کی یادگار سمجھنا چاہیئے، چنانچہ سامانی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد محمود نے سلطنت غزنی میں اسی طرح کے وزیر مقرر کئے اور ابوالعباس فضل بن احمد اس کا پہلا وزیر ہوا[1] جو سلطان کا نائب سمجھا جاتا تھا محمود غزنوی شرع کا بہت پابند اور بڑا عادل تھا[2]۔

سلطنت دہلی

شہاب الدین محمد غوری نے ۱۱۹۲عیسوی میں دہلی پر قبضہ کیا، لیکن سلطنت دہلی کی ابتدا ۱۲۰۶ء سے ہوتی ہے جب کہ شہاب الدین کا انتقال ہوگیا اور قطب الدین ایبک[3] ہندوستان میں خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ ایبک اور اس کے بعد کے ابتدائی ترک سلاطین کو ہم عصر مورخ قطبی، شمسی اور بلبنی سلاطین کے نام سے یاد کرتے ہیں[4]۔ یہ دراصل ترک غلام تھے، لیکن تخت پر بیٹھنے سے پہلے یہ آزاد ہو چکے تھے، چنانچہ ایبک نے سلطان محمود غوری سے خط آزادی حاصل کرلیا تھا[5]۔ شمس الدین نے اپنے آقا سے آزادی حاصل کی تھی[6]۔ التتمش کے بعد اس کے بیٹے تخت نشین ہوئے تھے جو کامیاب نہیں ہوئے۔ پھر بلبن، جو التتمش کے غلامان "چہل گانہ" میں شامل تھا تخت دہلی پر بیٹھ گیا، اور یہ بھی آزاد ہوگیا تھا[7]۔ یہ قطبی اور شمسی سلاطین جو دکن پر ۱۲۹۰عیسوی تک حکمران رہے، سب کے سب ترک تھے اور التتمش اور بلبن تو ترکستان کے البری قبیلے کے ارکان تھے[8]۔

۱۔ تری پتی ص ۱۶۵۔

۲۔ ملاحظہ ہو تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۵۲، ۵۳۔

۳۔ معزالدین کے غزنی کے راستے میں قتل ہونے کے بعد قطب الدین ایبک کی ہندوستان میں خودمختاری اور اس وقت دلی اور لاہور کی کیفیت کا دلچسپ تذکرہ ملاحظہ ہو تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۲۲ تا ۳۲۔ ۴۔ منہاج ص ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۶۴۔ قریشی ص ۱۳۱۔ ۵۔ منہاج ص ۱۴۰۔

۶۔ منہاج ص ۱۷۰۔ الیٹ جلد ۳ ص ۵۹۱۔ ۷۔ برنی ص ۲۵، ۲۶۔

۸۔ منہاج ص ۱۶۶، ۲۸۱۔

تیرھویں صدی عیسوی کی یہ ترک حکومت مختلف عناصر پر مشتمل تھی جن میں سے کچھ تو بدیسی ہیں اور کچھ خود ہندوستانی۔ بادشاہ اور اس کے اہل حاشیہ ایرانی تزک و احتشام کے دلدادہ تھے[۱] فوجوں کی تنظیم منگولی اور ترکی طرز کی تھی[۲]۔ اور جہاں تک حکومتی تنظیم کا تعلق ہے، مرکزی حکومت تو ترکی اور عباسی شان رکھتی تھی، لیکن مقامی حکومت کا قدیم ہندوستانی نظام برقرار رہا۔ اس بات کے بھی قرائن ہیں کہ قطب الدین ایبک نے لاہور کے موجود الوقت اداروں کی خوشہ چینی کی اور غزنویوں کے بہت سے عہدہ داروں سے کام لیا[۳]۔ شمس الدین التمش کے دربار میں بغداد کی مشہور شخصیت یعنے فخرالدین عصامی موجود تھے جو خلافت میں تیس سال تک وزیر رہ چکے ہیں۔ سلطان نے انھیں اپنا وزیر اعظم بنایا تھا[۴]۔ نیز بہت سی ایسی شخصیتیں بھی تھیں جو منگولوں کے ڈر سے ہندوستان بھاگ آئیں[۵]۔ اور اس طرح ابتدائی بیس سال کے اندر ہی سلطنت دہلی میں نظم و نسق کے بہترین ماہر جمع ہو گئے[۶]۔ شروع ہی سے ان ترک سلاطین کو نظم و نسق کا اچھا ذوق تھا، اور وہ گہری نظر سے اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ چنانچہ قطب الدین ایبک کے عہد میں فخر مدبر نے "آداب الملوک" لکھی جس میں تنظیم حکومت کے تمام اصول جمع تھے۔

التمش کے انتقال کے بعد مرکزی اقتدار کمزور ہو گیا، اور غلامان "چہل گانہ" زور پکڑنے لگے، لیکن بلبن کی بدولت مرکز میں پھر جان آگئی۔ بلبن نے ایرانی انداز میں اپنا

۱۔ برنی ص ۲۵، ۲۹۔

۲۔ ڈاکٹر عزیز احمد: مقالہ "دی فونڈے شن آف مسلم رول ان انڈیا"۔ پروسیڈنگس انڈین ہسٹری کانگریس (۱۹۳۹ء کلکتہ)، ص ۸۳۔

۳۔ قریشی ص ۴۔

۴۔ فرشتہ۔ جلد ۱ ص ۱۱۷۔ عصامی ص ۱۲۲۔

۵۔ " " ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

۶۔ قریشی ص ۶۔

شاہی اقتدار قایم کیا[1]۔ اس کے دربار میں جو لوگ تھے، ان میں اکثر باہر سے آئے تھے۔ اور ان میں بغداد کے شاہی خاندان کے افراد، عالم، فن کار، مدبر و سیاست کار سبھی طرح لوگ شامل تھے[2]۔ یہ سب غیر معمولی قابلیت کے لوگ تھے اور اسی جگھٹے سے شہر دہلی اسلامی دنیا میں بہت مشہور ہو گیا[3]۔ بلبن کی ساری توجہ یا تو مدافعتی تدابیر میں صرف ہوئی یا نظم و نسق کی اصلاحوں پہ۔ بلبن نے شرع کی بہت پابندی کی۔ گو اس کی شاہی جمہور کے سامنے ذمہ دار نہیں تھی مگر خدا کے سامنے ذمہ دار تھی[4]۔

شمسی حکمرانوں کے بعد ۱۲۹۰عیسوی میں خلجی خاندان برسر اقتدار ہوا۔ جلال الدین خلجی بہت نرم دل واقع ہوا تھا اس لیے کسی بڑی اصلاح کی جانب اس نے قدم نہیں اٹھایا البتہ اس کا جانشین علاؤالدین بہت حوصلہ مند ثابت ہوا۔ اس نے نظم و نسق میں علما کو مداخلت کا موقع نہیں دیا[5]۔ اور اس کا دنیاوی قانون سلطان کی مرضی کا تابع تھا[6]۔

۱۳۲۱عیسوی سے تغلق خاندان تخت دہلی پر فائز ہوا۔ غیاث الدین تغلق نے نظم و نسق کی بہت سی اصلاحیں کیں[7]۔ یہ بڑی اچھی سیاسی صلاحیت رکھتا تھا، اور اس کے زمانے میں سلطنت دہلی کا نظم و نسق اچھی شکل میں نظر آتا ہے۔ سلطان محمد بن تغلق نے جب تک اس نظم و نسق میں دخل نہیں دیا، سلطنت دہلی برابر عروج پر تھی، لیکن جب اس نے اپنے سیاسی تجربے شروع کر دیے تو پھر مرکز میں

۱۔ برنی ص۲۶ تا ۲۹، ص۳۰ تا ۳۲۔

۲۔ تھامس ص۲۵۴، ۲۵۵۔ برنی ص۲۷، ۱۱۱۔

۳۔ برنی ص۱۱۱، ۱۱۲۔

۴۔ ڈاکٹر ایشور ٹوپا: اور کلچرل ہیری ٹیج ص۸۹۔

۵۔ قریشی ص۵۔ ۶۔ فرشتہ ص۱۰۹ تا ۱۱۳۔

۷۔ ایشوری پرشاد ص۲۰۷۔

۸۔ قریشی: باب ۶ و باب ۱۔ نیز ملاحظہ ہو برنی ص۴۲۹، ۴۳۲۔

کمزوری آنے لگی۔ محمد بن تغلق دراصل ایک بہت بڑا عالم تھا[1] لیکن جہاں بانی سے عاری تھا! اسکے منصوبے نظری اعتبار سے اچھے معلوم ہوں تو ہوں، لیکن اپنے زمانے سے بہت آگے تھے۔ اس لیے سب منصوبے ٹوٹ پھوٹ گئے اور ہندوستان کی سیاست کو نقصان پہنچا۔

ادارۂ شاہی

تیرھویں اور چودھویں صدی میں ان ترک خاندانوں نے ہندوستان میں جو شاہی قایم کی تھی وہ وسطی دور کا ایک دلچسپ ادارہ ہے۔ اس کو "ترک شاہی" کہنا چاہیئے۔ ایبک کے عہد میں اس ادارے نے جنم لیا اور لودیوں کے خاتمے تک کم وبیش تین سو سال قایم رہا اور اس تین سو سال کے دوران میں اس میں مدوجزر بھی ہوئے۔ غور سے دیکھا جائے تو ترک شاہی مختلف عناصر کا مجموعہ ہے جس میں ترکی، ایرانی اور ہندوستانی عناصر شامل ہیں۔ اس میں عربوں کے جمہوری تصورات کا کوئی اثر تو نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ خلیفۂ اسلام کا تو انتخاب ہوتا تھا، اور تمام جمہور اسلام انتخاب کرتی تھی اور خلیفہ کا اقتدار جمہور کا دیا ہوا تھا[2] لیکن ترک شاہی میں قدیم ایرانی تصور پایا جاتا ہے۔ ایران کے ساسانی شہنشاہ اپنے حقوق کو آسمانی جتاتے تھے، اور حکمرانی کو اپنے خاندان کا خاص حق سمجھتے تھے۔ اسی طریقے سے ہندوستان کی ترک شاہی اسلامی تصور کے مطابق نہیں بلکہ قدیم ایرانی روایات کی تابع تھی[3] سلاطین دہلی پر ایرانی و ترکی اثرات کے علاوہ ہندو تصورات کا بھی اثر پڑا[4]۔ چنانچہ اس کے نظم ونسق اور خود نظام عدل گستری پر ہندوستان کے اثرات معلوم ہوتے ہیں[5]۔ اگر ترک شاہی میں اسلام کا جمہوری اثر ہوتا تو یہاں بھی دستوری شاہی قایم ہو جاتی لیکن ہندوستان کی یہ شاہی "رعایا پرور شخصی حکمرانی" سے آگے نہ بڑھ سکی[6]۔ کبھی تو سلطان کو دار السلطنت کے عمائد

---

[1] ملاحظہ ہو ملا نظام الدین احمد بخشی، طبقات اکبری صفحہ ۱۹۹-۲۰۰۔

[2] تریپاٹھی صفحہ ۲۔ [3] برنی صفحہ ۲۶ وغیرہ۔ [4] تریپاٹھی صفحہ ۲۴۷ [5] بشیر احمد صفحہ ۶۲ [6] تریپاٹھی صفحہ ۱۵۱۔

اور رہنما منتخب کرتے تھے اور کبھی طاقتور سلطان اپنے بیٹے یا کسی قریبی رشتہ دار کو تخت کے لیے نامزد کر دیتا تھا[1]۔ چنانچہ اقتش کے زمانے سے سلاطین نے اپنے بیٹوں کو نامزد کرنا شروع کیا[2]۔ البتہ اس کے جواز کے لیے ایک تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ امرا اور عمائد اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تھے[3]۔ تخت نشینی کی رسم قاضی القضاۃ اور دیگر عہدہ داروں کے سامنے عمل میں آتی تھی[4]۔

سلطان اور سلطنت کی حیثیت

قانوناً سلطنت دہلی مشرقی خلافت کا ایک جز وتھی، چنانچہ سلطان معز الدین کیقباد اپنے کو ناصر امیر المومنین لکھتے تھے[5]۔ قطب الدین ایبک[6] اور بعد کے سلاطین بھی اپنے کو خلیفہ کا ماتحت سمجھتے تھے۔ یہ سلسلۂ خلافت ختم ہونے کے بعد بھی خلیفہ کے اقتدار کو برتر سمجھنے اور اس کے ماتحت رہنے کا تخیل برابر جاری رہا۔ اور عام طور پر سلاطین اپنے کو "دارالاسلام" سے وابستہ سمجھتے تھے اور خلیفہ مستعصم کے انتقال کے بعد بھی سکوں اور خطبوں میں مستعصم کا نام موجود ہوتا تھا، اور جلال الدین خلجی کے انتقال تک مستعصم کا نام دہلی کے سکوں پر موجود تھا[7]۔ خود علاؤالدین خلجی نے اپنے کو ناصر امیر المومنین اور یمین الخلیفہ بتایا[8]۔ سلاطین دہلی میں ایک آدھ مثال، جیسے قطب الدین مبارک شاہ، ایسی ملتی ہے کہ اس نے خود خلافت کا دعویٰ کیا تھا، لیکن محمد بن تغلق نے مصر کی خلافت سے رشتہ جوڑا اور اپنے سکوں پر خلفائے راشدین کے نام کندہ کرائے[9]۔ اس کے بعد دیگر سلاطین نے بھی یہ روایت جاری رکھی اور کسی نہ کسی خلیفہ کی

---

[1] ۔ تری پتی ص ۱۴۷ ۔ [2] ۔ تری پتی ص ۱۴۷ ۔ [3] ۔ تری پتی ص ۲ ۔ "بیعت" کا طریقہ خود بغداد میں بھی رائج تھا ۔ ملاحظہ ہو امیر علی ص ۴۰۳، ۴۰۵

[4] ۔ الیٹ جلد ۳ ص ۵۹۱ ۔ نیز ملاحظہ ہو اسٹوارٹ ص ۱۰۱ ۔ [5] ۔ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۱۹

[6] ۔ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۳۲ ۔ [7] ۔ تھامس ص ۱۴۵ ۔ [8] ۔ تھامس ص ۱۶۸، ۱۷۳ ۔

[9] ۔ تھامس ص ۲۱۳ تا ۲۱۶، ۲۴۹ تا ۲۵۳ ۔ نظام الدین احمد بخشی، طبقات اکبری ص ۲۰۰، ۲۱۱ تا ۲۱۳ ۔

یادت مانتے رہے، خواہ وہ گمنام ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تو سلطنت دہلی کی قانونی[1] حیثیت تھی۔ لیکن واقعہ دیکھا جائے تو یہ ایک آزاد اور خود مختار سلطنت تھی[2] جس کا طریقۂ حکومت شخصی حکمرانی تھا۔ سلطان مملکت کا صدر تھا اور فوجی سپہ سالار بھی۔ سلطان اصولاً شرع اسلام کے تابع تھا اور شرع کی تعمیل کروانا اس کا فرض تھا۔ اس کو قانون کے اصول میں تبدیلی کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا البتہ سلطان کو تعبیر و توضیح قانون کے اختیارات تھے۔ اور بقیہ امور میں وہ پوری طرح خود مختار تھا۔ بادشاہ کی ذات نظم ونسق کا محور تھی اور اس کا دربار پوری سلطنت کی سیاسی و معاشی سرگرمیوں کا مرکز۔ البتہ کم سن یا نا اہل بادشاہ کی صورت میں "ملک نائب" سلطان کے فرائض انجام دیتا تھا۔ سلطان وزیر کے مشورے سے کام کرتا تھا[3]۔

عام نظم ونسق

مرکزی حکومت کی تشکیل ایسی ہوئی تھی جیسے عباسی حکومت کی تھی[4]۔ چنانچہ بغداد کے اہم ادارے جیسے دیوان مظالم، احتساب، اور مختلف درجے کی عدالتیں دہلی میں قایم کی گئیں[5] اور عدالتوں کے اختیارات اور فرائض عباسی انداز میں متعین ہوگئے تھے[6]۔ نظم ونسق کا سب سے بڑا عہدہ دار

---

[1]۔ قانونی اقتدار اعلیٰ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو قریشی باب۲۔

[2]۔ "واقعی مقتدر" کی حیثیت کے لیے ملاحظہ ہو قریشی باب۳۔

[3]۔ بشیر احمد ص۱۰۲۔

[4]۔ پی۔ سرن۔ پراونشل گورنمنٹ آف دی مغلس ص۳۴۔

سلطان قطب الدین ایبک کے ابتدائی انتظام مملکت اور نظم ونسق کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص۳۲-۳۷۔

[5]۔ بشیر احمد ص۱۰۱،۱۰۰۔

[6]۔ " ص۱۰۱۔

وزیر ہوتا تھا[1] جس کا خاص کام زیادہ تر مالیات کی تنظیم اور مالی محکمہ کی نگرانی تھا۔ اور بعض دفعہ وزیر کو عدلیانہ اختیارات بھی دیدیے گئے تھے[2]۔ وزیر کی مدد کے لیے نائب وزیر[3]، مشرف ممالک[4] اور مستوفی ممالک[5] مقرر ہوتے تھے۔ ناظر اور وقوف بھی دو عہدہ دار تھے جو علی الترتیب وصول مالگزاری اور خرچ کی نگہداشت کرتے تھے[6]۔ قاضی ممالک محکمۂ عدلیہ کا چیف جسٹس تھا[7] جو شرع کی پابندی کرواتا تھا۔ قاضی ممالک فصل خصومات کے علاوہ صدر الصدور کا بھی کام کرتا تھا[8] اور اس لحاظ سے تعلیم، امور مذہبی، اور مساجد وغیرہ کے فرائض بھی اس کے سپرد تھے۔ فوج کا نظم ونسق "عارض ممالک" سے متعلق تھا[9]، اور "برید ممالک"[10] پہ اور خبر رسانی کا عہدہ دار تھا۔ امیر داد[11] قاضیوں کے فیصلوں کی تعمیل کرواتا اور ملزموں اور خاطیوں کو قاضی کے سامنے پیش کرتا تھا۔ جب بادشاہ مرکز میں نہ ہوتے تو بھی امیر داد عدالت مظالم میں مقدموں کی سماعت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کوتوال پولس کا عہدہ دار تھا اور محتسب ملک کے اخلاق عامہ کی نگہداشت کے لیے مامور تھا۔ اشیا کے نرخ اور مارکٹ کی نگرانی بھی محتسب کے سپرد تھی۔ چونکہ محتسب، کوتوال اور امیر داد کے فرائض ملے جلے ہوتے تھے، اس لیے یہ تعاون سے کام کرتے تھے۔

یہ تو مرکزی حکومت کا نقشہ تھا۔ صوبہ داری حکومت کی تشکیل ویسی ہی تھی جیسی مرکز میں۔ البتہ اس کا پیمانہ چھوٹا تھا۔ صوبوں میں گورنر یا ناظم سلطان کی نمایندگی کرتے[12] اور پورے صوبہ داری نظم ونسق کے تمامتر ذمہ دار سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح صوبوں میں اور محکمے بھی تھے جو مرکز کے تابع تھے۔ مثلاً مالگزاری کا انتظام دیوان کے تفویض تھا اور اس کے ماتحت

---

[1]۔ دلی کے عہدہ وزارت کا بغداد، غزنی وغیرہ کے عہدہ وزارت سے تقابلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو تری پتی صفحات ۱۰۱، ۱۶۱، ۱۷۴، ۲۱۰، ۲۱۶۔ نیز ملاحظہ ہو برنی ص ۵۷۹، قریشی ص ۷۶، ۸۲۔ [2]۔ بشیر احمد ص ۱۰۲۔ [3]۔ یہ نیا عہدہ تھا جو پہلی دفعہ دلی میں تراشا گیا ص ۲۱۶ تری پتی۔ [4]۔ قریشی ص ۸۲۔ [5]۔ قریشی ص ۸۲۔ [6]۔ قریشی ص ۸۴۔ [7]۔ قریشی ص ۸۲۔ [8]۔ قریشی ص ۱۲۹۔ [9]۔ قریشی ص ۸۳، ۱۲۹۔ [10]۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو قریشی ص ۱۳۰-۱۲۸۔ [11]۔ قریشی ص ۸۶۔ [12]۔ قریشی ص ۱۵۳۔ [13]۔ بشیر احمد ص ۱۰۲۔

ضلع "سرکار" میں عامل کہلاتے تھے[1]۔ موضع نظم و نسق کی پہلی اکائی سمجھے جاتے تھے جہاں مکھیا اور محاسب متعین تھے ۔ دیہات کی پنچایتوں سے بھی کام لیا جاتا تھا[2]۔ چند دیہات کو ملا کر "پرگنے" بنائے جاتے تھے اور پھر پرگنوں کے مجموعے "شق" کہلاتے تھے ۔ یہی شق اور بعض چھوٹے صوبے بعد میں چل کر "سرکار" کہلانے لگے ۔ گورنر تحفظ امن عامہ کے ذمہ دار تھے اور "فوجدار" سے یہ کام لیا جاتا تھا ۔ فوجدار ہر شق (ضلع) میں پولس اور عاملہ کے فرائض انجام دیتے تھے[3]۔ پرگنوں میں پولس کا عہدہ دار "شقدار" کہلاتا تھا[4]۔ اس نظم و نسق کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہندو راجاؤں اور امرا سے بھی نظم و نسق میں کام لیا گیا ۔ مقامی نظم و نسق کے اکثر امور ہندوؤں کے ہاتھ میں چھوڑ دیے گئے اور مملکت موجود الوقت مقامی اداروں کو مناسب اصلاحوں کے ساتھ جاری رکھتی تھی ۔ قیام امن کے لیے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ اہم مقاموں پر چھاؤنیاں بنا دی گئیں جن میں مسلمان سپاہیوں کو آباد کیا گیا ۔ اس کے علاوہ ذرائع آمد و رفت میں بھی وسعت پیدا کی گئی ۔

یہ مرکزی اور مقامی حکومت کا وہ مختصر خاکہ ہے جو قطب الدین ایبک ، خلجیوں اور پھر تغلقوں کے زمانے میں تقریباً یکساں طور پر موجود تھا ۔ اب ذرا تفصیل کے ساتھ یہ دیکھنا ہے کہ سلاطین دہلی کا تصور عدل کیا تھا اور انہوں نے شرع اسلام کی کہاں تک پابندی کی ۔

سلاطین دہلی کا تصور عدل اور شرع اسلام

مسلمانوں کا ابتدا ہی سے یہ تصور رہا ہے کہ خدا کے احکام کی پابندی کروائیں اور انکی خلاف ورزی کو روکیں ۔ اور یہ پوری مسلم جماعت کا فرض سمجھا جاتا تھا اور عملی اغراض کی خاطر یہ فرض حکمران وقت کے تفویض رہا ۔ اسی فرض میں عدل گستری بھی شامل ہے اور خلیفہ عوام کے منتخب نمایندے کی حیثیت سے یہ فرض قبول کرتا تھا ۔ خلیفہ اپنے عدلیاتی فرائض یا تو

۱؎ بشیر احمد ص ۱۰۲، ۱۰۳ ۔ ۲؎ ۔ ص ۶۲، ۶۳، ۱۰۱، ۱۰۲ ۔ ۳؎ بشیر احمد ص ۱۰۱ ۔ ۴؎ ۔ بشیر احمد ص ۱۰۳

امام عادل کی حیثیت سے بذات خود انجام دیتا یا اس کے لیے اپنا نائب مقرر کر دیتا تھا اور ان عہدہ داروں کے سامنے قرآنی حکم تھا کہ "ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٓئک ھم الکافرون"[1] دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی عدالتی عہدہ داروں پر بڑی بھاری ذمہ داری عاید تھی اور قاضیوں کو خلاف شرع فیصلہ کرنے پر موت کی سزا بھی دی جاتی تھی[2]۔

سلاطین دہلی عام طور پر شرع کی سختی سے پابندی کرتے تھے[3]۔ چنانچہ قطب الدین ایبک جو سلطنت دہلی کا بانی ہے، اس سلسلے میں خاص طور پر مشہور ہے[4]۔

قطب الدین ایبک، قاضی فخر الدین کوفی جیسے متبحر عالم کا شاگرد تھا[5] اور شرع کا سخت پابند تھا[6] اور خلفاء راشدین کی پیروی کرتا تھا[7]۔ فخر مدبر نے ایبک کی عدل گستری کو ان الفاظ میں سراہا ہے :-

"عدل را بران جملہ بنا نہاد کہ باچنداں لشکرکہ درضمن رایات عالیہ بودند از ترک وغوری وخراسانی وخلجی وحشم ہندوستان از راتکان وتکران وباسعیدان وتفاریق ہیچ آفریدہ را زہرۂ آن نبود کہ برگ کاہ و نان وگوسفندی از صحرا و مرغے از آبادانی ازکسی بستدی۔ وبا خانۂ رعیتی پیج کردی۔ وسنت پادشاہ شہید راکہ مخدوم ومربی وی بود وازو آموختہ بود بعدل اقامت نمود"[8]

التمش نے انصاف ستانی کے لیے اپنے محل کے باہر زنجیر عدل لگائی تھی[9] اور یہ دیکھنے کے لیے کہ عدل گستری خاطر خواہ ہو رہی ہے یا نہیں، وہ سلطنت کے دورے بھی کیا کرتا تھا[10]۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو القضاء فی الاسلام ص۵ ۔ [2] بشیر احمد ص۹۸ ۔ [3] بشیر احمد ص۹۸۔
[4] بحد اللہ ص۵ (بحوالہ حسن نظامی)۔ نیز ملاحظہ ہو الفنسٹن (۱۹۱۶ء) ص۳۶۳ ۔
[5] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص۲۱ ۔ [6] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص۳۳، ۳۴، ۳۵ ۔
[7] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص۵۵-۶۱ ۔ [8] تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص۳۳ ۔
[9] الیٹ جلد سوم ص۵۹۱ (ابن بطوطہ)۔ [10] بشیر احمد ص۹۸ ۔ الیٹ جلد ۳ ص۵۹۱ ۔

التمش نے یہ حکم بھی دے رکھا تھا کہ جس کسی کو کوئی مضرت پہنچے، رنگین لباس پہنے[۱]۔ التمش کے دربار میں بڑے فقہا اور ماہرین قانون جمع تھے[۲]۔ اس کے بعد رضیہ[۳]، ناصر الدین محمود[۴] (۱۲۴۶ - ۱۲۶۶)، بلبن[۵]، تغلق شاہ[۶] (۱۳۲۰ - ۱۳۲۵)، فیروز شاہ تغلق[۷] وغیرہ نے عدلیانہ نظم ونسق کا بہت بلند معیار قایم کیا اور تمام سلاطین عدل گستری کو ایک مقدس مذہبی فرض سمجھتے رہے[۸]۔ بلبن نے تو خود اپنے رشتہ داروں کو بھی کسی رعایت کا مستحق نہ سمجھا۔ ایک دفعہ بلبن کے ایک بڑے درباری امیر ملک باربک نے اپنے کسی ملازم کو مار ڈالا تھا۔ جب اس کی بیوہ نے سلطان سے شکایت کی تو سلطان نے ملک باربک کو بیوہ کے سامنے اسی طرح قتل کروایا[۹]۔ بلبن نے ایک خفیہ محکمہ بھی قایم کیا تھا اور جاسوسوں کے ذریعہ محکمۂ عدلیہ کی خوبیاں وخرابیاں معلوم کرتا تھا[۱۰]۔ اگر جاسوس سلطان کو کسی معاملے کی خبر دینے میں تساہل کرتے تو ان کو سزا دی جاتی تھی[۱۱]۔ جب سیدی مولا پر بغاوت کا الزام عاید ہوا تو جلال الدین خلجی نے یہ حکم دیا تھا کہ سیدی مولا اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے آگ پر چلے۔ اس پر قاضیوں نے سلطان سے کہا کہ آگ سچ اور جھوٹ میں تمیز نہیں کر سکتی[۱۲]۔ سلطان نے قاضیوں کی بات تو مان لی لیکن سیدی مولا کو بعد میں قتل کر دیا[۱۳]۔ عوام اس واقعہ سے

۱۔ بشیر احمد ص ۹۸۔

۲۔ برنی ص ۱۱۱، ۱۱۲۔ ۳۔ منہاج ص ۱۸۱۔ نیز ملاحظہ ہو السٹن ص ۲۶۵، الیٹ جلد ۲ ص ۳۳۰۔ ۴۔ بشیر احمد ص ۹۹۔ (بحوالۂ ابن بطوطہ)۔ ۵۔ برنی ص ۳۹-۴۶۔

۶۔ برنی ص ۴۲۱۔ ۷۔ برنی ص ۵۶۵-۵۶۸۔ برگس جلد ۱ ص ۴۶۱، ۴۶۲-۴۶۴۔

۸۔ بشیر احمد ص ۹۹۔ ۹۔ محمد اللہ ص ۵۸۔ الیشوری پرشاد ص ۱۶۱۔

۱۰۔ محمد اللہ ص ۵۸۔ ۱۱۔ الیشوری پرشاد ص ۱۶۱۔

۱۲۔ برنی ص ۲۱۱۔

۱۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الیٹ جلد ۳ ص ۱۴۴ تا ۱۴۵۔

ناراض ہوئے[۱] سلطان علاؤالدین خلجی کے عدل و انصاف کے متعلق امیر خسروؒ نے لکھا ہے:۔

"و اگر از رقم نصفت ایں درگاہ سلسلہ جنبانیدہ شود آہوئے دو شاخہ قلم زنجیر برگردن شیراں معنی نہد۔ رہے عادل کہ از مہابت عدل او پیلان مست درراہ موریف کنان پائے برزمین نہادہ، و پلنگان شیر گیر پیش محراب تیغ او از صبوحی خون حیوانات توبہ کردہ۔ محتسب انصاف او چنگ و نائے شیر انگشتہ دو درز الماں سگ روئے بر انداختہ، و کاسہ سرعوانان خوک خوار نگونسار گردانیدہ، و خون جباران بزکبر[۲]"

ابن بطوطہ نے جس کو محمد تغلق[۳] نے دلی کا قاضی بنایا تھا، بہت سے واقعات کا تذکرہ کیا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سخت گیر سلطان نے بھی قانون کی عظمت قایم رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ بہ قول ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق تمام سلاطین میں سب سے زیادہ منکسر المزاج اور سب سے زیادہ عادل واقع ہوا تھا[۴]۔ ایک مقدمہ کے سلسلے میں محمد تغلق پیدل چلتا ہوا قاضی کے پاس آیا اور شیخ زادہ جامی کے خلاف شکایت کی کہ اس نے سلطان کو ظالم کہا تھا[۵]۔ ایک دفعہ محمد تغلق قاضی کے سامنے بہ حیثیت مدعی علیہ بھی آیا اور جب اس کے خلاف فیصلہ ہوا تو خوشی سے سزا قبول کی[۶]۔ کسی امیر نے قاضی کے سامنے شکایت کی تھی کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بلا وجہ سزا دی ہے۔ سلطان قاضی کے سامنے پیدل چلتا ہوا نہتہ آیا اور قاضی کو ادب سے سلام کیا۔ اتفاق سے اس مقدمے کا فیصلہ بھی

---

[۱] برنی ص۲۱۲۔ الیٹ جلد ۳ ص۱۴۶،۱۴۴

[۲] خزائن الفتوح از حضرت امیر خسروؒ دہلوی (علی گڈھ ۔ ۱۹۲۷ء) ص۱۸۔

[۳] تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر مہدی حسین: دی رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق۔

[۴] محمد اللہ ص۶۰ (ماخوذ از ابن بطوطہ)۔

[۵] محمد اللہ ص۶۰۔ [۶] قریشی ص۱۵۵،۱۵۴۔

سلطان کے خلاف صادر ہوا تو سلطان نے مدعی کو ہرجہ ادا کر دیا[1]۔ قاضی کو ہدایت تھی کہ جب سلطان عدالت میں آئے تو وہ سلطان کی تعظیم کے لیے کھڑا نہ رہے۔ ایک اور مقدمے میں کسی شخص نے سلطان پر بقایا رقم کا دعویٰ کیا تھا، سلطان فوراً قاضی کے سامنے حاضر ہو گیا اور اس کی رقم ادا کر دی[2]۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سلاطین دہلی نے انصاف کی خاطر ایک منظم محکمۂ عدلیہ قایم کیا تھا اور عدالتوں میں کھلی تحقیقات ہوتی تھی۔ ہندوستان کے باہر غالباً عدالتوں کی ایسی خاطر خواہ تنظیم نہ تھی اور نا انصافیوں کا انسداد باب نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اختیارات[3] اور ذمہ داریاں مملکت کے مختلف محکموں کے عہدہ داروں میں منقسم تھیں اور اس طرح روک تھام کا ایک نظام قایم تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض سلاطین نے قانون میں کچھ نئے عناصر بھی داخل کرنے کی کوشش کی، مثلاً علاؤالدین خلجی نے اپنے قاضی القضاۃ قاضی مغیث سے کہا تھا کہ ملک داری، و جہاں بانی علٰحدہ کار ہست و احکام شریعت علٰحدہ[4]۔ اور محمد تغلق نے بھی بعض وقت اپنے کو قانون ملک سے بالاتر سمجھنے کی کوشش کی[5] لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں بادشاہوں نے عوام کے سامنے برابر احکام شرع کی پابندی کی اور اس کا احترام کیا[6]۔ یہ سلاطین بھی شرع کے کسی اصول میں کوئی تبدیلی نہ کر سکے۔ شرع تو اس بات کو بالکل نہیں مانتی کہ حاکم وقت کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ برخلاف اس کے خود حاکم اسلام پر عدالت میں مقدمہ دائر ہو سکتا ہے اور وہ خود کسی پر مقدمہ چلا سکتا ہے[7]۔ علاؤالدین خلجی اور محمد تغلق غالباً رائے عامہ سے

---

[1]۔ قریشی ص۱۵۵۔ [2]۔ قریشی ص۱۵۵۔

[3]۔ چیکس اینڈ بیالنس۔ [4]۔ برنی ص۲۸۹۔ ملاحظہ ہو قاضی مغیث سے گفتگو برنی ص۲۸۹تا ص۲۹۴۔ نیز فرشتہ ص۱۱۱-۱۱۲۔

[5]۔ برنی ص۵۰۹-۵۱۰-۵۱۵۔ [6]۔ بشیر احمد ص۲۶۔ فرشتہ ص۱۱۰-۱۱۱۔

[7]۔ محمد تغلق بنام شیخ زادہ جامی۔ بدایونی جلد ۱ ص۲۳۹ وغیرہ۔

مجبور ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سلطان قطب الدین (۱۳۱۵ - ۱۳۴۸ء) نے ایک نا اہل شخص یعنے ضیاء الدین کو قاضی القضاۃ بنایا تو شورش ہوگئی اور قاضی اور سلطان دونوں قتل ہو گئے[1]۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یعنے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک "ضابطہ[2] مرتب ہوا اور اس کی غرض یہ تھی کہ عوام کو صحیح قانون معلوم ہوا ور اس کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔"

سلاطین اپنے مشورے کے لیے مفتیوں اور مجتہدوں کو دربار میں جگہ دیتے تھے اور یہ ماہرین قانون سلاطین کو صحیح اصول اور قوانین سے واقف کراتے تھے[3]۔ سلطان محمد تغلق نے اپنے محل میں چار مفتیوں کو مامور رکھا تھا جن کے مشورے سے وہ فصل خصومات کرتا تھا[4]۔ بہ قول برنی سلاطین کی نجات اسی میں تھی کہ وہ شرع کی پابندی کے ساتھ عدل و انصاف کرتے[5]۔ قانون کی خلاف ورزی ناممکن تھی[6]۔ علاؤ الدین خلجی کے عہد کا نقشہ کھینچتے ہوئے برنی لکھتا ہے "اُس عہد کے آخری عشرے میں مسلمان عام طور پر راست گو، حق پسند، ایمان دار، متقی اور عدل پسند تھے[7]۔"

جس طرح ابتدائی خلفائے اسلام عدالتوں کے فیصلوں کو مانتے تھے[8]، اسی طرح سلاطین دہلی نے بھی اپنے آپ کو قانون ملک اور عدالتوں کا بالکل پابند سمجھا۔ اور اگر کسی نے اس سے روگردانی بھی کی تو یہ بہت ناپسندیدہ حرکت سمجھی گئی۔ مثلاً محمد تغلق نے ایک شخص کے خلاف قاضی کی عدالت میں توہین کا مقدمہ رجوع کیا اور جب اس کے خلاف فیصلہ ہوا تو مدعی کو کسی اور بہانے سے گرفتار کر لیا۔ تمام مسلمانوں نے اسے ناپسند کیا[9]۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ عدالتوں کو فصل خصومات میں آزادی حاصل تھی۔

۱۔ برنی ص ۴۱۴، ۳۰۔ ۲۔ بشیر احمد ص ۹۹، ۱۰۰۔ ۳۔ بشیر احمد ص ۱۰۰
۴۔ محمد اللہ ص ۶۰۔ ۵۔ برنی ص ۳۹، ۴۲، ۳۵۲۔ التمش کی تقریر ص ۴۱، ۴۲۔
۶۔ برنی ص ۴۱، ۴۵۔ ۷۔ برنی ص ۳۴۱۔ ۸۔ امیر علی: اسپرٹ آف اسلام ص ۲۸۰۔
۹۔ بدایونی ص ۲۳۹۔

اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جو مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے ان کی کثرت حنفی مذہب کی پیرو تھی۔ ہندوستان میں زیادہ تر ترک آئے ہیں، اور یہ سب حنفی تھے[1]۔ ترک، خواہ غزنوی، سلجوقی، سب حنفی مذہب کے سنی تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ محمود غزنوی اور اس کے بعد غوری اور شمسی حکمرانوں نے خلیفۂ بغداد سے سند حاصل کی تھی اور یہ خلفا خود حنفی تھے۔ اگرچہ ترکستان میں اور مذاہب بھی آئے ہیں لیکن جب ہندوستان کی فتح مکمل ہوئی، اس وقت حنبلی اور شافعی نکتۂ خیال کا اثر خراسان، اور ماوراالنہر سے بہت کم ہو گیا تھا اور چونکہ ان ہی مقامات سے علما ہندوستان آتے تھے، اس لیے ان کے ساتھ حنفی مذہب آتا تھا۔ اس طریقے سے بغداد کی طرح دہلی کا سرکاری مذہب بھی حنفی تھا، اور عدالتوں کو فصل خصومات کے لیے ذیل کی کتابوں اور قوانین سے استفادہ کرنا پڑتا تھا[2]۔

(۱) قرآن مجید (۲) سنن (۳) صحابہ کرام کی متفقہ آرا، (۴) اجماع الامت۔ "الہدایہ" ایسی رایوں کے مطالعہ کے لیے بہت مقبول تھی۔ اور "فتاوی عالمگیر" کی ترتیب تک اسی سے کام لیا جاتا تھا۔ (۵) انفرادی فیصلے۔ اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کے مطابق قاضیوں کو استحسان[3]، استصلاح[4]، استصحاب کی روشنی میں کام کرنا پڑتا۔ نیز عرف[5] اور نظائر[6] کو بھی پیش نظر رکھا جاتا، اور خاص صورتوں میں سلاطین اپنے فرامین کے ذریعہ بھی کسی قانون کی توضیح کرتے یا قاضیوں کو ہدایتیں دیتے تھے[7]۔

سلاطین کے خصوصی مراعات

مسلمان حکمران کو، خواہ وہ خلیفہ ہو یا امام، یا سلطان یا شہنشاہ، قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں۔ اس کا فرض صرف اتنا ہے کہ ملک میں شرع کی پابندی کروائے لیکن عملاً طور پر دیکھا جائے تو

۱۔ دلسن ص ۲۷۔ ۲۔ بشیر احمد ص ۶۰-۶۱۔ ۳۔ مفادِ عامہ۔ ۴۔ مصلحت عامہ۔
۵۔ بشیر احمد ص ۷۰ تا ۷۲۔ ۶۔ بشیر احمد ص ۷۵۔ ۷۔ بشیر احمد ص ۷۶ تا ۷۷۔

ترکی اور ہندوستانی سلاطین نے اپنے فرامین کے ذریعہ بہت سے نئے اصول اور قوانین بنا دیئے گو ان سلاطین نے مذہبی قانون میں کوئی ترمیم نہیں کی لیکن ملکی نظم و نسق کے شعبے میں بہتیرے جدید قوانین وضع کئے۔ اور سچ پوچھئے تو خود شرعی قوانین میں بھی بعض تبدیلیاں ہوگئیں اسلام کا قانون تعزیرات تو بہت متاثر ہوا، اور اس زمانے سے جب کہ چار مذاہب پیدا ہوئے تھے مغلوں کے خاتمے تک اسلامی قانون تعزیرات اور سزاؤں کے طریقے برابر بدلتے گئے[۱]۔ سلاطین دہلی کے فرامین کی بدولت جو قانون شاہی[۲]، ترقی پاگیا، نیز زمیوں سے متعلق جو اصول اور قوانین وقتاً فوقتاً وضع ہوتے رہے، ان کو ایک طرح سے اسلامی مملکت کا "دس گن تیوم" کہا جا سکتا ہے[۳]۔

اسلامی حکمران کو یہ حق حاصل تھا کہ سزاؤں کی تخفیف کردے۔ اگر غور کیا جائے تو خلفاء راشدین نے کبھی اس قسم کا کوئی حق استعمال نہیں کیا تھا، لیکن آٹھویں صدی عیسوی میں پہلی دفعہ امیر معاویہؓ نے یہ حق استعمال کیا[۴]۔ ہندوستان میں سلاطین دہلی نے تقریباً ہر قسم کے مقدمے میں یہ حق استعمال کیا۔ چنانچہ سرقے سے لے کر قتل اور ڈکیتی وغیرہ کی سزاؤں میں بھی تخفیف کی[۵]۔ سلاطین خاص صورتوں میں عدالت ابتدائی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ طاقتور امراء کے معاملات میں سلاطین ہی کو فصل خصومات کرنا پڑتا تھا کیوں کہ یہ امرا سوائے سلطان کے کسی اور شخص کا فیصلہ نہیں مانتے تھے[۶]۔

سلطان کی حیثیت اعلیٰ ترین حاکم عدالت کی تھی، اور اس حیثیت سے وہ محکمۂ عدلیہ کی دیکھ بھال کرتے اور عدلیہ کے عہدہ داروں کا تقرر کرتے تھے تاکہ وہ ان عہدہ داروں یعنے قاضیوں کے ذریعہ انصاف رسانی کر سکیں اور شاہ انگلستان کی طرح صرف سلطان ہی عدالتیں قایم کر سکتے تھے[۷]۔

۱۔ واحد حسین صفحہ ۱۳۶۔ ۲۔ واحد حسین صفحہ ۱۳۸۔ ۳۔ واحد حسین صفحہ ۱۴۱-۱۴۲۔

۴۔ امیر علی، اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۲۸۰۔ ۵۔ بشیر احمد صفحہ ۷۹۔ ۶۔ بشیر احمد صفحہ ۸۰-۸۱۔

۷۔ مقابلہ کیجئے ہدایہ اور بلاکسٹن کی شروحات جلد ۱ صفحہ ۲۶۶۔

پروفیسر اگروال کا منصوبہ

تمہید

اچاریہ شریمان نرائن اگروال نے گاندھیتی پلان کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے گاندھی جی کے مخصوص اصولوں کے پیش نظر ہندوستان کی اقتصادی فلاح و بہبود کے لئے ایک دس سالہ منصوبہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں گاندھی جی کے معاشی تخیلات کو بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں ان ہی تخیلات کی روشنی میں ملک کی معاشی ترقی کے لئے ایک منصوبے کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس منصوبہ کو اچاریہ شریمان نرائن اگروال نے ترتیب دیا ہے لیکن یہ گاندھی کے معاشی مسلک کو پیش کرتا ہے، چنانچہ مسٹر اگروال کی خدمات کو سراہتے ہوئے خود گاندھی جی نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "انھوں نے (مسٹر اگروال نے) کسی جگہ بھی مجھے غلط طور پر پیش نہیں کیا ہے۔"

اس منصوبے میں گاندھی جی کے مخصوص فلسفۂ حیات کو پہلی مرتبہ عملی صورت دینے
ایک عملی کوشش کی گئی ہے۔ گاندھی جی نہ صرف اس ملک کی ایک بڑی اکثریت کے سیاسی قائد ہیں
بلکہ انھوں نے اپنی زندگی کو ایک خاص انداز فکر اور ایک خاص فلسفۂ حیات کا نمونہ بنا رکھا ہے
اور ان کے اس فلسفۂ حیات کو ماننے والوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ اسی لئے یہ منصوبہ ہماری
گہری فکر و توجہ کا محتاج ہے۔

پہلے ہم گاندھی جی کے معاشی فلسفہ کا مختصر سا خلاصہ پیش کریں گے تاکہ اس منصوبہ کو
سمجھنے میں آسانی ہو۔

ا۔ گاندھی جی کا معاشی فلسفہ

گاندھی کے معاشی مسلک کے چار بنیادی اصول ہیں، جن کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) سادگی:۔ گاندھی جی کے خیال میں زندگی کا مقصد دولت جمع کرنا نہیں ہے
اس کے برعکس موجودہ صنعتی نظام کا مقصد دولت جمع کرنا ہے۔ اسی لئے گاندھی جی اس
امر کے مخالف ہیں کہ ہندوستان کو ایک صنعتی ملک بنایا جائے۔ موجودہ صنعتی نظام کی ایک
خصوصیت یہ ہے کہ ضروریات زندگی کو ایک مرکزی نظام کے ذریعہ کثیر مقدار میں پیدا
کیا جاتا ہے۔ گاندھی جی پیدائش دولت کے اس طریقہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ
نہیں چاہتے کہ ہماری ضروریات زندگی ایک مرکزی نظام کے تحت پیدا ہوں بلکہ وہ
چاہتے ہیں کہ ہر شخص اپنی ضروریات آپ پیدا کرے۔ اسی لئے وہ صنعتوں کی لامرکزیت کے حامی ہیں

(۲) عدم تشدد:۔ گاندھی جی کے اس اصول زندگی سے ملک کا ہر پڑھا لکھا شخص
واقف ہے۔ نہ صرف سیاسی مسائل میں بلکہ معاشی مسائل میں بھی وہ اپنے اس عقیدہ کے
سختی کے ساتھ پابند ہیں۔ معاشی معاملات میں عدم تشدد کی پابندی کا مطلب یہ ہے
اپنے فائدہ کی خاطر کسی دوسرے کا نقصان یا استحصال نہ کیا جائے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ
نظام کی ایک خرابی یہ ہے کہ اس کی بنیاد استحصال ناجائز پر رکھی گئی ہے۔ دولت مندان

یب طبقہ کا استحصال کرتا ہے اور ایک دولت مند ملک دوسرے ملک کو لوٹنا چاہتا ہے۔
ندھی جی کے نزدیک یہ سب تشدد کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۳) محنت کی بڑائی :۔ گاندھی جی کے خیال میں قانون فطرت یہ ہے کہ ہم اپنے ت و بازو سے کام کریں تاکہ ہر شخص خود مکتفی ہو۔ موجودہ معاشی تباہی کی ایک وجہ یہ ہے کہ انسانوں کا ایک طبقہ، دوسرے طبقہ کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ جس کی جہ سے ایک طرف دولت مندوں کی ایک بے کار جماعت پیدا ہوگئی ہے اور دوسری ان مزدوروں کی ایسی جماعت بن گئی ہے جو اپنی ضرورت سے زیادہ کام انجام دیتی ہے۔ ندھی جی محنت کی بڑائی کے پرچار کے ذریعہ اس خلیج کو پاٹ دینا چاہتے ہیں۔

(۴) معاشیات و اخلاقیات کی ہم آہنگی :۔ گاندھی جی کا چوتھا اصول یہ ہے کہ معاشیات و اخلاقیات میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔ ینگ انڈیا مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں وہ لکھتے ہیں "میں معاشیات و اخلاقیات میں کوئی تفریق نہیں کرتا جس معاشیات سے کسی شخص، یا قوم کے اخلاق پر ضرب لگتی ہے، تو وہ معاشیات بد اخلاقی ہے، اور اسی لئے ایک گناہ ہے۔"

معاشئین کا ایک عام اصول یہ ہے کہ "اس بازار سے خرید و جہاں چیزیں سستی بکتی ہیں اور اس بازار میں بیچو جہاں مہنگی بکتی ہیں۔" گاندھی جی اس اصول کے قائل نہیں ہیں اور اسی لئے انھوں نے سودیشی تحریک شروع کی تھی۔

مغربی معیشت کی روح رواں زر اور منافع ہے لیکن گاندھی جی کے یہاں اصلی قدر و قیمت انسان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "آدمی ہی سب کچھ ہے اور زندگی روپیہ پیسہ سے بڑھ کر ہے۔" اور اسی بنا پر انھوں نے کھدر کی تحریک شروع کی ہے۔ ہریجن مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۳۴ء میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "کھادی کی معیشت موجودہ معیشت سے بالکل جداگانہ ہے۔ موجودہ معیشت میں انسانی عنصر کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی مگر کھادی کی معیشت میں انسانی عنصر ہی سب کچھ ہے۔" ہریجن مورخہ ۹ فروری ۱۹۳۴ء میں وہ ایک

اور جگہ لکھتے ہیں کھادی سے انسانی قدر وقیمت کا اظہار ہوتا ہے اور گرنی کے کپڑے سے دھات کی قدر وقیمت کا اظہار ہوتا ہے۔"

الغرض سادگی، عدم تشدد، محنت کی بڑائی، اور معاشیات و اخلاقیات کی ہم آہنگی، ان ہی چار اصولوں پر گاندھی جی نے اپنے معاشی تصورات کی تعمیر کی ہے، جس میں گھریلو صنعتیں اور خود مکتفی دیہاتوں کو اہمیت دی گئی ہے۔

ہندوستان کا قدیم دیہاتی نظام

اپنے ان ہی تصورات کے پیش نظر گاندھی جی ہندوستان کے قدیم دیہاتی نظام کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کے قدیم دیہاتوں میں ایک متوازن معاشی و معاشرتی و سیاسی نظام رائج تھا۔ اس نظام میں نہ تو بالکلیہ انفرادی آزادی تھی اور نہ ہی حکومت کی جابرانہ نگرانی تھی۔ یہاں امداد باہمی کی بنیاد پر ایک ایسا زرعی وصنعتی نظام ترقی کر چکا تھا، جس میں دولت مند، غریبوں کا استحصال نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں کے معاشرتی نظام کی بنیاد عدم تشدد اور برادرانہ اخوت پر مبنی تھی، اور سیاسی نقطۂ نظر سے ان دیہاتوں میں حقیقی جمہوریت کی روح کار فرما تھی۔

گاندھی جی اس دیہاتی نظام کا احیاء اس لئے بھی چاہتے ہیں کہ انھیں بڑے پیمانہ کی صنعتوں اور مشینوں سے نفرت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہی صنعتیں اور مشینیں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کا باعث ہے۔ اور ان خرابیوں کا سدباب اشتراکیت سے بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ فساد کی جڑ یہی مشینیں ہیں۔ یہ واضح رہے کہ گاندھی جی ہر قسم کی مشینوں کے مخالف نہیں ہیں کیونکہ چرخہ خود بھی ایک قسم کی مشین ہے۔ اصل میں وہ ان بڑی بڑی مشینوں کے مخالف ہیں جو آدمیوں کے ہاتھوں سے کام چھین لیتی ہیں۔ ہریجن مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۴ء میں وہ لکھتے ہیں "مشین کا استعمال وہیں مناسب ہے جہاں کام زیادہ ہو اور کرنے والے کم ہوں لیکن جہاں کام کم ہو اور کرنے والے زیادہ ہوں وہاں مشین کا استعمال ایک برائی ہے۔

ہندوستان میں یہی صورت پائی جاتی ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ ہم اپنی کثیر آبادی کے لئے لمحات فرصت کیسے نکالیں بلکہ ہمارے لئے حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے بھائیوں کے بے کار اوقات کو، جن کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہوتی ہے، کس طرح کام میں لایا جائے"۔ ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں "مردہ مشین کا استعمال کیوں ہو جب کہ ہمارے ہاں لاکھوں کی تعداد میں زندہ مشینیں موجود ہیں جو سات لاکھ دیہات میں پھیلی ہوئی ہیں؟"۔ تاہم گاندھی جی نئی ایجادات کے مخالف نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں "میں ہر اس ایجاد کا خیر مقدم کرتا ہوں، جو ہر ایک کے فائدہ کے لئے ہو"۔ بہر حال گاندھی جی چونکہ مشینوں اور بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے مخالف ہیں اسی لئے وہ قدیم دیہاتی نظام کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔

گھریلو صنعتوں کا احیاء

حسب ذیل وجوہات کی بناء پر گاندھی جی گھریلو صنعتوں کو رائج کرنا چاہتے ہیں:۔

(۱) گھریلو صنعتوں سے بے روزگاری کا انسداد ہو سکتا ہے۔ ۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تقریباً دو کروڑ آدمی بالکلیہ بے کار تھے۔ یہ تعداد ان لوگوں کے ماسوا ہے جن کے پاس زمینات نہیں ہیں یا جن کے پاس غیر معاشی کھیت ہیں۔ ہمارے ملک میں ۹ فیصد اشخاص زراعت اور اس کے متعلقہ کاروبار میں مشغول ہیں۔ آبادی کا دس فیصد حصہ صنعت و حرفت میں لگا ہوا ہے جس میں صرف دو ملین اشخاص بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں کام کر رہے ہیں۔ اگر بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو پوری طرح ترقی دی بھی جائے تو اس میں پوری آبادی کا صرف پانچ فیصد حصہ کھپ سکتا ہے۔

چھوٹی صنعتوں میں جو اشخاص مصروف ہیں، ان کی تعداد بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں مشغول شدہ اشخاص سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ گذشتہ بیس سال میں کارخانوں کی تعداد میں چار گنا اضافہ ہوا ہے مگر ان صنعتوں میں جو اشخاص مشغول ہیں، ان کا تناسب پوری آبادی سے متواتر گھٹتا گیا۔ ذیل کے اعداد سے ان کی وضاحت ہوتی ہے:۔

سنہ	بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں مشغول شدہ آبادی کا تناسب فیصد
۱۹۱۱ء	۵٫۵ فیصد
۱۹۲۱ء	۴٫۹ "
۱۹۳۱ء	۴٫۳ "
۱۹۴۱ء	۴٫۲ "

ان اعداد پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں سے خواہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ہوں یا اشتراکی نظام کے تحت، بے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے گاندھی جی بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی بجائے گھریلو صنعتوں کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔

(۲) تقسیم دولت کے نقطۂ نظر سے بھی گاندھی جی بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے مخالف ہیں۔ ہریجن مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۳۴ء میں وہ لکھتے ہیں "یہ تسلیم کرنے کے بعد بھی کہ مشین کے ذریعہ تمام لوگوں کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں، پھر بھی اس کی وجہ سے پیدائش دولت چند خاص رقبوں میں مخصوص، ہو جائے گی۔ اور دولت کی تقسیم میں ایک نظم پیدا کرنے کے لئے تمھیں پیچیدہ طریقے اختیار کرنے پڑیں گے لیکن اگر پیدائش اور تقسیم دولت وہیں ہو جہاں اشیاء کی ضرورت ہے تو پھر دولت کی خود بخود با ضابطہ طریقہ سے تقسیم ہو گی۔ اور اس طرح دھوکہ بازی کے لئے کوئی موقعہ اور سٹہ بازی کے لئے کوئی گنجایش نہیں رہے گی۔"

(۳) دفاعی نقطۂ نظر سے بھی بڑے پیمانہ کی صنعتیں مفید نہیں ہیں۔ بڑے بڑے صنعتی کارخانوں پر آسانی کے ساتھ بمباری کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے اب جاپان و برطانیہ وغیرہ میں صنعتی لامرکزیت پر زور دیا جا رہا ہے۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی وجہ سے مصارف پیدائش بہت کم لاحق ہوتے ہیں۔ اور دستی صنعتوں کے اخراجات پیدائش نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ایک وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے اخراجات زیادہ بھی ہوتے ہیں۔

ان کی وجہ سے غلیظ آبادیاں پھیلتی ہیں صنعتی جھگڑے ہوتے ہیں۔ ان کو مصارف پیدائش میں شامل کرنا چاہئے، یہ ایسے مصارف ہیں جن کا بار کسی ایک کارخانہ پر نہیں بلکہ پورے سماج پر پڑتا ہے۔ اسی لئے گاندھی جی پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے مخالف ہیں وہ ہریجن مورخہ ۲۰ جون ۱۹۳۶ء میں لکھتے ہیں "کھادی کا ایک گز کپڑا اگرچہ ملی کے بنے ہوئے کپڑے سے اگرچہ مہنگا رہے گا، لیکن بحیثیت مجموعی اور دیہاتیوں کے نقطۂ نظر سے یہ بہت زیادہ سستا رہے گا"۔

بڑے پیمانہ کی صنعتوں اور مشین کی ان برائیوں کے باعث وہ قدیم دیہاتی نظام اور گھریلو صنعتوں کا احیاء کرنا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں قدیم دیہاتی نظام اور گھریلو صنعتوں کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے ان کے پاس بعض مثبت دلائل بھی ہیں۔

(۱) عمرانیات کا ایک مسلمہ مسئلہ یہ ہے کہ شہریوں کا تولیدی مادہ دیہاتیوں کی بہ نسبت کم ہوتا ہے۔ اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ شہروں کی آبادی گنجان ہوتی ہے اور پھر یہاں نفسیاتی خواہشات کو پورا کرنے کے دیگر طریقے بھی میسر آتے ہیں جس کی وجہ سے شرح پیدائش میں کمی ہوتی ہے۔

(۲) بین قومی امن کے نقطۂ نظر سے بھی چھوٹی صنعتوں کا احیا ضروری ہے۔ بڑی صنعتوں کی نکاسی کے لئے بیرونی بازاروں کو تلاش کرنا پڑتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے مختلف ممالک کے مابین معاشی کشمکش شروع ہو جاتی ہے، جو بالآخر جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسی لئے گاندھی جی بڑی صنعتوں کے مخالف اور گھریلو صنعتوں کے حامی ہیں۔ چنانچہ وہ ۲۹ اگست ۱۹۳۶ء کے ہریجن میں لکھتے ہیں "کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اگر ہندوستان کو ایک صنعتی ملک بنا دیا جائے تو پھر ہمیں ایک نادر شاہ کی ضرورت ہوگی، جو دوسرے ممالک فتح کرے تاکہ ہم ان کا معاشی استحصال کریں۔ پھر ہم کو برطانیہ، جاپان، امریکہ، روس، اٹلی کی بحری و بری حربی طاقتوں سے مسابقت کرنی پڑے گی"۔

یہ وہ مختلف وجوہات ہیں جن کی بناء پر گاندھی جی قدیم دیہاتی نظام اور گھریلو صنعت کو

دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان ہی کے ذریعہ اپنے معاشی تصورات کو عملی شکل دینا چاہتے ہیں۔

گاندھی جی کے ان متذکرہ بالا معاشی تصورات کی روشنی میں ہم پروفیسر اگروال کے "منصوبہ" کا مطالعہ کریں گے۔

(۲)

اگروال کے منصوبہ کا خلاصہ

منصوبے کے مقاصد

اس منصوبہ کا اہم مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی عوام کی مادی اور ثقافتی خوش حالی کے لئے عملی تدابیر پیش کی جائیں۔ اس میں تمام تر توجہ دیہاتوں کو خوش حال بنانے پر صرف کی گئی ہے اسی لئے زراعت اور دیہی مصنوعات کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ بنیادی یا کلیدی صنعتوں کے قیام اور ترقی کے متعلق بھی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

منصوبہ کے ابتدائی حصہ میں ایک معمولی معیار زندگی کی ضروریات کا تعین کیا گیا ہے۔ اور پھر ہندوستان کی قومی آمدنی پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان اپنی موجودہ قومی آمدنی کے پیش نظر ایک معمولی معیار زندگی بھی برقرار نہیں رکھ سکتا۔

بنیادی ضروریات

ایک معمولی معیار آسائش و تہذیب کے لئے حسب ذیل بنیادی ضروریات کا مہیا کرنا ضروری ہے :-

(۱) متوازن صحت بخش غذا جس میں پروٹین، کاربوہیڈریٹ، چربی، معدنی اجزا اور حیاتین شامل ہوں۔

(۲) ایسا لباس جس سے موسمی تکالیف دور ہو سکیں۔
(۳) مکان۔ ایک آدمی کے لئے کم از کم سو مربع فیٹ کی جگہ ضروری ہے۔
(۴) ہر بچہ کے لئے لازمی، مفت، ابتدائی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کا انتظام۔
(۵) طبی سہولتیں، ہر مرد اور عورت کے لئے طبی سہولتوں کی فراہمی اور عورتوں کے لئے زچگی خانوں کا انتظام۔
(۶) تمام باشندوں کے لئے افادی خدمات مثلاً ڈاک، بنک، بیمہ وغیرہ کی فراہمی۔
(۷) تفریح کے لئے مناسب انتظامات۔

ہندوستان کی قومی آمدنی

ہندوستان کی قومی آمدنی کے متعلق مختلف تخمینے کئے گئے ہیں۔ مگر ان تخمینوں سے صحیح صورت حال کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ان تخمینوں کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں ایک طرف لکھ پتی اور کروڑپتی حضرات کی آمدنی شامل ہے تو دوسری طرف غریبوں اور ناداروں کی کمائی کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک فیصد آبادی ایسی ہے جو جملہ قومی آمدنی کے ۳۵ فیصد کی مالک ہے اور ۳۲ فیصد آبادی کے قبضہ میں جملہ قومی آمدنی کا ۳۳ فیصد حصہ ہے۔ اور بقیہ ۶۷ فیصد آبادی جملہ قومی آمدنی کے ۳۲ فیصد کی مالک ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم پورے ملک کی قومی آمدنی کا ایک ہی اوسط تخمینہ قائم کریں تو اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ پروفیسر جے۔ سی کمارپا نے صوبہ متوسط و برار کی صنعتی تحقیقاتی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس صوبہ کی سالانہ قومی آمدنی فی کس ۱۲ روپیہ ہے۔ صوبہ متوسط چونکہ ایک غریب صوبہ ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی ۹۰ فیصد آبادی (جو دیہاتوں میں رہتی ہے) کی سالانہ قومی آمدنی فی کس ۱۸ روپیہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ آمدنی دیگر ممالک کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک اقل ترین معیار زندگی کے لئے کتنی آمدنی کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر اکرائڈ کے تخمینہ کے مطابق غذا کے لئے ہر مہینہ ۶ روپیہ فی کس کی ضرورت ہے۔ دیہات میں بجائے ۶ روپیہ کے ۵ روپیہ ضرورت ہوگی، گویا غذا کے لئے سالانہ ۶۰ روپیہ فی کس درکار ہوں گے۔ اگر لباس کا صرف ۲۰ گز سالانہ رکھا جائے اور قیمت فی گز ۳ ر ہو تو جملہ ۳ روپیہ ۱۲ آنہ فی کس درکار ہوں گے۔ اسی طرح مکان وطبی ضروریات وغیرہ کے لئے فی کس سالانہ اخراجات کا تخمینہ ۸ روپیہ ہوگا۔ اس طرح جملہ ۷۲ روپیہ فی کس سالانہ کی ضرورت ہوگی لیکن ہندوستانی دیہاتیوں کی فی کس سالانہ آمدنی ۱۸ روپیہ ہے۔ گویا ایک اقل معیار زندگی کو حاصل کرنے کے لئے موجودہ آمدنی کو چوگنا کرنا پڑے گا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کرنی پڑیں گی۔

دیہی تنظیم

دیہی تنظیم کا مقصد یہ ہوگا کہ دیہاتوں کو خود مختار بنایا جائے، یعنے قدیم دیہی پنچایتوں کو بعض مناسب تبدیلیوں کے ساتھ ازسرنو زندہ کیا جائے گا۔ ان کے اپنے اندرونی نظم ونسق کی حد تک یہ پنچایتیں خود مختار ہوں گی اور اپنی بنیادی ضروریات زندگی کی حد تک خود مکتفی ہوں گی۔

دیہی پنچایتوں کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:-

(۱) گاؤں کی مالگزاری کا تعین کرنا اور مالگزاری وصول کرنا۔

(۲) مقامی پولس کے ذریعہ گاؤں کے امن وامان کا قیام۔

(۳) مقامی جھگڑوں کا ثالثی وصلح کے ذریعہ تصفیہ کرنا۔

(۴) بنیادی تعلیم اور تعلیم بالغان کا انتظام کرنا۔

(۵) طبی سہولتوں کی فراہمی۔

(۶) صفائی، عمارات، سڑکوں، تالابوں و باولیوں وغیرہ کی حفاظت، اور ان کی تعمیر و مرمت کا انتظام کرنا۔

(۷) امداد باہمی کے ذریعہ گاؤں کی زراعت کو ترقی دینا۔

(۸) گاؤں کی تجارت، صنعت وحرفت کا انتظام کرنا اور اس غرض کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں قائم کرنا۔

(۹) خام پیداوار اور اشیائے صرف کی خریدی کے لئے امداد باہمی کے ذریعہ انتظامات کرنا اور زرعی پیداوار و دیہی مصنوعات کی نکاسی کا انتظام کرنا۔

زراعت

زراعت کی ترقی کے لئے حسب ذیل امور پیش نظر رکھے جائیں گے:۔

(۱) زرعی ترقی کا اصلی مقصد یہ ہوگا کہ دیہی آبادی کے لئے متوازن اور مناسب غذا فراہم کی جائے۔

(۲) زمینات وموسم کے اختلافات کے لحاظ سے ملک کے مختلف حصوں میں اجناس کی کاشت کی منصوبہ بندی بھی مختلف ہوگی۔

(۳) حتی الامکان غذائی اجناس اور خام پیداوار کی حد تک ملک کو خودمکتفی بنایا جائیگا۔ اور صرف وہی اجناس برآمد کی جائیں گی جو اندرونی استعمال سے بچ رہیں۔

(۴) نقدی اجناس کی کاشت میں کمی کی جائے گی کیونکہ ان کی وجہ سے ہمیں بیرونی بازارات کا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔

(۵) حکومت کی جانب سے زرعی تحقیقات کا کام کیا جائے گا اور اس غرض سے تجرباتی مزرعے قائم کئے جائیں گے۔

ملک میں غذا کی قلت ہے۔ ڈاکٹر مکرجی کی تحقیقات کے مطابق ہمارے ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ افراد کو غذا نہیں ملتی۔ پھر ہندوستان میں بمقابل دیگر ممالک کے اجناس کی پیداوار کم ہوتی ہے۔

پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے بعض انقلابی تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی مثلاً (۱) زمینات کو تو میانا پڑے گا (۲) موضع واری مالگزاری کا طریقہ رائج کرنا پڑے گا۔

موضع واری مالگزاری کا طریقہ:۔

زمینداری طریقہ جاگیردارانہ نظام کی پوشیدہ یادگار ہے۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے رعیت واری طریقہ اس لئے نافذ کیا کہ حکومت کسانوں سے راست تعلقات پیدا کرکے زیادہ سے زیادہ مالگزاری وصول کرنا چاہتی تھی لیکن ہندوستانی مفاد کے پیش نظر مناسب یہ ہے کہ موضع واری بند وبست ہوا ور پورا موضع مشترکہ طور پر مالگزاری کی ادائی کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ اور مالگزاری کا تعین پٹواری نہ کرے بلکہ دیہی جماعت کرے۔ دیہی پنچایت کسانوں کو زمینات "قول" پر دے گی اور جب تک کسان مالگزاری ادا کرتا رہیگا وہ اس زمین سے استفادہ کرسکے گا۔ موجودہ شرح مالگزاری میں تخفیف کی جائے گی۔ مالگزاری کی بقایا رقم کو اسی طرح حاصل کیا جائے گا جس طرح قرضے وصول کئے جاتے ہیں۔ اس کے لئے کسانوں کو زمینات سے بے دخل نہیں کیا جائے گا۔ مالگزاری کا ایک مقررہ حصہ مثلاً ½ یا ⅛ نقدی کی صورت میں نہیں بلکہ اجناس کی صورت میں لیا جائے گا۔ اس کی وجہ سے حکومت کو تھوڑی بہت دشواری تو ہوگی لیکن کسان کے نقطۂ نظر سے یہ طریقہ بہت مفید ہے کیونکہ قیمتوں کے تغیرات سے مالگزاری میں بھی تغیرات ہوتے ہیں۔ اور اگر مالگزاری نقدی کی صورت میں وصول کی جائے تو کسانوں کو مجبوراً اپنی پیداوار فروخت کرکے مالگزاری ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ سے ایک طرف تو ان کو اپنی پیداوار کی کم قیمت وصول ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ مہاجنوں کے پنجہ میں پھنس جاتے ہیں۔ اگر مالگزاری کا ایک حصہ اجناس کی صورت میں وصول کیا جائے تو کسان کی ان دشواریوں میں کمی ہوگی۔

زمینات کو قومیانا:۔ موضع واری بند وبست کے نفاذ سے موجودہ قرضداریوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ حکومت ان ہی لوگوں کو زمینات دے گی جو خود کاشت کرتے ہوں اور یہ زمینات وراثتاً منتقل ہوتی رہیں گی۔ پھر بھاری زمیندار کا وجود نہیں ہوگا۔ اور جن لوگوں کو اس وقت حقوق ملکیت حاصل ہیں، ان کے حقوق کو آہستہ آہستہ ختم کیا جائے گا اور ان کو ان کی زمینات کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں محصول وراثت اور

محصول اموات لگاکر بھی زمینات کو تو میایا جائے گا۔

تقسیم و انتشار اراضی :۔ یہ ہماری زراعتی پستی کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ اس کے انسداد کے لئے حسب ذیل تدابیر اختیار کی جائیں گی :۔

(۱) اختیاری طور پر انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ اراضیات کا اتصال عمل میں لایا جائے گا۔

(۲) امداد باہمی کے طریقہ پر کاشت کی جائے گی۔

(۳) طریقۂ وراثت میں تبدیلی کی جائے گی۔ مثلاً ایسے قوانین بنائے جائیں گے، جن کی رو سے ایک مقررہ مدت کے بعد زمینات کی تقسیم کو روک دیا جائے گا۔

زرعی قرضداری :۔ زرعی اصلاح کا یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ گاندھیائی منصوبے کے تحت اس کے انسداد کے لئے حسب ذیل تدبیریں اختیار کی جائیں گی :۔

(۱) قرض کے سارے حسابات کی جانچ پڑتال خاص مجالس کے ذریعہ کی جائے گی۔ فرضی قرضوں کو ختم کر دیا جائے گا۔

(۲) جس قرض کی مدت دس سال سے زائد ہوگئی ہو اور جس پر متواتر سود ادا ہوتا رہا ہو، اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ قرض گویا کہ ادا ہوگیا۔

(۳) حکومت ان قرضوں کی ادائی کے لئے یہ انتظام کرے گی کہ بیس سالہ تمسکات جاری کرکے مہاجنوں کو دے گی اور رعایا سے یہ کہے گی کہ وہ اپنے قرضے بیس سال کی مدت میں بالاقساط ادا کر دے۔

(۴) دیہی پنچایتوں، انجمن ہائے امداد باہمی اور زمین گروی بنکوں کے ذریعہ طویل مدتی قرضے آسان شرائط پر مہیا کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ اور شرح سود کسی صورت میں چھ فیصد سے زائد نہ ہوگی۔

(۵) خانگی طور پر قرضے دینے کی ممانعت کی جائے گی۔ صرف دیہی پنچایتیں انجمن ہائے امداد باہمی اور زمین گروی بنک قرضے دیا کریں گے۔

(۲) قرضوں کی ادائی کے سلسلہ میں زمینات کی منتقلی پر موانعات عائد کئے جائیں گے۔

افتادہ زمینات :۔ ہمارے ملک میں قابل کاشت افتادہ زمینات کا رقبہ ۷ کروڑ ایکڑ ہے۔ ان زمینات کو خانگی طور پر قابل کاشت نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ آب وہوا خراب ہے، ذرائع حمل ونقل کی دقتیں ہیں اور پھر اصل کی قلت بھی ہے۔ اسی لئے حکومت کو چاہئے کہ ان زمینات کو زیر کاشت لائے۔

علاوہ ازیں زمینات کے کٹاؤ کا انسداد بھی ضروری ہے۔

آبپاشی :۔ زیر کاشت رقبہ کا صرف ۲۳ x فی صد حصہ زیر آبپاشی ہے۔ اس لئے آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچائی ہوں گی۔

کھاد :۔ دیہات میں گوبر کو عموماً جلانے کے کام میں لایا جاتا ہے، اگر افتادہ زمینات پر موضع کے قریب جنگل لگائے جائیں تو جلانے کے لئے لکڑی آسانی سے مل سکے گی اور گوبر کو بجائے جلانے کے کھاد کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ حکومت کو چاہئے کہ کیمیائی کھاد بنانے کے کارخانے کھولے۔

مشنری کا استعمال :۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مشنری کے استعمال سے کفایت ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں تقسیم وانتشار اراضی کے باعث مشنری کا استعمال ممکن نہیں۔

گائے کی حفاظت :۔ اگروال کے منصوبہ میں گایوں کی پرورش و نگہداشت پر زور دیا گیا ہے۔ زرعی کاروبار میں مشنری کا استعمال ہمارے حالات کے لحاظ سے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے جانوروں کی حفاظت ضروری ہے۔ گایوں کی پرورش و نگہداشت عمدہ طریقہ پر ہو تو ہمیں دودھ بھی حاصل ہوتا ہے، کھاد بھی ملتی ہے اور بیل بھی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ بھینسوں کی پرورش سے اتنے فوائد حاصل نہیں ہوتے۔ اول تو بھینسے زرعی کاروبار کے لئے موزوں نہیں ہوتے، پھر ان پر بیماری کا حملہ نسبتاً جلد ہوتا ہے اور ان کی نگرانی وحفاظت کے لئے خاص اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہتر آلات زراعت وعمدہ تخم :۔ موجودہ آلات ناقص ہیں اور تخم بھی ادنیٰ قسم کے

استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ان دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

زرعی بیمہ:۔ حکومت کو چاہئے کہ قحط، طوفان، قلت بارش اور بیماریوں وغیرہ سے تحفظ کے لئے زرعی بیمہ کی سہولتیں بہم پہنچائے۔

امداد باہمی:۔ جب دیہی پنچایتوں کو از سرِ نو زندہ کیا جائیگا تو انجمن ہائے امداد باہمی کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔

یہاں تک وہ تدبیریں بیان کی گئی ہیں جو گاندھیائی منصوبے کے مطابق زراعت کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اختیار کی جائیں گی۔ اس کے بعد اس منصوبے میں زراعت سے متعلقہ صنعتوں کی طرف توجہ کی گئی ہے۔

زراعت سے متعلقہ صنعتیں

افزائش مویشی:۔ ہندوستان میں مویشیوں کی تعداد زیادہ ہے مگر ان کی حالت خراب ہے۔ چارہ کی قلت، افزائش نسل کی طرف سے لاپرواہی، ضمنی صنعتوں کا فقدان، مویشیوں کی خراب حالت کے ذمہ دار ہیں۔ اس لئے چراگاہوں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہئے۔ افزائش نسل کے لئے طاقتور اور اچھے سانڈ فراہم ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ ضمنی صنعتیں مثلاً شیر خانہ، دباغت چرم اور ہڈی کی کھاد بنانے کے کارخانے کھولے جائیں۔

شیر خانے:۔ اگر اس صنعت کو عمدہ طریقوں پر چلایا جائے تو اس سے نہ صرف کسانوں کی آمدنی بڑھے گی بلکہ انہیں عمدہ غذا بھی ملے گی۔ دودھ کی پیدائش کے لحاظ سے امریکہ کے بعد ہندوستان کا نمبر ہے۔ یہاں برطانیہ سے چوگنا اور ڈنمارک سے پانچ گنا زیادہ دودھ حاصل ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستان میں دودھ کے فی کس استعمال کا اوسط بہت کم ہے یعنی صرف ۷ اونس فی کس۔ ڈاکٹر رائٹ کے تخمینے کے مطابق اس مقدار کو کم سے کم دگنا کرنا چاہئے۔ اسی لئے دیہات و شہروں میں امداد باہمی کے اصول پر شیر خانے کھولنے چاہئیں۔ گاؤ سیوا سنگھ نے سیوا گرام میں گاندھی جی کی نگرانی میں اس صنعت کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔

اس سنگھ کے تخمینہ کے لحاظ سے ایک شیر خانہ میں پچاس گائیں ہونی چاہئیں اور گائیوں کو بھینسوں کے مقابلہ میں ترجیح دینی چاہئے، کیونکہ گائے زیادہ دودھ دیتی ہے اس کے سوکھنے کا زمانہ بھی کم ہوتا ہے، گرمی و سردی کے اثرات بھی اس پر کم ہوتے ہیں اور پھر اس کے دودھ میں حیاتین کی زیادہ مقدار ہوتی ہے۔

دباغت و چمڑے کی صنعتیں :۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں ہر سال ایک کروڑ ۳۰ لاکھ جانور مر جاتے ہیں۔ گاؤں میں جب جانور مرتا ہے تو مالک پر مصیبت آجاتی ہے۔ چمار چمڑا تو خرید لیتے ہیں مگر بقیہ سامان پڑا رہتا ہے۔ یہ چمار دیسی طریقہ پر دباغت کا کام کرتے ہیں۔ دباغت کا کام کیمیائی طریقہ پر انجام دیا جانا چاہئے اور جانور کے بال، ہڈی اور دانت کو بھی کام میں لانا چاہئے۔ "تلوادی آشرم" کے نام سے واردھا میں دباغت کا ایک کارخانہ قائم ہے جہاں مفید تجربے کئے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہر بڑے گاؤں میں دباغت کا کارخانہ قائم ہونا چاہئے۔

باغبانی :۔ ہمارے ملک میں باغبانی کی طرف توجہ نہیں کی جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔

جنگلاتی صنعتیں :۔ اس سلسلہ میں تحقیقات کی ضرورت ہے تاکہ کاغذ، ہیتیل اور گوند وغیرہ کی صنعتیں چلائی جاسکیں۔

دیہی صنعتیں

کھادی :۔ اس صنعت کے احیاء کے سلسلہ میں گاندھی جی کی مساعی کو بھلایا نہیں جا سکتا اور کل ہند اسپنرس اسوسی ایشن نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ کھادی کی صنعت کو دوبارہ زندہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کو زراعت کے تحت ایک ضمنی صنعت کی حیثیت دی جائے تاکہ کسان کی زندگی خود مکتفی ہو جائے۔ اگر ہر ایک تندرست دیہاتی روزانہ ایک گھنٹہ کھادی بنے تو دیہات کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔

کاغذ سازی :- کل ہند انجمن مصنوعات دیہی اس سلسلہ میں کوشاں ہے۔ اس صنعت کو رائج کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دستی کاغذ مشینی کاغذ سے مقابلہ کرے بلکہ دستی کاغذ ہماری دیہاتی ضروریات کو پورا کرے۔

تیل :- اگر اس صنعت کو ترقی دی جائے تو اس سے نہ صرف کسانوں کی آمدنیوں میں اضافہ ہوگا بلکہ انہیں عمدہ تیل بھی حاصل ہوگا کیونکہ کھانے کا تیل مشنری کے تیل کی بہ نسبت اچھا ہوتا ہے۔ کل ہند انجمن مصنوعات دیہی نے اس سلسلہ میں مختلف تجربے کئے ہیں، اور تیل نکالنے کا ایک اچھا آلہ دریافت کیا ہے۔

دھان صاف کرنے کی صنعت :- گرنیوں میں چاول کو صاف کرنے کی وجہ سے چاول کے غذائی اجزا خراب ہو جاتے ہیں اس لئے دیسی طریقہ پر دھان صاف کرنے کی صنعت کا احیاء ضروری ہے۔ گرنیوں کی تعداد بڑھ جانے کے باعث بہت سے لوگ بے روزگار بھی ہو گئے ہیں، اس لئے حکومت کو چاہئے کہ گرنیوں کی تعداد کو بڑھنے نہ دے۔

دیگر دیہی صنعتیں :- دیگر دیہی صنعتوں مثلاً گڑ سازی، شہد سازی، صابن سازی، رسی سازی، مرغبانی، دیاسلائی اور چوڑی سازی وغیرہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے۔

اس منصوبے کے تحت قومی حکومت گڑ سازی اور آٹے کی طرف زیادہ توجہ کرے گی، کیونکہ گڑ صحت کے لئے بہ نسبت شکر کے مفید ہے اور چکی کے آٹے میں نسبتاً زیادہ حیاتین ہوتے ہیں۔

سرکاری امداد :- حکومت حسب ذیل طریقوں سے دیہی صناعوں کی امداد کرے گی۔

(۱) انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ آسان شرح سود پر قرضوں کی فراہمی۔

(۲) مناسب صنعتی تعلیم کا انتظام۔

(۳) دیہی مصنوعات کو ترقی دینے کے لئے تحقیقی کام۔

(۴) گاؤں میں پیدا نہ ہونے والی خام پیداوار کی خریداری کے لئے اجتماعی تنظیم۔

(۵) انجمن ہائے امداد باہمی برائے فروخت پیداوار کا قیام کرکے

دیہی مصنوعات کی شہروں میں نکاسی ہو۔
(۶) حکومت چھوٹی دیہی صنعتوں کی بڑے پیمانہ کی صنعتوں سے مسابقت ہونے دیگی۔
(۷) ریلوں اور جہازوں کے ذریعہ حمل ونقل میں رعایت۔
(۸) بڑی صنعتوں پر محاصل عائد کر کے چھوٹی صنعتوں کو مدد دی جائے گی۔

یہاں تک تو زراعت اور دیہی مصنوعات کی ترقی کے متعلق مختلف تجویزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بنیادی صنعتوں کے متعلق بھی گاندھیائی منصوبے میں ایک مفصل لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے۔

بنیادی صنعتیں

آزاد ہندوستان میں چند بنیادی صنعتوں کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ سے گھریلو صنعتوں کو نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہوگا۔ یہ صنعتیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) دفاعی صنعتیں:۔ اگرچہ گاندھی جی عدم تشدد کے حامی ہیں مگر آزاد ہندوستان میں مسلح فوج کے رکھنے سے انہیں انکار نہیں ہے۔
(۲) برقی صنعت۔
(۳) معدنیات۔
(۴) مشنری۔
(۵) بھاری انجینیری کی صنعتیں، مثلاً ہوائی جہاز و جہاز سازی، خود حرکی انجنیں وغیرہ
(۶) بھاری کیمیائی صنعتیں۔

سرکاری ملکیت:۔ گھریلو و دیہی صنعتیں یا تو خانگی ملکیت و انتظام کے تحت ہوں گی یا پھر امداد باہمی کے تحت چلائی جائیں گی، لیکن بنیادی صنعتوں کا انتظام اور ان کی ملکیت حکومت کے ہاتھوں میں رہے گی۔

جمہوری دور میں بنیادی صنعتوں سے متعلق حکومت کی حکمت عملی حسب ذیل رہے گی۔

(۱) اگر کسی خانگی کارخانے کو خریدنا ممکن نہ ہو تو اس پر سخت نگرانی رکھی جائے گی۔
(۲) ان صنعتوں کو آیندہ انفرادی ملکیت کے تحت ترقی کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔
(۳) تمام پرانے کارخانوں کو حکومت رفتہ رفتہ خرید لے گی، البتہ صرف ان ہی کارخانوں کو عبوری دور میں کام کرنے کا موقع دیا جائے گا جن کی پالسی اور انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھ میں رہے گا۔
(۴) بڑے پیمانہ پر اشیائے صرف پیدا کرنے والی صنعتوں مثلاً کپڑا، تیل، شکر، کاغذ وغیرہ کو جاری رہنے دیا جائے گا بشرطیکہ ان کا مقابلہ دیہی صنعتوں سے نہ ہو۔ مگر ہر حالت میں ان پر حکومت کی نگرانی رہے گی۔

خدمات عامہ

گھریلو اور بنیادی صنعتوں کے علاوہ حکومت حسب ذیل خدمات عامہ پر بھی توجہ کریگی۔
(۱) حمل و نقل:۔ اس کے تحت ہیں ریل، سڑک، نہری و ساحلی حمل و نقل، ہوائی حمل و نقل، ڈاک اور تار وغیرہ کے مسائل پر غور کرنا پڑے گا۔
ریل:۔ دیگر ممالک کی بہ نسبت ہندوستان میں ریلیں کم ہیں اور ان کی تعمیر ملک کی ضروریات کے پیش نظر نہیں ہوئی بلکہ برطانیہ کے تجارتی مفادات کے تحت ہوئی ہے۔ ہندوستان کی قومی حکومت ریلوں کا ایسا انتظام کرے گی جس سے ہندوستانیوں کو فایدہ پہنچے، گھریلو صنعتوں کے لئے خام پیداوار آسانی سے مہیا ہوسکے اور ان کی نکاسی بھی اچھی طرح ہو جائے۔
سڑک:۔ ہندوستان میں سڑکوں کی تعمیر کسی ایک باضابطہ منصوبے کے تحت نہیں ہوئی ہے، اسی لئے ۳۰ فیصد سڑکیں ریلوں کے متوازی ہیں علاوہ بریں ان سڑکوں کی تعمیر میں بھی ہماری اپنی ضروریات کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔

اس منصوبے کے تحت جو سڑکیں تعمیر کی جائیں گی، اس میں اس امر کو بطور خاص ملحوظ رکھا جائے گا کہ دیہات کی سڑکوں کو بڑی سڑکوں سے ملایا جائے۔

نہری حمل ونقل:۔ برطانوی حکومت نے اس طرف توجہ نہیں کی، کیونکہ ریلوں کی وجہ سے برطانوی سرمایہ داروں کو فایدہ پہنچ رہا ہے۔ ہندوستان کی قومی حکومت نہری حمل ونقل کی طرف پوری طرح توجہ کرے گی کیونکہ اس سے ہندوستانی مزارعین کو فایدہ پہنچے گا۔

ساحلی حمل ونقل:۔ ساحلی حمل ونقل کو ترقی دینے کے بڑے اچھے مواقع ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ بیرونی جہازران کمپنیوں کو ختم کر دیا جائے اور ہندوستانی کمپنیوں کو حکومت ہند خرید لے گی۔ علاوہ ازیں حکومت کے پاس تجارتی بحری بیڑہ بھی ہوگا۔

ہوائی حمل ونقل:۔ مابعد جنگ ہوائی حمل ونقل میں ترقی کے خاصے امکانات پائے جاتے ہیں، لیکن اس کا سارا انتظام اور ملکیت حکومت کے تحت ہوگی۔

ڈاک وتار:۔ ڈاک وتار کی تنظیم وترقی میں دیہی ضروریات کا خیال رکھا جائے گا۔

(۲) صحت عامہ:۔ ہندوستان مختلف امراض کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ ان کے انسداد کے لئے دو طریقے اختیار کئے جائیں گے:۔

(۱) امتناعی تدابیر مثلاً صفائی، اچھے مکانات زچگی خانوں وغیرہ کی تعمیر۔

(۲) دفاعی تدابیر مثلاً طبی سہولتوں کی فراہمی۔

صفائی وغیرہ سے متعلق دیہی پنچایتیں تمام کام انجام دیں گی حکومت ان پنچایتوں کو نمونہ کے مکانات بنوا کر دے گی اور انجمن ہائے امداد باہمی برائے تعمیر امکنہ قائم کی جائیں گی۔

ہندوستان میں بچے زیادہ مرتے ہیں اور زچگی کی وجہ سے اکثر عورتوں کی جان ضائع ہوتی ہے۔ اسی لئے ملک میں زچگی خانے اور مراکز بہبودی اطفال کثیر تعداد میں

کھولے جائیں گے۔ علاوہ ازیں ہر قریہ میں اکھاڑے کھولے جائیں گے اور کھیل کے میدان مہیا کئے جائیں گے تاکہ ان کی وجہ سے صحت عامہ پر اچھا اثر مترتب ہو۔

شہروں میں اسپتال اور دیہات میں دیہی دواخانے کھولے جائیں گے اور ڈاکٹروں ونرسوں کی تعلیم وتربیت کا معقول بندوبست کیا جائے۔ اس منصوبہ میں الوپیتھک طریقۂ علاج کے علاوہ، یونانی اور ایورویدک طریقۂ علاج کی سفارش کی گئی ہے کیونکہ موخر الذکر دونوں طریقے دیہاتی زندگی سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔

(۳) تعلیم :۔ اس منصوبے میں تعلیم کے حسب ذیل مسائل سے بحث کی گئی ہے :۔

(۱) بچوں کی تعلیم
(۲) بنیادی تعلیم
(۳) ثانوی تعلیم
(۴) جامعی تعلیم
(۵) بالغوں کی تعلیم

بچوں کی تعلیم :۔ ہمارے ملک میں بچوں یعنے ۳ تا ۶ سال کی عمر والے بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ ایسی عمر کے بچوں کے لئے اس منصوبے کے مطابق تمام ملک میں "بال مندر" کھولے جائیں گے۔ کنڈر گارٹن کے طریقہ میں چونکہ زیادہ مصارف لاحق ہوتے ہیں اسی لئے "بال مندر" جیسے کم خرچ طریقہ کی سفارش کی گئی ہے۔ مگر اس طریقہ تعلیم کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی ہیں۔

بنیادی تعلیم :۔ بنیادی تعلیم کے لئے مشہور واردھا اسکیم کو اختیار کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ واردھا اسکیم کے تحت بنیادی تعلیم عام، لازمی ومفت ہوگی۔ مدت تعلیم سات سال رکھی گئی ہے۔ اس اسکیم کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دستی تعلیم کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

ثانوی تعلیم :۔ بنیادی تعلیم کے بعد اس تعلیم کی مدت تین سال کی ہوگی۔ یہ تعلیم

بذاتِ خود، خود مکتفی ہوگی اور اس کا مقصد طالب علم کو کالج کی تعلیم کے لئے تیار کرنا نہ ہوگا۔

اعلیٰ تعلیم :- موجودہ اعلیٰ تعلیم ناقص ہے۔ اس منصوبے کے تحت اعلیٰ تعلیم کے موجودہ نقائص کو دُور کیا جائے گا۔ گاندھیائی منصوبے کے تحت بعض جامعات سرکاری ہوں گے اور بعض خانگی۔ سرکاری جامعات میں صرف ان نوجوانوں کو تعلیم و تربیت دی جائے گی جن کی خدمات سے حکومت مستفید ہونا چاہتی ہے۔

ذریعۂ تعلیم :- اس منصوبے میں ذریعۂ تعلیم جیسے پیچیدہ مسئلہ کے متعلق قطعی طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ تمام مدارج میں مادری زبان کے ذریعہ تعلیم دی جائے گی۔

بالغوں کی تعلیم :- تعلیم بالغان کا مقصد صرف لکھنا پڑھنا اور حساب سکھانا نہ ہوگا بلکہ اس کے ذریعہ عوام کی معاشی و تہذیبی زندگی کو بلند کیا جائے گا۔ اور انہیں عام و مفید موضوعات پر عمدہ کتابیں مہیا کی جائیں گی۔ بالغوں کی تعلیم میں دیہاتی ناچ اور گانے بھی شامل ہوں گے۔

(۴) بنک کاری و بیمہ :- خدمات عامہ کے سلسلہ میں بنک کاری و بیمہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ گاندھیائی منصوبے کے تحت بنکوں کی ملکیت سرکاری ہوگی اور ان کا انتظام حکومت کے ہاتھوں میں ہوگا۔ چین کے "کسان بنک" کی مانند حکومت کا ایک خاص بنک دیہات کے لئے بھی ہوگا۔ بیمہ کے کاروبار بھی حکومت کے زیر انتظام چلائے جائیں گے۔

(۵) اعداد و شمار و تحقیقات :- مرکزی حکومت کے تحت اعداد و شمار کا ایک محکمہ قائم ہوگا، جس کی شاخیں تمام صوبوں میں رہیں گی۔ اسی طرح تحقیقات کا بھی باضابطہ انتظام ہوگا۔

تجارت و تقسیم دولت

پیدائشِ دولت کے مختلف شعبوں مثلاً زراعت، دیہی صنعتوں، بنیادی صنعتوں، اور خدمات عامہ سے متعلق اصلاحی تجاویز پیش کرنے کے بعد اس منصوبے میں تجارت و تقسیم دولت جیسے اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

تجارت داخلہ :- اس منصوبے کا مقصد یہ ہے کہ ہر موضع تقریباً خود مکتفی ہو جائے، اس لئے تجارت داخلہ بہت ہی معمولی پیمانہ پر ہوگی۔ افراد کو خانگی طور پر تجارت کرنے کی اجازت ہوگی مگر قیمتوں، اور منافع وغیرہ پر حکومت کی نگرانی رہے گی اور ہر خطہ صرف وہی اشیاء برآمد کرسکے گا جن کی اس خطہ میں بہتات ہو اور جو دوسرے خطہ میں یا تو بالکل پیدا ہی نہ ہوتی ہوں یا کم پیدا ہوتی ہوں۔

تقسیم دولت :- اس منصوبے کے تحت پیدائشِ دولت میں مرکزیت پیدا کی جائے گی اور ہر خطہ کو خود مکتفی بنایا جائے گا، اس لئے تقسیم دولت کا مسئلہ خود بخود آسانی سے حل ہو جائے گا۔ اس منصوبے کے تحت، جس نظام معیشت کو پیش کیا گیا ہے، اس سے پیدائشِ دولت کے پیچیدہ طریقوں کی بجائے سیدھے سادے طریقوں کو اختیار کرنے اور گھریلو صنعتوں کو رواج دینے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی وجہ سے تقسیم دولت کا مسئلہ بہت آسان بن جاتا ہے اور سرمایہ دارانہ طریقے کی مانند دولت مندوں کو مزید دولت مند بننے کے مواقع نہیں ملتے۔ کلیدی صنعتوں پر چونکہ حکومت کا قبضہ رہے گا اس لئے غریب مزدوروں کا کوئی بڑا گروہ نمودار نہ ہوگا، اور چونکہ گاندھیائی منصوبے کو روبہ عمل لانے کے بعد، منصوبہ سازی کا یہ ادعا ہے کہ نامناسب عدم مساوات آمدنی باقی نہیں رہے گی، اس لئے سود و منافع کے پیچیدہ مسائل پیدا نہ ہوں گے۔

تجارت خارجہ :۔ موجودہ بین قومی تجارت کا مقصد یہ ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک کا ناجائز استحصال کرے۔ لیکن اس منصوبے کے تحت تجارت خارجہ کا یہ مقصد نہیں ہوگا۔ ہندوستان تجارت خارجہ میں حصہ ضرور لے گا لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہ ہوگا کہ وہ دوسرے ممالک کو لوٹے۔ ہم بعض اشیاء مثلاً مشینیں، ادویات وغیرہ درآمد کریں گے کیونکہ یہ چیزیں ہمارے ملک میں دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہم بعض ایسی اشیاء برآمد کریں گے جن کی دیگر ممالک کو ضرورت ہوتی ہے۔ سودیشی تحریک کا مفہوم عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ ہم کسی بدیسی چیز کو اپنے ملک میں داخل ہونے نہ دیں گے۔ لیکن یہ ایک غلط فہمی ہے۔ "ینگ انڈیا" مورخہ ۱۸ر جون ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی نے اس غلط فہمی کو رفع کر دیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ "بدیسی اشیاء کو محض اس لئے لینے سے انکار کرنا کہ وہ بدیسی ہیں اور ایسی اشیاء کی تیاری میں وقت اور روپیہ خراب کرنا جو ہمارے ملک میں آسانی سے نہیں بن سکتیں، ایک مجرمانہ غلطی ہے اور سودیشی اسپرٹ کے مغایر ہے۔"

ہندوستان کی تجارت خارجہ پر نگرانی رہے گی اور اس کو انفرادی ہاتھوں میں نہیں دیا جائے گا، کیونکہ آزاد تجارت کا مسلک اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ ہندوستان بعض اشیاء کی درآمد کو ممنوع قرار دے گا اور بعض پر بھاری محاصل عائد کئے جائیں گے۔

مزدوروں کے مسائل

زرعی وصنعتی مزدوروں کے مفادات کا حکومت تحفظ کرے گی اور حسب ذیل امور کے متعلق قانون سازی کرے گی۔

(۱) اجرت (۲) حالات کارخانہ (۳) اوقات کار (۴) صنعتی نزاعات کا تصفیہ

(۵) پیری، بیماری، حادثات و بے روزگاری کا تحفظ (۶) مزدور عورتوں کا تحفظ اور زچگی کے زمانہ میں ان کے لئے سہولتیں مہیا کی جائیں گی (۷) مدرسہ جانے والی عمر کے لڑکے کارخانوں میں مزدوری نہیں کریں گے (۸) مزارعین و مزدوروں کو انجمنیں بنانے کا حق ہوگا۔

مسئلہ آبادی

ہندوستان کی موجودہ آبادی کو ضرورت سے زیادہ قرار دیا گیا ہے، اور اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ضبط تولید کی بجائے ضبط نفس پر زور دیا گیا ہے، اور اس کے لئے دو تدابیر کی سفارش کی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ تعلیم کی عام اشاعت کی جائے اور دوسرے یہ کہ معیار زندگی کو بلند کیا جائے۔

اسی سلسلہ میں شہری آبادی کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے اور شہروں کی گنجان آبادی کے متعلق حسب ذیل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

(۱) گنجانی اور پیدائش دولت کی مرکزیت کے پیش نظر شہروں کی تعداد میں اضافہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

(۲) صحت، صفائی، تعلیم، تجارت و صنعت کے نقطۂ نظر سے موجودہ شہروں کی بہتر طریقہ پر منصوبہ بندی ہونی چاہیئے۔

(۳) بڑے پیمانہ کی صنعتیں شہروں میں قائم نہ کی جائیں۔

(۴) شہروں میں ایسی اشیاء صرف تیار نہ ہوں، جن کی تیاری دیہات میں ہوتی ہو، تاکہ شہری صنعتیں، دیہی صنعتوں کا تکملہ کر سکیں۔

محاصل

محاصل کے سلسلہ میں حسب ذیل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

(۱) محاصل کا بار منصفانہ ہو۔ اسی لئے راست محاصل میں بتدریج اضافہ کیا جائے۔
(۲) محصول نمک و آب کاری برخاست کردیا جائے۔
(۳) زرعی آمدنیوں پر ایک مقررہ حد کے بعد سے محصول لگایا جائے۔
(۴) محصول اموات و محصول وراثت کے طریقے کو رائج کیا جائے۔
(۵) مال گذاری میں تخفیف کی جائے تاکہ مزارعین پر محاصل کا بار کم پڑے۔
غیر معاشی کھیتوں سے مال گذاری وصول نہ کی جائے۔
(۶) دیہاتیوں سے اجناس کی شکل میں محاصل وصول کئے جائیں۔

سرکاری اخراجات

سرکاری اخراجات سے متعلق حسب ذیل تجاویز پیش کی گئی ہیں:۔
(۱) موجودہ فوجی اخراجات کو گھٹا کر نصف کردیا جائے۔
(۲) [illegible] ادی خدمات کے اخراجات میں اضافہ کیا جائے۔
(۳) سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں کمی کی جائے۔ کسی ملازم کی ماہانہ آمدنی پانچ سو روپیہ سے زائد نہ ہو۔

نظام زر

ہندوستان کے نظام زر میں، اس منصوبے کے تحت، بنیادی تبدیلیاں کی جائیں گی۔ نظام زر پر حکومت کی کڑی نگرانی رہے گی اور اس کو ماہرین مالیات وسٹہ بازوں کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بننے دیا جائے گا۔ حکومت درآمد، برآمد اور بین قومی بنک کاری پر نگرانی رکھے گی اور ان ضروریات کے مطابق زر کی مقدار میں توسیع یا تخفیف کرے گی۔ اور اس طرح اندرونی قیمتوں کے استحکام کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے گا۔
چونکہ تجارت خارجہ کو بڑی حد تک گھٹا دیا جائے گا اس لئے بین قومی تغیرات سے

اندرونی قیمتیں زیادہ متاثر نہیں ہوں گی۔ بین قومی تجارت کو بھی بارٹر کے طریقے پہ لانے کی کوشش کی جائے گی اور دیہی معیشت میں بارٹر کا طریقہ رائج کیا جائے گا۔ اس طرح تجارت داخلہ کے لئے بھی زر کی کم ضرورت ہوگی۔ پھر مال گذاری کا ایک حصہ جنس کی صورت میں وصول کیا جائے گا، دیہی صناع، استاد اور ڈاکٹروں کی خدمات کے معاوضہ میں اجناس دیے جائیں گے۔ تجارت داخلہ کو چونکہ بڑی حد تک مقامی بنا دیا جائے گا اس لئے زر کی اہمیت گھٹ جائے گی۔

سیاسی تنظیم

اس منصوبے کی بنیادی خصوصیت لامرکزیت ہے۔ انتظامی معاملات میں بھی اسی خصوصیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ سب سے چھوٹی اور ابتدائی انتظامی اکائی دیہی پنچایت ہوگی۔ اس کو داخلی معاملات میں پوری آزادی حاصل رہے گی۔ اس کے اوپر گرام سنگھ پنچایت ہوگی، جو چند گاؤں کو ملاکر بنائی جائے گی۔ اس پنچایت کا کام یہ ہوگا کہ ان مختلف دیہات کے کاموں میں ربط پیدا کرے۔ گرام سنگھ پنچایت سے بڑی جماعت مجلس تحصیل ہوگی، اور مجلس تحصیل کے روبرو مجلس ضلع ہوگی۔ شہروں کے لئے بجائے مجلس ضلع کے مجلس بلدیہ ہوگی۔ مجلس ضلع و بلدیہ سے بڑی جماعت مجلس صوبہ ہوگی۔ یہ مجالس صوبہ مرکزی اسمبلی کے لئے نمائندے منتخب کرکے روانہ کریں گے اور مرکزی اسمبلی ملک کی سب سے بڑی قانون ساز جماعت ہوگی۔

دیہی پنچایتوں کے لئے عام حق رائے دہی بالغان کی بنیاد پہ راست انتخابات عمل میں آئیں گے۔ لیکن بقیہ تمام مجالس کے لئے بالواسطہ انتخابات ہوں گے۔ اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے کے لئے قومی منصوبہ بندی کی ایک مرکزی کمیٹی مقرر کی جائے گی۔

منصوبہ بندی کا موازنہ

پیدائش دولت، تقسیم دولت، مزدوروں کے مسائل، مسئلہ آبادی،

محاصل، سرکاری اخراجات ، نظام زر، اور سیاسی تنظیم سے متعلق مفصل تجاویز پیش کرنے کے بعد، سب سے آخر میں اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے کے لئے جو اخراجات ہوں گے ان کا تخمینہ کیا گیا ہے اور پھر یہ بتلایا گیا ہے کہ ان اخراجات کی پابجائی کس طرح ہوگی۔

اخراجات :- اس منصوبے کو روبہ عمل لانے کے لئے حسب ذیل اخراجات لاحق ہوں گے۔

	غیر متوالی اخراجات	متوالی اخراجات
زراعت	۱۱۷۵ کروڑ روپے	۴۰ کروڑ روپے
دیہی صنعتیں	۳۵۰ ″ ″	—
کلیدی صنعتیں	۱۰۰۰ ″ ″	
حمل و نقل	۴۰۰ ″ ″	۱۵ ″ ″
صحت عامہ	۲۶۰ ″ ″	۴۵ ″ ″
تعلیم	۲۹۵ ″ ″	۱۰۰ ″ ″
تحقیقات	۲۰ ″ ″	—
جملہ	۳۵۰۰ ″ ″	۲۰۰ ″ ″

اس منصوبے کے اخراجات دیگر منصوبوں کے مقابلہ میں بہت کم رکھے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے اور وہ مغربی ممالک کی کورانہ تقلید نہیں کر سکتا۔

ذرائع آمدنی :- ان مندرجہ بالا اخراجات کو پورا کرنے کے لئے حسب ذیل ذرائع سے آمدنی حاصل کی جائے گی۔

اندرونی قرضے جو ملک کی جمع شدہ دولت سے حاصل کئے جائیں گے	۲۰۰۰ کروڑ روپے
تخلیق شدہ زر	۱۰۰۰ ″ ″
محاصل	۵۰۰ ″ ″
جملہ	۳۵۰۰ ″ ″

اس منصوبے میں دیگر ذرائع آمدنی مثلاً فاضلات اسٹرلنگ، توازن تجارت اور بیرونی قرضوں پر بھی بحث کی گئی ہے۔ فاضلات اسٹرلنگ کے متعلق یہ کہا گیا ہے یہ توقع عبث ہے کہ برطانیہ فاضلات اسٹرلنگ کو ادا کرے گا۔

توازن تجارت سے بھی آمدنی کی کوئی توقع نہیں رکھی گئی ہے کیونکہ اس منصوبے کے تحت تجارت خارجہ کو بہت گھٹا دیا گیا، اور تاوقتیکہ تمام اندرونی ذرائع استعمال نہ کرلئے جائیں، بیرونی قرضے حاصل نہیں کئے جائیں گے۔

غیر متوالی اخراجات ۳۵۰۰ کروڑ روپے ہی ہیں اور یہ اخراجات مندرجہ بالا ذرائع سے پورے ہو جا سکتے ہیں۔

اب رہے متوالی اخراجات جن کی مقدار ۲۰۰ کروڑ روپے ہے تو یہ رقم حکومت کی کلیدی صنعتوں، ذرائع حمل ونقل آبپاشی وغیرہ کی آمدنی سے بہ آسانی حاصل ہو سکتی ہے۔ پھر ان اخراجات کے لئے ابتدائی پانچ سال میں زیادہ رقم کی ضرورت نہ ہوگی۔

تنقید

مندرجہ بالا پاروں میں اگروال کے منصوبے کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس منصوبے میں تمام تر توجہ دیہاتوں کی معاشی ترقی کی طرف مبذول کی گئی ہے۔ گاندھی جی کے فلسفۂ حیات میں گاؤں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، انھوں نے اپنی سیاسی تحریکات کا مرکز دیہاتوں کو بنایا ہے، اور اس اسکیم کے ذریعہ ہندوستان کی معاشی ترقی کی تحریک کو بھی گاؤں ہی سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ بڑی حد تک یہ نقطۂ نظر درست ہے۔ ہندوستان کی ایک کثیر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے، اور دیہاتیوں کا واحد ذریعۂ معاش زراعت ہی ہے۔ جب تک ہم ہندوستانی دیہات اور زراعت کی اصلاح نہ کریں گے ہندوستان کی معاشی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر رہے گا۔

دیہاتوں کی اصلاح کے لئے جو عملی تدبیر پیش کی گئی ہے وہ دیہی پنچایتوں کا احیاء ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تجویز بہت مفید ہے، لیکن اس کو روبہ عمل لانے کے لئے جو دقتیں پیش آئیں گی ان پر اس اسکیم میں غور نہیں کیا گیا ہے۔ دیہاتی آبادی کا ایک بڑا حصہ ان پڑھ اور رسوم و رواج کا پابند ہے۔ ان میں فرقہ بندی اور چھوت چھات کی شدت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اگر دیہی پنچایتوں کی تشکیل کے وقت فرقہ بندی کے جذبات ابھر آئے تو ان پنچایتوں کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس منصوبہ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس دشواری پر کس طرح قابو حاصل کیا جائے گا۔

اس منصوبہ میں موضع واری مالگذاری کی جو تجویز پیش کی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں وہ بہت مفید ہے۔ موجودہ نظام مالگذاری کے تحت ہر کسان انفرادی طور پر ادائی لگان کا ذمہ دار ہے۔ لیکن اس منصوبے کے تحت پورا گاؤں مشترکہ طور پر ادائی مالگذاری کا ذمہ دار رہے گا۔ اس کی وجہ سے کسانوں میں مشترکہ ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا اور وہ باہم ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں گے۔ مالگذاری کے تعین کا اختیار دیہی پنچایت کو دیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی وجہ سے پنچایتوں کے اختیارات میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اس امر کا امکان ہے کہ ہر پنچایت صرف اپنے موضع کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کم سے کم مالگذاری کا تعین کرے اور اس طرح پورے ملک کے مشترکہ مفاد کو نظر انداز کر دے، پھر یہ اندیشہ بھی ہے کہ ابتدائی زمانہ میں دیہی پنچایتیں تعین مالگذاری کے کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں گی۔

زمینات کو تومیانے، تقسیم و انتشار اراضی کی اصلاح، زرعی قرضداری کے انسداد، افتادہ زمینات کو قابل کاشت بنانے، آبپاشی اور کھاد وغیرہ کے متعلق جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ بڑی حد تک مناسب ہیں۔

زراعت سے متعلق جن صنعتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ بھی توجہ کے لائق ہے۔

اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں، دباغت اور چرم کی صنعت کے متعلق جو تجاویز پیش کی گئی ہیں، وہ بہت ہی معمولی ہیں۔ اس منصوبے کے تحت اس صنعت کو ایک دیہی صنعت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جس کو چھوٹے پیمانہ پر چلایا جائے گا۔ ہمارے خیال میں اس صنعت کو بڑے پیمانہ پر چلانا چاہئے، جس کا مقصد نہ صرف ملکی ضروریات کو بلکہ بین قومی ضروریات کو پورا کرنا ہوگا۔

بنیادی صنعتوں سے متعلق جو تجاویز پیش کی گئی ہیں، وہ بھی بڑی حد تک درست ہیں۔ لیکن بڑے پیمانہ پر اشیاء صارفین پیدا کرنے والی صنعتوں سے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان کو جاری رہنے دیا جائے گا، بشرطیکہ ان کا مقابلہ دیہی مصنوعات سے نہ ہو۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ شرط پوری بھی ہوسکے گی۔ پارچہ بافی، تیل، شکر اور کاغذ کی صنعتیں اس وقت بڑے پیمانہ پر کام کر رہی ہیں، اور موجودہ جنگ کی وجہ سے ان کی حالت بھی سنبھل گئی ہے۔ یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ ان صنعتوں کا مقابلہ دیہی مصنوعات سے نہ ہو۔ دستی پارچہ بافی کا مقابلہ کرنی کے پارچہ سے یقیناً ہوگا۔ اگر یہ مقابلہ نہ ہو تو اس کے یہ معنے ہیں کہ کرنی کے پارچہ کے لئے بہت ہی محدود بازار رہ جائے گا، ایسی صورت میں اس صنعت کا زوال یقینی ہے۔ سوال یہ ہے کہ گر دستی پارچہ بافی کا کرنی کے پارچے سے، دستی کاغذ کا مشنری کے کاغذ سے مقابلہ ہو تو کیا پالیسی اختیار کی جائے گی؟ کیا پارچہ بافی، شکر، تیل اور کاغذ وغیرہ کے موجودہ کارخانوں کو بند کر دیا جائے گا، یا ان کے پیمانہ کاروبار کو گھٹا دیا جائے گا؟ کیا ان کارخانوں کے کاروبار کو محدود کر دینا مناسب ہوگا؟ بڑی محنت و جانفشانی کے بعد ان کارخانوں کو جاری کیا گیا تھا۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ محض دیہی مصنوعات کی خاطر اس ساری جدوجہد پر پانی پھیر دیا جائے؟ اگر ان کارخانوں کو جاری رہنے دیا جائے تو دیہی مصنوعات سے ان کا مقابلہ لازمی ہے۔ اور مقابلہ کی صورت میں دیہی مصنوعات کی ناکامی یقینی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں کے لئے

عوام کو دستی پارچہ اور دستی کاغذ کے استعمال کی ترغیب دی جائے۔ لیکن انسانی زندگی میں معاشی محرکات کا بالآخر دباؤ پڑتا ہے، اس لئے اگر دیہی مصنوعات اور کارخانوں کی مصنوعات کا مقابلہ ہو تو دیہی مصنوعات کی ناکامی یقینی ہے۔ ایسی صورت میں اس منصوبے کا مقصد اولین فوت ہو جائے گا۔ اور جس دیہی نظام کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اس پر پانی پھر جائے گا۔ ایک طرف تو بڑے پیمانہ پر اشیائے صارف پیدا کرنے والی صنعتوں کو جاری رکھنے کی تجویز پیش کی گئی ہے اور دوسری طرف دیہی مصنوعات کی ترقی و ترویج کے لئے مختلف تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ لیکن ان دونوں میں جو مسابقت ہوگی اس کے تدارک کا کوئی طریقہ نہیں بتایا گیا ہے۔

اس منصوبے میں تعلیمی نظام سے متعلق جو تجاویز پیش کی گئی ہیں، ان کی بنیاد وردھا اسکیم پر رکھی گئی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں نے اس اسکیم کی سخت مخالفت کی ہے۔ دس کروڑ باشندوں کی مرضی کے خلاف کسی تعلیمی اسکیم کو چلانا بہت ہی مشکل ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ دو قسم کے جامعات ہوں گے ایک سرکاری اور دوسرے، خانگی۔ لیکن یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ اس تفریق کی کیا ضرورت ہے، ان دونوں میں کون سی چیزیں مابہ الامتیاز ہوں گی۔

تقسیم دولت اور تجارت خارجیہ کے سلسلہ میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں، وہ بہت ہی مبہم اور زمانہ کے موجودہ رجحانات سے ہم آہنگ نہیں ہیں تقسیم دولت کے متعلق منصوبہ ساز کا ادعا یہ ہے کہ اس منصوبے کے تحت نامناسب عدم مساوات آمدنی نہ ہوگی اور تقسیم دولت کا مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو جائے گا لیکن اس کے متعلق تفصیلات پیش کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ بڑے پیمانہ پر اشیائے صارف پیدا کرنے والی صنعتوں (مثلاً پارچہ بافی، شکر و کاغذ) کو اس منصوبے کے تحت جاری رکھا جائے گا، اور ان پر صرف سرکاری نگرانی رہے گی۔ ایسی صورت میں اس کا امکان ہے کہ مزدوروں کی ایک بڑی تعداد جو اس وقت ان کارخانوں میں

بر سر کار ہے، اس وقت بھی کارگذار رہے گی۔ چونکہ یہ کارخانے انفرادی ملکیت کے تحت کام کریں گے اس لئے عدم مساوات آمدنی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

اس منصوبے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ تجارت خارجہ کے پیمانہ کو گھٹا دیا جائے گا۔ لیکن اس کی عملی صورت کیا ہوگی، اس کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا گیا ہے۔ کیا مقدار تجارت کو گھٹا دیا جائے گا؟ یا یہ کہ نوعیت تجارت میں بنیادی تبدیلی کر دی جائے گی؟ جب تک ان مسائل پر مفصل روشنی نہیں ڈالی جائے گی، اس مسلک کے فوائد و نقصانات پر رائے زنی نہیں کی جا سکتی۔

تجارت داخلہ کے متعلق بھی ایک بہت ہی محدود نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے ہر موضع کو چونکہ خود مکتفی بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی لئے ان کے مابین تجارت کی ضرورت بہت ہی کم پیدا ہوگی لیکن یہ تصور بہت ہی رجعت پسندانہ ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ حمل و نقل کی سہولتوں کے باعث مختلف ممالک کے مابین قریبی ربط پیدا ہو چکا ہے، ایک ہی ملک کے مختلف خطوں کو ایک دوسرے سے علحدہ رکھنا اور ان کے مابین تجارتی تعلقات پیدا نہ ہونے دینا تقریباً ناممکن ہے۔

نظام زر سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ بہت ہی غیر واضح ہے۔ یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے لئے کونسا معیار اختیار کیا جائے گا۔ اس کے زر کا تعلق سونے سے ہوگا یا کسی بیرونی زر سے۔

دیہی معیشت میں بارٹر کا طریقہ رائج کرنے کی سفارش کی گئی ہے لیکن اس میں جو دقتیں ہیں ان پر کس طرح عبور حاصل کیا جائے گا؟ ہمارے خیال میں اگر ہندوستان اپنے لئے ایک آزاد معیار زر اختیار کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بارٹر جیسے پرانے طریقوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔

محاصل کے متعلق بعض مفید تجاویز پیش کی گئی ہیں، مثلاً محصول نمک و آبکاری کی برخاستگی، محصول اموات و محصول وراثت کا نفاذ۔ ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ

غیر معاشی کھیتوں سے مالگذاری وصول نہ کی جائے۔ ہمارے خیال میں یہ تجویز مناسب نہیں ہے کیونکہ اس کی وجہ سے غیر معاشی کھیتوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا اور اس طرح ہماری زراعت کی حالت اور پست ہو جائے گی۔

اس منصوبے کو رو بہ عمل لانے کے لئے اخراجات کا جو تخمینہ کیا گیا ہے وہ بہت ہی کم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے اور وہ زیادہ اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا، لیکن ہم اس چیز کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ملک کی معاشی ترقی کے لئے ہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ صرف ۳۵۰۰ کروڑ روپے خرچ کر کے ہم کوئی معقول معیار زندگی حاصل نہیں کر سکتے۔

ان اخراجات کی پابجائی کے لئے من جملہ اور ذرائع کے ایک ذریعہ تخلیق شدہ زر بھی ہے، اس پر بھی وہ تمام اعتراضات عائد ہوتے ہیں جو بمبئی کے منصوبہ سازوں پر کئے گئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس منصوبے میں دیہی اصلاح سے متعلق بہت ہی عمدہ و معقول تجاویز پیش کی گئی ہیں، لیکن جہاں تک ملک کی صنعتی ترقی، تقسیم دولت، تجارت خارجہ اور نظام زر کا تعلق ہے، یہ منصوبہ بہت ہی مبہم اور غیر واضح ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دیہی اصلاح کے بغیر ہندوستان کی معاشی ترقی ناممکن ہے لیکن خود زراعت کی ترقی اور دیہاتوں کی فلاح و بہبود کے لئے یہ ضروری ہے کہ صنعتوں کو ترقی دی جائے اور ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا جو بوجھ ہماری زمینات پر پڑ رہا ہے، اس کو ہلکا کیا جائے۔ اگروال کے منصوبہ میں اس مسئلہ کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ دیہی اور زرعی اصلاح کی تجاویز سے قطع نظر اس منصوبے میں جو سفارشات پیش کی گئی ہیں وہ بہت ہی مبہم ہیں اور ہندوستان کی معاشی ترقی کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ بہ حیثیت مجموعی موجودہ معاشی رجحانات سے میل نہیں کھاتا۔

معاشری مرضیات

از

جناب سید فخر الحسن ایم۔ اے لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ

معاشری مرضیات کی اصطلاح:

اکثر علوم فطریہ کی اصطلاحیں مختلف علوم عمرانی میں کسی نہ کسی مشابہت اور معنوی لگاؤ کے اعتبار سے استعمال کی جاتی ہیں، ان میں سے ایک "معاشری مرضیات" بھی ہے جسے ماہرین عمرانیات انسان کی اجتماعی زندگی کی ایسی حالت کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کی نوعیت کم و بیش معنوی اعتبار سے مرض کی سی ہوتی ہے۔ جس طرح مختلف اعضاء جسمانی کے افعال میں ہم آہنگی نہ رہنے اور عدم مطابقت اور بگاڑ پیدا ہو جانے کی وجہ سے صحت کی شکل باقی نہیں رہتی اور مرض کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، اس کے اظہار کے لئے معاشری مرضیات کی اصطلاح وضع کی گئی ہے، لیکن یہ اصطلاح محض ایک معنوی مشابہت کی بنا پر اختیار کی گئی ہے

ورنہ اس کا تعلق معاشرہ کے عضویاتی تصور سے نہیں جیسا کہ بعض علمائے عمرانیات مثلاً
کونتھ اسپنسر یا لیلنفلڈ وغیرہ کا خیال ہے کہ
معاشرہ بھی ایک جسم نامیاتی یا ذوی الاعضاء کی حیثیت رکھتا ہے۔

معاشری مرضیات کا مفہوم:

انسان کی زندگی پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ پیدائش سے موت تک مطابقت پیدا کرنے کی جد وجہد سے عبارت ہے۔ قدرت نے انسان کو چند خاص جسمانی اور دماغی صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے جن کے ذریعہ وہ اپنے طبعی اور تمدنی ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں سرگرم رہتا ہے اور ان ہی صلاحیتوں کے ذریعہ آج انسان اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت کرنے میں مکمل طور پر تو نہیں لیکن بہت بڑی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔ ایسے افراد جن میں اپنے ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیتیں نہیں ہوتیں وہ تنازع للبقا میں ناکام ثابت ہوتے اور فنا ہو جاتے ہیں۔ انسان کو ایک طرف تو مختلف طبعی ماحول سے مطابقت پیدا کرنی ہوتی ہے اور دوسری طرف خود اپنے بنائے ہوئے ماحول سے جسے ہم تمدنی ماحول کہتے ہیں۔ اگر ایک طرف کرۂ زمین پر آب ہوا، موسم، قدرتی وسائل اور ایسے دیگر حالات کے اعتبار سے اختلاف پایا جاتا ہے تو دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ اس کے تمدنی ماحول میں اختلاف پایا جاتا ہے ایسی صورت میں اگر بنی نوع انسان کی کچھ تعداد مطابقت پیدا کرنے کے لائق نہ ہو اور وہ ناکام رہ جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ تعجب تو اس بات پر کیا جا سکتا ہے کہ ماحول کے ان گوناگوں اختلافات و نامساعدت کے باوجود انسانوں کی ایک بڑی تعداد کامیاب ہو جاتی ہے۔ انسان کی اس فطری صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے (باستثنائے ان چند افراد کے جو غیر معمولی ذہانت و قابلیت رکھتے ہیں)

عام طور پر قدرت کے پیدا کردہ اس کائنات کی حقیقت کا بہت کم علم رکھتے اور فطری ماحول کا مقابلہ کرنے کے لئے جو حربے حیوانوں کو قدرت نے عطا کئے ہیں ان سے عاری ہونے کے باوجود اپنے مخالف ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے اور ان پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ اور حیوانی دنیا کے مقابلے میں انسانی دنیا زیادہ آباد نظر آتی ہے، بہ قول اقبال "دوسرے حیوانات کے مقابلے میں انسان بہت ہی کمزور و ناتوان ہے، اپنے بچاؤ کے لئے وہ قدرتی حربوں سے مسلح نہیں کیا گیا، وہ بصارت شبینہ سے محروم ہے، اس کی قوت شامہ اور طاقت گریز بہت کم ہے لیکن پھر بھی زندگانی کی آزادیوں اور پہنائیوں کی جستجو میں اس نے اپنی ان تھک سرگرمیوں کو ہمیشہ وقف کئے رکھا ہے تاکہ قوانین قدرت کی کنہہ اور طرز عمل سے واقف ہوکر وہ رفتہ رفتہ ان اسباب پر حاوی ہو جائے جو خود اس کے ارتقا پر موثر ہیں۔" انسان اس میں شک نہیں اپنے فطری اور تمدنی ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں بہت کچھ کامیاب نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ ناکام بھی ہوتا رہتا ہے۔ جہد للبقا کے میدان میں انسان بعض حالات کے تحت کامیاب اور بعض حالات کے تحت ناکام بھی رہتا ہے۔

انسانی معاشرہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ معاشرتی تعلقات کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں اور ان تعلقات میں ایک نظم و ترتیب کی صورت بھی ہوتی ہے جس کے تحت افراد مطابقت پیدا کرکے جہد للبقا میں کامیاب ہوتے ہیں، لیکن معاشرتی تعلقات میں نظم و ترتیب کے ساتھ ساتھ بے نظمی اور بے ترتیبی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے جس کے تحت افراد مطابقت پیدا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اگر معاشرہ کے اندر ایسے حالات پائے جائیں جبکہ (۱) نہ تو افراد معاشرتی زندگی کے ساتھ مطابقت پیدا کرکے معاشرے کے آزاد اور خود کفیل ارکان کی حیثیت سے اس کی بقا اور تدریجی ترقی میں مناسب حصہ لے سکیں اور (۲) نہ خود

معاشرے کی ہئیت ترکیبی ہی ایسی ہو کہ اس کے مختلف اجزاء میں مطابقت و ہم آہنگی پائی جانے کی وجہ سے افراد کی ضروریات پوری ہوسکیں تو یہ ایک مرضیاتی صورت کہلائے گی۔ بالفاظ دیگر معاشری مرضیات سے مراد "پورے معاشرے کے مختلف اجزاء یا تمدنی ہئیت ترکیبی کے عناصر کے درمیان ایسی شدید بے نظمی و بے ترتیبی کا پیدا ہو جانا ہے جس کے معاشرے کی بقا معرض خطر میں پڑ جائے یا اس کے ارکان کی بنیادی ضروریات و خواہشات کی تکمیل میں ایسی شدید رکاوٹ پیدا ہونے لگے کہ نتیجتاً معاشری ربط باقی نہ رہ سکے۔"

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ ایک صحت مند معاشرے میں مختلف تمدنی عناصر مثلاً سیاست، معیشت، مذہب، اخلاق، خاندان، رسم و رواج وغیرہ کے درمیان ایک ایسی ہم آہنگی اور ربط کی صورت پیدا ہوتی ہے کہ افراد کو ان کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی، برخلاف اس کے جہاں ان مختلف عناصر کے درمیان تضاد و بے نظمی کی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ افراد کو ان کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں دشواری لاحق ہو تو پھر یہ مرضیاتی کیفیت ہوگی اور معاشرے کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی، یا پھر یہ کہ معاشرت و تمدن ہی کچھ اسی قسم کا ہوگا کہ اس کے تحت افراد کو اپنی بنیادی ضروریات و خواہشات کا پورا کرنا دشوار ہو جائے۔ یہ ضروریات و خواہشات عام اس سے کہ حیاتیاتی ہوں یا معاشری۔ اس لئے کہ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے دو بنیادی خواہشات ہیں، ایک غذا دوسری جنس میل، اگر ان دونوں کی تکمیل نہ ہو سکے پھر نہ انسان باقی رہ سکتا ہے اور نہ اس کی تکثیر عمل میں آسکتی ہے۔ رہیں معاشری خواہشات جن کی بنا کچھ تو حیاتیاتی ہوتی ہے اور کچھ معاشری۔ مثلاً سماج میں عزت و مرتبہ اور خاص طریق زندگی وغیرہ۔ چنانچہ اگر یہ خواہشات پوری نہ ہوں تو انسان

اپنی زندگی کو جینے کے لائق نہیں سمجھتا اور وہ اس کے لئے اجیرن ہو جاتی ہے
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشرے میں مرضیاتی حالات کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ اس کے دو اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ افراد میں فطری طور پر معاشرے کے بدلتے ہوئے تصورات اور اداروں کا ساتھ دینے اور اس سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، مثلاً ایک ناتوان اور ضعیف العقل انسان ایک سیدھے سادے معاشرے میں آسانی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہے لیکن شہر کے پیچیدہ اور ترقی یافتہ معاشرے میں اس کے لئے زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اندھے، بہرے اور معذوروں کے لئے ایک ایسا معاشرہ ہی زندگی کے لائق ہوگا جو مختصر سیدھا سادہ ہو اور جہاں انسانی ہمدردی اور باہمی امداد کے تحت خیر خیرات کا دستور پایا جائے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ خود معاشرہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہ دے سکے۔ مثلاً معاشی نظام بہتر ترقی یافتہ اور پیچیدہ ہو جائے لیکن سیاسی نظام ایسا ہو جو بالکل سیدھے سادے معاشی نظام ہی سے مطابقت پیدا کر سکے تو پھر ایسی صورت میں افراد کے درمیان انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں ہندوستان کے مشترکہ خاندان کا قدیم معاشری نظام مطابقت نہیں کر سکتا اور انفرادیت و آزادی کے تحت لوگ جس طرح اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتے ہیں اس میں شدید رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں ایک بات اور قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ جہاں حالات میں بہت زیادہ اور تیزی کے ساتھ تغیرات نہیں ہوتے وہاں معاشری مرضیات کی صورت کم پیدا ہوتی ہے۔ بر خلاف اس کے جہاں حالات میں جلد جلد اور مختلف قسم کے تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہاں معاشری امرضیات کے پیدا ہونے کا زیادہ امکان رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر سکونیاتی حالات کے بجائے حرکیاتی حالات میں

معاشری مرضیات سے زیادہ دوچار ہونا پڑتا ہے تا وقتیکہ مختلف تمدنی عناصر میں ساتھ ہی ساتھ مناسب تبدیلی نہ ہوتی رہے اگر معیشت میں تبدیلی ہو جائے تو اُسی مناسبت سے سیاست و معاشرت وغیرہ میں بھی تبدیلی ضروری ہے ورنہ مرضیاتی حالات کے نمودار ہو جانے کا قوی امکان رہتا ہے۔

معاشری مرضیات کی اضافیت:

مندرجۂ بالا تشریح سے یہ معلوم ہو گیا کہ معاشری مرضیات سے مراد ایسے حالات ہیں جو دراصل معاشری بے نظمی و بے ترتیبی کے مرادف ہیں اور یہ ایسے اسباب کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں جو معاشری صحت پیدا کرنے والے اسباب سے جداگانہ ہوتے ہیں لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ان دونوں کا تعلق مختلف معیارات قدر سے ہے۔ مثلاً ایک طبقاتی معاشرے میں جمہوریت اور رائے عامہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں طبقے کے افراد اپنی اپنی حالتوں میں مطمئن رہتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی بے چینی کی صورت نہیں پائی جاتی، نہ تو ادنیٰ طبقے کے لوگ اپنی پستی کا احساس رکھتے اور نہ اعلیٰ طبقے کے لوگ اپنے آرام کے آگے ادنیٰ طبقے کی تکلیف کی کوئی پرواکرتے۔ امیر و غریب، آقا و غلام، جاہل و عالم، تندرست و بیمار کی تفریق کو رسم و رواج کی ایک ایسی منظوری حاصل رہتی ہے کہ لوگ اسی میں مگن رہتے ہیں اور جو کچھ ہے اسی کو فطری اور مناسب سمجھتے ہیں۔ کوئی بے چینی اور بے نظمی پیدا ہونے نہیں پاتی جس سے سماج کا شیرازہ بکھر جائے، لیکن برخلاف اس کے جہاں مساوات اور آزادی کی قدر و قیمت ہوتی ہے وہاں اس قسم کی تفریق اور ایسا امتیاز غیر اطمینان بخش بن جاتا ہے، افراد میں بے چینی کا جذبہ کام کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے "معاشری بے نظمی" نمودار ہو جاتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد طبقے اور

ذات پات پر ہو وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ادنیٰ طبقے کی انتہائی غربت اور حد درجہ کی جہالت کو لازمی اور فطری شے تصور کیا جاتا ہے اور اس کے مبتلا اسے گوارا کرتے ہیں، لیکن جہاں مساوات و آزادی کی قدر کا احساس ہوتا ہے وہاں ایسی چیزیں گوارا نہیں کی جاتیں اور معاشرے میں بے چینی اور بے نظمی پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض مرضیاتی حالات کی نوعیت اضافی ہوتی ہے جس کا تعلق مختلف معیارات قدر سے ہے۔

معاشری مرضیات کے مفہوم پر تنقید:

معاشری مرضیات کے مفہوم کی جو کچھ بھی اوپر تشریح کی گئی اس سے کم وبیش اکثر علمائے عمرانیات اتفاق کرتے ہیں اور جس کو خاص طور پر پروفیسر کیلن مشہور امریکی ماہر عمرانیات نے اپنی مختلف تصانیف میں پیش کرنے کی کوشش کی، لیکن واضح رہے کہ اس مسئلے پر خالص نظری طور پر بہت کم بحث کی گئی ہے جس کی بنا پر معاشری مرضیات کے بیان کردہ مروجہ مفہوم اور تعریف پر ابھی بہت کچھ تنقید کی جا سکتی ہے اور ہنوز یہ مسئلہ نظریاتی عمرانیات کا ایک قابل بحث باب بن سکتا ہے۔ میں یہاں پر اس کے ایک خاص نکتے پر خالص نظری بحث کرنے کی کوشش کروں گا۔

معاشری مرضیات کی تفہیم کے سلسلے میں ہمیں دو اہم باتیں معلوم ہوئیں جن پر ساری بحث کا دار و مدار ہے۔ ایک تو یہ کہ مرضیاتی حالات میں تمدنی عناصر کے درمیان شدید بے نظمی ہوتی ہے جس کی وجہ سے معاشرے کی بقا خطرے میں پڑ جاتی ہے یا یہ شاید بے نظمی ایسی ہوتی ہے کہ افراد کی بنیادی ضروریات وخواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ دوسری چیز یہ کہ معاشری مرضیات کی

نوعیت محض اضافی ہوتی ہے کسی خاص معیار قدر کے تحت جب تک افراد اپنی موجودہ حالت میں مطمئن رہتے ہیں مرضیاتی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

ان دونوں باتوں کو اگر ہم پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ مختلف "معیارات قدر" کی بنا پر کسی موجودہ حالت سے "عدم اطمینان" کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے وہی دراصل کسی "شدید بے نظمی" کا موجب بنتا ہے اور جس کی بنا پر مختلف مرضیاتی مظاہر نمودار ہو جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کسی موجودہ حالات میں اگر "عدم اطمینان" کی صورت نہ پائی جائے اور افراد انہیں گوارا کریں تو یہ چیز معاشرے کی صحت کے مراوف ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ معاشری مرضیات کی ماہیت وحقیقت کا پتہ چلانے کے لئے یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں۔ انسانی معاشرے اور نظام تمدن میں اکثر ایسے مظاہر جن کا مطالعہ عام طور سے معاشری مرضیات کے تحت کیا جاتا ہے اور مسلمہ طور پر مرضیاتی حیثیت رکھتے ہیں وہ بسا اوقات "عدم اطمینان" کے سبب سے پیدا ہونے والی "بے نظمی" کا نتیجہ نہیں ہوتے اور نہ ان کا وجود کسی طرح افراد کے لئے ناگوار خاطر ہوتا ہے بلکہ ان کے وجود کے ساتھ ساتھ افراد ہر طرح سے مطمئن رہتے ہیں اور ان کو ایک لازمی شئے تصور کرتے ہوئے گوارا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک طبقاتی معاشرے میں غربت وافلاس اور جہالت جیسی چیزیں پائی جاتی ہیں اور افراد ان سے مطمئن رہتے ہیں۔ لیکن کیا ان چیزوں کو محض اس لئے کہ افراد میں ان کے وجود سے کوئی بے چینی نہیں پائی جاتی معاشری مرضیات شمار نہیں کیا جا سکتا جو یقیناً معاشری مرضیات کا یہ تصور خود فکر انسانی کی ایک بڑی مرضیات کے مرادف ہوگا۔ غربت وجہالت جیسی چیزیں ہر قسم کے معاشرے، ہر قسم کے معیارات قدر اور ہر قسم کے حالات میں معاشری مرض شمار کی جائیں گی، اس لئے کہ ان کا وجود معاشرے کی صحت وبقا کے لئے ہمیشہ خطرناک ثابت ہوگا۔ مختلف نظام تمدن اور معاشرے میں ایسی بہت ساری چیزیں ملتی ہیں جن کو معاشری منظوری حاصل رہتی ہے

اور لوگ ان سے نہ صرف مطمئن اور بے پرواہوتے بلکہ بسا اوقات لازمی اور فطری بھی سمجھتے ہیں لیکن محض اس لئے کہ لوگ ان کے وجود سے غیر مطمئن نہیں ہیں اور خاص معیار قدر کی بناء پر ان کو معاشری منظوری حاصل ہے، ان کو مرضیاتی مظاہرے سے تعبیر نہ کرنا اور ان کی طرف سے بے توجہ ہو جانا عمرانی نقطۂ نظر سے بے عقلی کی بات ہوگی اور اس طرح کا نظریہ معاشرے کی بنیادی خواہشات و ضروریات پوری نہیں ہوتیں اور ان میں شدید رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، پھر ایسی صورت میں مرضیات کا یہ مفہوم کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے۔ خواہشات و ضروریات کی تکمیل کا مفروضہ اور اطمینان کے مفروضے کے ساتھ اس کی اضافیت ایک تضاد پیدا کر دیتی ہے۔

انسان کی اجتماعی زندگی کے وہ تمام مظاہر جن کو علمائے عمرانیات معاشری مرضیات شمار کرتے ہیں، مثلاً بیماری۔ اپاہج پن۔ طلاق۔ بیوگی۔ عصمت فروشی۔ آوارگی۔ جرم۔ غربت و افلاس۔ گداگری۔ بے روزگاری وغیرہ ان کے وجود کے ساتھ ساتھ لوگ لازماً غیر مطمئن نہیں رہتے، پھر آخر یہ تمام چیزیں مرضیات میں کیوں داخل کی جاتی ہیں؟ اگر ہم اس پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس سلسلے میں جو بنیادی چیز ہے وہ معاشرے کی بقا و ترقی، جس کی بناء پر افراد کی بنیادی ضروریات و خواہشات کی تکمیل کو خاص اہمیت دی گئی ہے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کسی معیار قدر کی بناء پر اس کی اضافیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو عدم اطمینان کے تابع کر دینا اصل حقیقت کو ہی نظر انداز کر دینے کے مرادف ہوگا۔ معاشرے کی صحت، ترقی اور بقا اور افراد کی بنیادی ضروریات و خواہشات کی تکمیل کا راز "اطمینان کی حالت" کے بجائے کم ترین حقوق انسانیت یا عمرانی انصاف کے اصول میں پنہاں ہے۔ لہذا میرے خیال میں اگر کسی معیار قدر سے اس کا

تعلق ہوسکتا ہے تو وہ کم ترین حقوق انسانیت کی حفاظت یا عمرانی انصاف ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا دوسرا معیار جس کا تعلق "اطمینان" سے ہو وہ غیر اطمینان بخش اور نادرست ہوگا۔ مختصراً اگر ہم معاشری مرضیات کی تعریف کرسکتے ہیں تو کم و بیش یہ کرسکتے ہیں کہ کسی معاشرے یا نظام تمدن کے مختلف عناصر میں ایسی شدید بے نظمی یا خود معاشرے یا نظام تمدن کی ایسی ہیئت ترکیبی جو زمانے کے مخصوص حالات میں اس کی ترقی و بقا کو خطرے میں ڈال دے یا افراد کے ان ضروریات و خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کردے جن کے وہ انسانیت اور عمرانی انصاف کی بنا پر حقدار ہیں اور جس کی وجہ سے معاشرہ ترقی کرسکے اور افراد کی زندگی جینے کے لائق بن سکتی ہے۔"

تنقید و تبصرہ

اسلام کے سیاسی تصورات :

مرتبہ غلام دستگیر رشید ۔ ناشر نفیس اکیڈیمی۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

قیمت تین روپے چار آنے سکہ عثمانیہ ۔ تین روپے بارہ آنے کلدار ۔

یہ چند مضامین کا مجموعہ ہے جس کو ابھی مولوی غلام دستگیر رشید صاحب ام۔ اے نے اُردو داں طبقے کے لئے مرتب کیا ہے ۔ فاضل مرتب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں ۔ موصوف کی علمی سرگرمیوں سے اُردو داں طبقہ واقف ہے۔ اس ترتیب کا مقصد صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے سیاسی تصورات پر جو مختلف مضامین لکھے گئے تھے اور منتشر حالات میں تھے وہ یکجا ہوجائیں اور اس مضمون کے متلاشیوں کو بہ یک وقت میسر آجائیں اور ایک نظر میں تمام حالات معلوم ہو جائیں ۔ اسلام کے سیاسی تصورات کا مضمون فی نفسہ بہت اہم ہے اور ایک وسیع مطالعہ کا محتاج ہے ۔ اس پر اب تک کام نہیں ہوا ۔ جہاں ہر قوم اور ہر زمانے کے سیاسی تصورات روشنی میں آرہے ہیں کوئی وجہ نہیں

معلوم ہوتی کہ اسلام کے سیاسی تصورات تاریکی میں پڑے رہیں۔ باوجود بے مائگی کے ہندوستان قدیم کے سیاسی تصورات پر دیکھتے دیکھتے کئی جلدیں تیار ہوگئیں، حالانکہ ان تصورات کی تدوین کے لئے جس تاریخ اور سرمایہ غور و فکر کی ضرورت سے وہ سرے سے مفقود نہیں ہے۔ اسلامی تصورات کا یہ حال نہیں ہے! اس کے بہتیرے ماخذ موجود ہیں۔ صرف محنت و جستجو کی ضرورت ہے۔ ان تصورات کی تدوین سے ایک بہت بڑی علمی ضرورت پوری ہوگی، کیونکہ اسلامی تصورات کے سامنے نہ ہونے سے دنیا کی سیاسی تاریخ میں ایک بڑا فصل پڑا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ قرون وسطی میں صرف مسلمانوں نے ہی اپنے سیاسی شعور کا ثبوت دیا اور سیاسی غور و فکر کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ یونانی مفکروں نے سیاسی غور و فکر کو جس منزل پر چھوڑا وہ وہیں ٹھیرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے نہ صرف اس کو آگے بڑھایا بلکہ اس میں بیش بہا اضافے کر دئے۔ قرون وسطی کو جو زوال رومہ کے بعد شروع ہوتے ہیں یورپ کا ایک تاریک زمانہ ہے جس میں سوائے چند مذہبی عقائد کے کسی حقیقی غور و فکر کو موقعہ نہیں ملا۔ اگرچہ یورپ کے تاریخ نگار قرون وسطی کے بے مایہ خیالات کو ٹھونس کر یہ جگہ پر کر دیتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ارسطو سے میکاولی تک جس قدر زمانہ گذرا ہے وہ ایک خلا معلوم ہوتا ہے اور یہ خلا صرف اسلام کے سرمایۂ غور و فکر سے ہی پُر ہو سکتا ہے نہ کہ سینٹ پال، اکٹیوبیاس اور دانتے جیسے تہی دامن مفکروں کے خیالات سے۔ اگر ان مفکروں کا ماوردی، امام غزالی اور نظام الملک طوسی جیسے بزرگوں سے مقابلہ کیا جائے تو قطبین کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تاریک زمانے میں صرف اسلام نے ہی سیاسی شعور کی مشعلیں روشن کیں۔ نہ صرف سیاست کے بڑے کامیاب تجربے کئے بلکہ اپنے غور و فکر کو ایک سلیقے کے ساتھ مدون کیا۔ لیکن اب ان تصورات کو ایک جگہ جمع کرنا آسان نہیں ہے، یہ صبر آزما کام ہے، اس کے لئے قرآن و حدیث،

تفسیر، کلام، فقہ اور اس کے تمام مکاتیب اور اسلام کی مکمل تاریخ اور صدیوں کا سیاسی عملدرآمد دیکھنا ضروری ہے۔ اس کے لئے برسوں کی محنت درکار ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ چند دماغ اس کام کے لئے بالکل وقف ہو جائیں اور پورے خلوص کے ساتھ یہ کام انجام دیں)۔

اس وضاحت کے بعد اب اس مجموعۂ مضامین پر غور کرنا ہے کہ یہ مجموعہ کس حد تک یہ ضرورت پوری کر رہا ہے۔ اس کام کی حُسنِ سعی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگ اس خیال کے قائل نہیں کہ "تھوڑا، بالکل نہ ہونے سے تو اچھا ہے"۔ اور ہمارے فاضل مرتب بھی کچھ اسی کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ یہ تھوڑا کام بڑے کام کی نوید ثابت ہوگا۔ لیکن ہر میدان اور ہر علم میں یہ توقع پوری نہیں ہو سکتی اور بعض میدانوں میں اس کے برعکس اور مضر نتائج برآمد ہوں تو عجب نہیں۔ اسلام کے سیاسی تصورات کا یہی حال ہے۔ یہ ایک دوسری دنیا ہے اور اس میں ایسے ہی لوگ قدم رکھ سکتے ہیں جو تاریخ کے عالم ہوں اور دنیا کے سیاسی تفکر میں گہری نظر رکھتے ہوں، اور جو لوگ اس کام کا ارادہ کریں تمام تصورات کا گہرا مطالعہ کر کے طبعی ترتیب کے ساتھ مدون کر دیں۔ یہ دراصل مسلمانوں کے سیاسی شعور کی تاریخ ہوگی جو صدیوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے منتشر مضامین جو خاص مواقع اور غرض سے لکھے گئے ہوں وہ ہمیں کسی علمی منزل تک نہیں پہنچا سکتے۔ مصنف اور مضمون نگار کی ذہنیت میں بڑا فرق ہے۔ مصنف تو ایک مضمون اور علم کو ایک ترتیب کے ساتھ دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ مسئلہ اول سے آخر تک حل ہو جائے اور پڑھنے والوں کے سامنے مرتب معلومات کی صورت میں آجائے۔ لیکن مضمون نگار صرف ایک محدود اور موقتی ضرورت پوری کرتا ہے اور اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ ان موقتی مضامین کے جوڑنے سے علمی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ اس مجموعے میں بعض مضامین تو واقع میں ٹھوس اور عالمانہ ہیں

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار سیاسی تفکر سے بہت واقف ہیں اور وہ اسلام کے سیاسی پس منظر سے کام لے کر اچھے نتیجے پر پہنچ رہے ہیں لیکن ان کے نتائج محدود ہیں اور وہ کتابی ترتیب میں منضبط نہیں ہو سکتے۔ اور بعض مضامین تو بالکل واعظانہ ہیں۔ ان سے سیاسی تصورات پر مشکل سے روشنی پڑتی ہے۔ اس میں مولانا آزاد کے دو مضامین ہیں۔ ایک مضمون میں صرف خدائے تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کو واضح کیا گیا ہے۔ ربّانی اقتدار سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آخر اس اقتدار کا انسانی مملکت سے کیا رشتہ ہے۔ مملکت آخر انسانوں کی ہوتی ہے۔ دوسرے مضمون میں مسلمان کی حریت بتائی گئی ہے جو بالکل صحیح ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ جب مسلمان انسانی معاشرے میں آجائے تو وہ حریت کس حد تک باقی رہتی ہے۔ قانونی جکڑ بندی اور اس حریت میں جس کو مولانا نے واضح کیا ہے کیا رشتہ ہے؟ اسی طریقے سے سعید حلیم پاشاہ کا مضمون ہے۔ یہ اس غرض سے لکھا گیا تھا کہ مسلمان نوجوانوں کو جو یورپ کے تمدن سے بُری طرح متاثر ہو رہے تھے آگاہ کیا جائے کہ اسلام میں سیاست اور معاشرت کے ان سے زیادہ موثر اصول ہیں۔ لیکن اس میں جہاں اسلام کے سیاسی اصول بتائے گئے ہیں وہ بالکل غیر مرتب ہیں۔ ان سے اسلام کے سیاسی تصور کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی۔ البتہ مودودی صاحب کا مضمون وسیع ہے۔ اس میں مملکت، حکومت اور اس کے اعضاء وغیرہ پر بہت کچھ روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن اس میں تاریخ کے حقایق سے مدد نہیں لی گئی۔ بات یہ ہے کہ اگر سیاسی تصورات حقایق تاریخ کی روشنی میں پیش نہ کئے جائیں تو وہ صرف روحانی بن کر رہ جاتے ہیں، وہ عملی راستہ نہیں بتا سکتے۔ اس کے علاوہ مملکت، حکومت اور حکومت کے اعضائے ترکیبی کا تناسب اور اس کا باہمی تعلق واضح نہیں ہوتا۔ اصطلاحیں بھی بالکل غیر علمی انداز میں لکھ دی گئی ہیں۔ اگر مقالہ نگار صاحب دنیا کے اور تصورات کو سامنے رکھ کر اسلام کے

تصورات پر قلم اٹھاتے تو اچھا ہوتا۔

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ لائق مرتب ان منتشر مضامین کو جوڑنے کے بجائے سیاسی تصورات کے عنوانات قلمبند کرکے متعلقہ علما سے مقالے لکھوا لیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ مثلاً سیاسی تصورات کے حسب ذیل عنوانات ہوسکتے ہیں:

۱۔ سیاست اسلام کی ماہیت اور مذہب سے اس کا تعلق۔ ۲۔ مملکت کا تصور۔ ۳۔ مملکت کی ابتدا۔ ۴۔ مملکت کی انتہا اور اس کا مقصد۔ ۵۔ اقتدار اعلیٰ کی ماہیت اور اس کا تصور۔ ۶۔ قانون کی ماہیت۔ ۷۔ حقوق شہریت۔ ۸۔ حکومت کی ترکیب۔ ۹۔ حکومت کے اعضا اور ان کا باہمی تعلق۔ جب یہ مقالے تیار ہو جائیں تو پھر باہمی مشورے سے ضروری تراش خراش کے ساتھ ان کو باہم جوڑ لیا جا سکتا ہے۔ اس طریقے سے یہ ضروری کام علمی انداز میں ٹھکانے لگ سکتا ہے اور علم کی بڑی خدمت ہوگی۔

صدیقی

اسلام کے معاشی تصورات:

مرتبہ غلام دستگیر رشید، لکچرار نظام کالج۔ ناشر ادارۂ ادب جدید۔ حیدر آباد دکن۔ قیمت ۴ کلدار۔

اس کتاب میں لائق مرتب نے مختلف علماء اور اہل قلم حضرات کے چھوٹے بڑے ایسے مضامین کو اکٹھا کر دیا ہے جن میں معیشت کے کسی ایک یا مختلف پہلوؤں پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ اس مجموعہ کے چند اہم مضامین میں میرا خیال ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ رحمۃ کا مضمون "اسلامی قانون معیشت" خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔ اس لئے کہ معیشت کے بعض پہلوؤں پر بڑی نکتہ رس اور عالمانہ بحث کی گئی ہے جن سے موجودہ زمانے کے اپنی قلیت کے غرے میں

اسلامی معیار و اصول معیشت کو فرسودہ اور غیر علمی سمجھنے والے ماہر معاشیات کی سمجھ میں بھی شاید یہ بات آسکتی ہے کہ انسان کی اجتماعی اور عمرانی فوز و فلاح کے لئے اگر کوئی نظام معیشت مفید ہو سکتا ہے تو وہی جس کی بنیاد اسلام کے بتائے ہوئے قانون و اصول پر رکھی جائے۔ اسی طرح مولنٰا ابوالکلام آزاد کا مضمون "اسلام اور سوشلزم" بھی خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہے جس سے اس امر کی وضاحت ہو سکتی ہے کہ موجودہ زمانے کی اشتراکیت اور سرمایہ داری کے بجائے اگر کوئی صحیح اور فطری نظام معیشت رکھتا ہے تو وہ ان دونوں کی ایک درمیانی شکل ہے جس کی بنیادی خصوصیات کا تعین اسلام نے کر دیا ہے۔ دیگر مضامین بھی اپنی بجائے خاص افادیت رکھتے ہیں اور اس طرح کتاب کا مطالعہ بحیثیت مجموعی عام اور خاص دونوں طبقے کے لئے مفید معلومات فراہم کر سکتا ہے۔

سید فخر الحسن

"ملت بیضاء پر ایک عمرانی نظر"

از علامہ اقبال مرحوم

مترجمہ مولنٰا ظفر علی خان۔ ناشر اقبال اکیڈیمی لاہور۔ قیمت ۶ آنے

علامہ اقبال مرحوم کے ایک انگریزی لکچر کا یہ ترجمہ پہلے بھی ایک دو بار علٰحدہ اور مجرد مضامین کے ساتھ شائع ہو چکا ہے لیکن اس کی کم یابی کے پیش نظر اقبال اکیڈیمی لاہور نے پھر علٰحدہ طور پر رسالے کی شکل میں شائع کیا ہے۔ یہ لکچر اگرچہ آج سے ۳۵ سال قبل دیا گیا تھا لیکن موضوع بحث پر جس نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے اس اعتبار سے اس کی افادیت میں ہنوز کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ موجودہ حالات میں جبکہ بلحاظ قومیت مسلمانان ہند کا مسئلہ نہایت اہم بنا ہوا ہے اس لکچر کی

اہمیت اور افادیت زیادہ نظر آتی ہے۔ علامہ مرحوم نے اس میں قومی عروج و زوال کا کنہیات پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان قوم کی بقا و ترقی کا راز کن باتوں میں پنہاں ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو بنیادی بات بتائی ہے وہ یہ کہ قوم محض افراد کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ وہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے اور اس کی ایک جداگانہ زندگی ہوتی ہے جس کو مسلسل برقرار رکھنے کا مسئلہ قوموں کے نزدیک سب سے زیادہ مہتم بالشان ہے۔ چنانچہ عمرانیات کے اسی نظریے کے تحت مسلم جماعت کی عمرانی زندگی کی حقیقت سے متعلق تین امور سے بحث کی ہے (۱) جماعت مسلمین کی ہئیت ترکیبی جس کی بنیاد دیگر قوموں کے مقابلے میں بالکل جداگانہ ہے یعنے زبان، وطن، نسل یا خاص مقاصد کے اشتراک کے بجائے ایک ایسی انسانی برادری ہے جسے رسول اکرم صلعم نے قائم فرمائی تھی۔ چنانچہ ایک مسلمان اپنی قومیت کے لحاظ سے انگریزوں یا جرمنوں کی طرح انگلستان یا جرمنی کے ساتھ نسبت رکھنے کے بجائے اسلام سے نسبت رکھتا ہے اور اس کی قومیت کی بنیاد موجود فی الخارج ہونے کے بجائے معہود فی الذہن ہوتی ہے (۲) اسلامی تمدن کی یک رنگی: مذہبی اعتقاد کی جس وحدت پر اسلامی قومیت کا دارومدار ہے اس کی حیثیت ایک مضاف کی ہے جس کا مضاف الیہ اسلامی تہذیب کی یک رنگی ہے، لہذا اسلامی قومیت کا ایک زندہ رکن بننے کے لئے اسلام پر بلا شرط ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کی یک رنگی قبول کرنا نہایت ضروری ہے (۳) اس سیرت کا نمونہ جو مسلمان کی قومی ہستی کے تسلسل کے لئے ضروری ہے: انسان کی عمرانی تاریخ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے مخصوص سیرت کو قابل قدر قرار دیتی رہی ہے جہد للبقا کے جس دور میں جسمانی قوت کی ضرورت تھی اس وقت شجاعت انسانی سیرت کی سب سے قابل قدر خصوصیت تھی جب ایک ایسا دور آیا کہ دماغی طاقت کی ضرورت لاحق ہوئی اور

جسے امریکی ماہر عمرانیات کی اصطلاح میں 'دور مروت' سے تعبیر کیا جاتا ہے تو پھر نشاط زندگی اور ایثار و فیاضی انسانی سیرت کی قابل قدر خصوصیتیں بن گئیں لیکن یہ دونوں سیرتیں مائل با فراط و غلو ہیں لہذا ایک تیسری سیرت کا پیدا ہونا ضروری تھا جس کی غایت ضبط نفس ہے اور جو زندگی پر زیادہ متانت کے ساتھ نظر ڈال سکتی ہے۔ یہی سیرت اسلامی قومیت کی سیرت ہے جس کا نمونہ عالمگیر کی ذات نے پیش کیا۔ لہذا قومی تسلسل کو ٹوٹنے سے بچانے کے لئے ایک ایسی ہی اسلامی سیرت کی تشکیل ضروری ہے جس میں دوسری سیرتوں کے اسلوب کے محاسن جمع ہوں۔

قومی سیرت کی تشکیل میں چونکہ تعلیم کو بہت بڑا دخل ہے اسی لئے علامہ مرحوم نے اس مسئلے پر بھی خاص روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم ہماری قومیت اور عمرانی ہستی کے تسلسل و بقا کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ مسلمان طالب علم اسلامی روح اور اسلامی قومیت کے تصورات سے نابلد ہے۔ وہ اپنے دل میں اسلامی قومیت کی بقا اور تسلسل کی آرزوؤں کے بجائے معاشی اغراض اور جلب منفعت کی تمنائیں رکھتا ہے جس پر محض اس کی انفرادی ہستی کچھ دنوں باقی رہ سکتی ہے۔ لہذا ایک ایسے اسلامی درس گاہ کی ضرورت ہے جہاں کی تعلیم اسلامی سیرت کی تشکیل کر سکے۔ علی گڑھ۔ ندوہ۔ دیوبند، اس ضرورت کو پورا نہیں کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی بہت ہی اہم ہے لہذا علامہ مرحوم نے اس کی توضیح بھی کر دی ہے اور بتایا ہے کہ عورتوں کی تعلیم کی ابتدا بھی مذہب سے ہونی چاہئے، اس کے بعد اسلامی تاریخ علم تدبیر خانہ داری اور اصول حفظ صحت پڑھایا جائے اور ایسے تمام مضامین جو ان کی نسائیت کی نفی کرنے اور فرائض امومت کے ناقابل بنانے اور اسلامی سیرت سے آزادی دلانے والے ہوں ان کو نصاب تعلیم سے خارج کر دینا چاہئے۔

آخر میں معاشی مسئلے پر بھی کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ غرض یہ

مختصر سا رسالہ مسلمانوں کی قومی اصلاح اور ان کی بقاء و ترقی کے رستے میں ایک شمع راہ کا کام دے سکتا ہے، اور میرے خیال میں ہندوستان کے ان تمام مسلم مصلحین معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کا بہ نظر غور مطالعہ کریں جو قومی اور عمرانی اصلاح پر غور و فکر کر رہے ہیں اور اس کے لئے لائحہ عمل بھی تیار کرنا چاہتے ہیں۔

سید فخر الحسن

ابو جعفر منصور:

تالیف ابو القاسم رفیق دلاوری۔ شائع کردہ اقبال اکیڈیمی۔ لاہور۔ قیمت بے جلد عہ۔ صفحات ۱۵۱۔ تقطیع ۷"×۵"۔ ۱۹۴۴ء۔

بنو عباس کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر کو عباسی خاندان میں کم و بیش وہی حیثیت ہے جو مثلاً دکن کے بہمنی خاندان میں سلطان محمد کی ہے۔ دلاوری صاحب نے اختصار، لیکن فی الجملہ جامعیت سے اس خلیفہ کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ زبان دلچسپ اور بیان دلنشین ہے۔ کہیں کہیں اصل ماخذوں کے حوالے بھی دئے ہیں۔ دلاوری صاحب متوسط درجہ کے پڑھے لکھے طبقہ کی بڑی خدمت کریں گے اگر وہ تاریخ اسلام کے دوسرے اکابر جیسے مثلاً ہشام، متوکل، منصور سامانی اور ابن طولون وغیرہ کے حالات ایسے ہی دلچسپ انداز میں تحریر فرمائیں۔

زیر نظر کتاب کی کتابت و طباعت بھی اچھی ہے۔ اگر اس کے ساتھ دو ایک نقشے اور اشاریہ بھی ہوتا تو بہت اچھا تھا۔ امید ہے کہ یہ کتاب اپنی خوبیوں کی بنا پر کافی مقبول ہوگی۔

ا۔ ن۔ خ

کتاب الہند، جلد اول و دوم ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔
قیمت حصہ اول تین روپے وحصہ دوم مجلد چار روپے وغیر مجلد تین روپے۔

انجمن ترقی اردو قابل مبارک باد ہے کہ اس نے کتاب الہند جیسی مستند اور تاریخی معلومات کے لحاظ سے اہم کتاب کا عربی سے اردو میں ترجمہ کروایا۔ یہ ترجمہ سید اصغر علی صاحب نے کیا ہے اور مولوی سید عطا حسین صاحب نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔

بیرونی، اسلامی علما میں عجیب و غریب شخص گذرا ہے۔ اس کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ایک طرف تو وہ ہئیت و ہندسہ جیسے علوم پر قلم اٹھاتا تھا تو دوسری طرف تاریخ پر۔ علم ہندسہ پر اس کی کتاب "قانون مسعودی" بہت مشہور ہے جسے اس نے اپنے مربی اور سرپرست مسعود غزنوی کے نام معنون کیا تھا۔ ویسے تو بیرونی نے سو سے زائد کتابیں لکھیں لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت "کتاب الہند" کو حاصل ہے۔ اس کتاب میں اس نے اہل ہند کے مذہب و فلسفہ، ان کی تہذیب و تمدن اور رسوم و رواج وغیرہ پر نہایت دلچسپ معلومات جمع کر دی ہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی حالت کا صحیح نقشہ ہمیں اس کتاب میں مل جاتا ہے۔ چونکہ بیرونی کی ذہنی تربیت ماہر ہندسہ کی حیثیت سے ہوئی تھی اس واسطے اس کے انداز بیان میں لفاظی اور مبالغہ سے احتراز کیا گیا ہے۔ وہ ایک حق پسند محقق تھا جس بات کا مشاہدہ کرتا تھا اسے ٹھیک ٹھیک لکھ دیتا تھا۔ اس نے اس زمانے کے اہل ہند کی خوبیاں بھی گنائی ہیں اور ان کی کمزوریاں بھی بیان کی ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے سے اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمان جو اس وقت ہندوستان میں فاتحوں کی حیثیت سے نئے نئے آئے تھے اس ملک کے لوگوں کے حالات سے واقفیت حاصل کریں جس کے بغیر ان پر اچھی طرح حکومت نہیں کی جاسکتی تھی۔

جب علم حاصل ہوتا ہے تو بہت ساری غلط فہمیاں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں اہل ہند کی تہذیب کا بالکل ایک نئے طرز کی تہذیب سے تصادم ہوا۔ ضرورت اس کی تھی کہ فاتح مفتوح کو سمجھیں اور مفتوح فاتح کو۔

بیرونی نے اپنی کتاب کے شروع ہی میں لکھا ہے کہ ان حالات کو جان لینے سے جن سے آپس میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بہت ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی اُس لئے کہ بے تعلقی کی حالت میں جو چیز نہیں معلوم ہوسکتی وہ میل جول کی حالت میں ظاہر ہو جاتی ہے" چنانچہ بیرونی نے بڑی جانفشانی سے ہندوؤں کے اس زمانے کے مروجہ علوم کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ برہمن لوگ کسی غیر برہمن کو آج کل وید پڑھانے کے روادار نہیں ہوتے تو اس زمانے میں تو نہ معلوم بیرونی کو کیسی کیسی دشواریاں نہ پیش آئی ہوں گی۔ لیکن اس کے دل میں علم حاصل کرنے کی لگن تھی جس کی بدولت اس نے سب کچھ برداشت کیا۔

بیرونی کا مشاہدہ صحیح اور اس کی رائے قوانین فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ توہمات کا ذکر بڑی حقارت سے کرتا ہے۔ اس کی تنقید اور مسائل کی تنقیح و تجزیہ عقلی ثبوت پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ یہ کتاب اب سے تقریباً ساڑھے نو سو سال قبل لکھی گئی لیکن اپنے طریقۂ تحقیق کی وجہ سے جدید زمانے کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ کتاب الہند ہندوستان کی دسویں صدی عیسوی کی تاریخ پر ایک نہایت مستند ماخذ کا درجہ رکھتی ہے جس کا مطالعہ اس عہد کی تاریخ کے ہر طالب علم کے لئے لازمی ہے۔

ی ۔ ح ۔ خ

معہ ملتیہ اسلامیہ
نگر (دہلی)

مجلہ طیلسانین

۱۔ "مجلۂ طیلسانین" جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا علمی وادبی سہ ماہی رسالہ ہے۔ اس کا شمار حیدرآباد کے معیاری رسالوں میں ہوتا ہے۔ اسکے دو حصے ہیں، ایک حصہ عام اور دوسرا حصہ معاشیات۔

۲۔ حصۂ عام میں ادبیات۔ سیاسیات۔ عمرانیات۔ اخلاقیات۔ نفسیات۔ قانونیات۔ فلسفہ۔ دینیات اور جمالیات پر ماہرین کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

۳۔ حصۂ معاشیات صرف معاشی عنوانات کے لئے وقف ہوتا ہے۔ اس میں نظری اور علمی معاشیات پر اہل قلم کے مضامین شامل ہوتے ہیں۔ مقامی اور بیرونی مسائل حاضرہ پر بحیثیت علمی پیرائے میں بحث کی جاتی ہے۔

یہ رسالہ رائل سائز کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اعلیٰ مضامین اور اس قدر زیادہ حجم کے باوجود اس کا سالانہ چندہ مقامی خریداروں سے پانچ روپے سکۂ عثمانیہ اور بیرونی خریداروں سے پانچ روپے بارہ آنے سکۂ انگریزی، معہ محصول ڈاک رکھا گیا ہے۔ قیمت فی پرچہ (عہ؍) ہے۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ۔ نمائش گاہ باغ عامہ۔ حیدرآباد دکن۔
ٹیلیفون نمبر (۲۵۵۳)

فہرست مضامین

جلد (۶) ستمبر ۱۹۴۵ء شمارہ (۳)

سلطنت دہلی

اور

اُس کا نظام عدل گستری

از

جناب عبدالحفیظ صدیقی۔ بی ایس سی ایل ایل ایم (عثمانیہ)

(بہ سلسلۂ گذشتہ)

محکمۂ قضا یا محکمۂ عدلیہ :

صدر مملکت اور آمر شریعت کی حیثیت سے سلطان کے تین فرائض ایسے تھے جو عدل گستری سے وابستہ تھے۔ پہلے یہ کہ سلطان دین اسلام کا محافظ اور رعایا کے باہمی منافشوں میں حَکم تھا۔ دوسرے وہ نظام حکومت کا صدر تھا۔ تیسرے وہ فوجوں کا

اعلیٰ ترین افسر تھا[۱] پہلی حیثیت میں تو سلطان دیوان قضاء کے توسط سے دادرسی کرتا تھا۔ دوسری حیثیت سے دیوان مظالم کے ذریعہ، اور تیسری حیثیت سے خود سلطان یا اس کے فوجی سپہ سالار فوجی عدالت (کورٹ مارشل) کا اجلاس کرتے تھے اور باغیوں کو سزا سناتے تھے۔ فوجی تعزیر کے لئے محمد تغلق نے دیوان سیاست کے نام سے ایک جداگانہ محکمہ قائم کیا تھا جس کے لئے خاص فقہا مقرر ہوتے تھے۔[۲] لیکن یہ چیز قابل ذکر ہے کہ خود محمد تغلق نے جو بہت سخت گیر مشہور ہے، فقہاء کی رائے کے بغیر بطور خود کسی کو سزائے موت نہیں دی۔ دیوان قضاء میں دو قسم کے عہدہ دار تھے، ایک تو مفتی تھے جو اپنی فنی اور قانونی رائے دیتے تھے، اور دوسرے متفحش تھے جو امور متعلقہ اور واقعات کی چھان بین کرتے تھے۔[۳] ان کے علاوہ عاملانہ عہدہ دار اور اہل عملہ بھی تھے جو "امیر" اور "متصرف"[۴] کہلاتے ہیں۔ اس چیز کی کوئی صراحت نہیں ملتی کہ فوجی گورنروں کو بغاوت وغیرہ کے جرائم میں کیا اختیارات حاصل تھے۔ چونکہ جنگی قیدی اور باغی عام طور پر دہلی بھیج دیے جاتے تھے،[۵] اس لئے یہ قیاس ہوتا ہے کہ گورنروں کو سخت سزائیں دینے کا اختیار نہ تھا۔ جب کبھی دار السلطنت سے ہدایت وصول ہوتی تو باغیوں کو صوبے میں بھی سزا دی جاتی تھی۔[۶]

اسلامی حکمران کو یہ حق حاصل تھا کہ سزاؤں کی تخفیف کر دے۔ اگر غور کیا جائے تو خلفائے راشدین نے کبھی اس قسم کا کوئی حق استعمال نہیں کیا تھا لیکن آٹھویں صدی عیسوی میں پہلی دفعہ امیر معاویہؓ نے یہ حق استعمال کیا۔[۷] ہندوستان میں سلاطین دہلی نے تقریباً ہر قسم کے مقدمے میں یہ حق استعمال کیا چنانچہ سرقے سے لیکر

۱۔ قریشی ص ۱۴۹۔ ۲۔ برنی ص ۴۹۷۔ ۳۔ برنی ص ۴۹۷۔ ۴۔ قریشی ص ۱۵۰۔
۵۔ برنی ص ۳۲، ۲۲۱۔ ۶۔ قریشی ص ۱۵۰۔ ۷۔ امیر علی: اسپرٹ آف اسلام ص ۲۸۰۔

قتل اور ڈکیتی وغیرہ کی سزاؤں میں بھی تخفیف کی[۱]۔ سلاطین خاص صورتوں میں عدالت ابتدائی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ طاقتور امراء کے معاملات میں سلاطین ہی کو فصل خصومات کرنا پڑتا، کیونکہ یہ امراء سوائے سلطان کے کسی اور شخص کا فیصلہ نہیں مانتے تھے[۲]۔

سلطان کی حیثیت اعلیٰ ترین حاکم عدالت کی تھی، اور اس حیثیت سے وہ محکمۂ عدلیہ کی دیکھ بھال کرتے اور عدلیہ کے عہدہ داروں کا تقرر کرتے تھے تاکہ وہ ان عہدہ داروں یعنے قاضیوں کے ذریعہ انصاف ستانی کر سکیں اور شاہ انگلستان کی طرح صرف سلطان ہی عدالتیں قائم کر سکتے تھے[۳]۔

دیوان مظالم:

دیوان مظالم ایک منظم ادارے کی شکل میں حضرت خلیفۂ چہارم کے زمانے سے چلا آتا ہے[۴]۔ عباسی خلفاء نے کبھی بطور خود اس کی صدارت کی اور کبھی اپنے وزیروں کو اس کام کے لئے مامور کیا[۵]۔ دلی میں سلطان کی عدم موجودگی میں امیر داد دیوان مظالم کی صدارت کرتا تھا[۶]۔ بہ قول ابن بطوطہ، سلطان ہر دو شنبہ و پنجشنبہ کو مقدمات کی سماعت کے لئے بیٹھتا تھا[۷]۔ طریقۂ کارروائی یہ تھا کہ پہلے "حاجب" کے پاس شکایت جاتی تھی۔ اگر "حاجب" کے اجلاس سے اطمینان بخش فیصلہ

۱۔ بشیر احمد ص۹۰۔ ۲۔ بشیر احمد ص۱۸۱۔ ۳۔ مقابلہ کیجئے ہدایہ اور بلاکسٹن کی شروحات، جلد ۱ ص۲۹۶۔ ۴۔ قریشی ص۱۵۰۔

۵۔ جرجی زیدان کے حوالے سے قریشی ص۱۵۰۔

۶۔ مقابلہ کیجئے منہاج ص۲۴۲-۲۷۱ ۔ اور قریشی ص۱۵۰۔

۷۔ قریشی ۔ نیز دیکھو بعد میں "لفظ کا وارث بنا حاجب مقرر ہوا تھا"

نہ ہوتا تو پھر مستغیث[۱] قاضی ممالک کے پاس پیش ہوتا[۱] اس کے بعد آخری مرافعہ سلطان کے پاس ہوتا تھا اور مظلوم بہت آسانی سے بادشاہ کے پاس رسائی حاصل کرسکتے تھے[۲]۔ صبح الاعشیٰ میں "مظالم" کی عدالت کا ایک دلچسپ نقشہ کھینچا گیا ہے[۳]: سلطان ایک اونچے سنہری تخت پر بیٹھتا اور اس کے اطراف محافظ دستہ اور عہدہ دار ہوتے۔ سلطان کے برابر میں قاضی ممالک بیٹھتا جو سلطان کو قانونی مشورے دیتا تھا۔ جب عدالت کے جوان آغاز کارروائی کا اعلان کرتے تو پھر مستغیث اپنی شکایتیں لیکر آگے بڑھتے۔ جس دن سلطان اجلاس نہ کرتا تو حاجب عرضیاں وصول کرتے اور صدر حاجب کے پاس روانہ کردیتے اور بالآخر یہ سلطان کے حضور میں پیش کی جاتی تھیں[۳]۔ سلطان سکندر لودی کے زمانے میں وزیر ہی دیوان مظالم کی صدارت کرتا تھا اور وزیر کے قانونی مشورے کے لئے قاضی موجود ہوتے جن کو بارہ ماہرین فقہ کی مدد حاصل رہتی[۴]۔ جب سلطان دورے پر باہر نکلتا تو اس وقت بھی لوگوں کو عرضیاں پیش کرنے کی اجازت تھی۔

دیوان قضاء

دیوان قضاء کا مخصوص کام گو دیوانی مقدموں کی سماعت تھا، لیکن محکمۂ سیاست اور دیوان مظالم سے بھی اس کا کچھ تعلق ہوتا تھا۔ دراصل "قضاء" قانون عام (کامن لا) اور "سیاست" و "مظالم" انتظامی قانون کی

۱۔ قریشی ص ۱۵۰۔ ۲۔ قریشی ص ۱۵۰ (بحوالۂ ابن بطوطہ)۔

۳۔ قریشی ص ۱۵۰، ۱۵۱۔

۴۔ قریشی ص ۱۵۱ (ماخوذ از داؤدی و جامع الاخبار)۔

اساس تھی[۱]۔ دیوان قضاء اور مملکت کے عدلیہ کا صدر قاضی ممالک ہوتا تھا جس کو قاضی القضاۃ بھی کہتے تھے[۲]۔ سلاطین دہلی کے عہد میں صدر الصدور کا اہم عہدہ بھی اسی سے وابستہ ہوگیا۔ چونکہ قاضی القضاۃ کی خدمت بہت اہم اور بڑی ذمہ داریوں کی حامل تھی، اس کے ساتھ ایک "نائب قاضی" بھی ہوتا تھا جو بجائے خود غیر معمولی قابلیت رکھتا تھا[۳]۔ قاضی القضاۃ کو محمد تغلق کے زمانے میں سالانہ ساٹھ ہزار تنکہ مشاہرہ ملتا تھا۔ محکمۂ عدلیہ اور محکمۂ امور مذہبی کے تمام امور اس سے متعلق تھے۔ یہ تحت کی عدالتوں کے مرافعے سماعت کرتا تھا اور مقامی قاضیوں کا تقرر بھی کرتا تھا[۴]۔ شروع میں تو یہ ہوا کہ قاضی القضاۃ ہی دہلی میں عدالت ابتدائی کا کام انجام دیتا تھا لیکن بعد میں دارالسلطنت کے لئے ایک علیحدہ قاضی مقرر ہوگیا۔ اس عہدہ پر ابن بطوطہ کا بھی تقرر ہوا تھا اور اس کو بارہ ہزار تنکہ سالانہ دئے جاتے تھے[۵]۔ ابن بطوطہ کی مدد کے لئے مزید دو قاضی مقرر تھے۔ دارالسلطنت کے قاضی کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور خود سلطان نے ابن بطوطہ کو عہدۂ قضاء پر فائز کیا اور خود قاضی کے سامنے کھڑے ہو کر قاضی کو "ہمارے سرکار" اور "آقا" سے خطاب کیا[۶]۔

صدر جہاں یا صدر کُل

نظام عدلیہ میں ایک اور عہدہ تراشا گیا تھا جس کو صدر کل یا صدر جہاں کہتے تھے۔ چیف جسٹس یا قاضی القضاۃ دراصل ۱۲۰۶ سے ۱۲۴۸ء تک

۱۔ قریشی ص۱۵۱۔
۲۔ قریشی ص۱۵۱۔ بشیر احمد ص۱۰۷۔
۳۔ برنی ص۳۵۱۔
۴۔ قریشی ص۱۵۱۔
۵۔ قریشی ص۱۵۱۔
۶۔ قریشی ص۱۵۱ (بحوالہ ابن بطوطہ)۔

سلطنت کے محکمۂ عدلیہ کا صدر بنا رہا، لیکن اس کے بعد سلطان ناصر الدین نے ۱۲۴۸ء میں صدر جہاں کا ایک اور اعلیٰ عہدہ قائم کیا اور قاضی القضاۃ منہاج سراج کو یہ خدمت دی گئی۔[1] سلطان ناصر الدین نے جب دیوان مظالم قائم کیا تو منہاج سراج کو ہی اس کا صدر نشین بنایا تھا۔ اسی زمانے سے صدر جہاں محکمۂ عدلیہ کا صدر سمجھا جانے لگا۔[2] اور محکمۂ امور مذہبی بھی اسی کی زیر نگرانی تھا۔[3] عدلیہ کی حد تک اس کے فرائض تقریباً وہی تھے جو انگلستان کے لارڈ چانسلر کو حاصل ہیں۔[4] خاص صورتوں میں صدر جہاں عدالت شاہی میں مقدموں کی سماعت کرتا اور ابتدائی مقدموں کا کام بھی کرتا تھا۔[5] صدر جہاں کی سفارش سے قاضیوں کا تقرر ہوتا تھا اور اسی کے دفتر سے احکام تقرر جاری ہوتے تھے۔[6] جب قاضی منہاج سراج ۱۲۴۸ عیسوی میں صدر جہاں بنایا گیا تو قاضی القضاۃ کے عہدے پر قاضی ضیاء الدین فائز ہوا جو محکمۂ عدلیہ کا اکثر کام انجام دیتا تھا۔[7] صدر جہاں کی شکل میں قاضی القضاۃ سے ایک نیا عہدہ بنانا مقصود تھا،[8] لیکن بعد میں علاؤ الدین خلجی نے قاضی صدر الدین عارف کی ذات میں یہ دونوں عہدے ضم کر دیئے۔[9] پھر فیروز تغلق نے عارضی طور پر ان دونوں عہدوں کو علیحدہ رکھا۔[10] لیکن عام طور پر قاضی القضاۃ اور صدر جہاں کے دونوں عہدوں پر ایک ہی شخص فائز ہوتا تھا۔

۱۔ بشیر احمد ص۱۰۵۔　　　۲۔ برنی ص۵۰۸۔

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قریشی باب (۹)۔

۴۔ بشیر احمد ص۱۰۱۔ ۵۔ بدایونی جلد ۱ ص۲۳۹۔ ۶۔ بشیر احمد ص۱۰۱۔ ۷۔ بشیر احمد ص۱۰۵، ۱۰۶۔

۸۔ بشیر احمد ص۱۰۶۔ ۹۔ فرشتہ ص۱۲۱ پر لکھتا ہے: قاضی صدر الدین عارف کہ قضائے ممالک وخطاب صدر جہانی داشت۔ بعد از و قاضی جلال الدین .... ۔

۱۰۔ برنی ص۵۷۹-۵۸۰۔

صدر جہاں کا عہدہ تا حیات ہوتا تھا[1] اور فرمان تقرر[2] کے لحاظ سے اس کے چار اہم فرائض تھے۔ پہلا فرض تو قضاء یعنے فصل خصومات تھا، دوسرا عطائے خطابات، تیسرا امامت اور چوتھا احتساب کل امور شرعی[3]۔ اور بقول برنی صدر جہاں عدلیہ کے عہدہ داروں اور محکمۂ تعلیم کے تمام امور کی نگرانی کرتا تھا۔ اور شرعی امور میں پوری طرح مطلق العنان تھا۔ صدر کے محکمہ سے علماء کو وظیفے ملتے اور غریبوں کو زمینیں دی جاتیں اور ان عطیوں سے متعلق تمام شکایتیں بھی صدر جہاں کے پاس ہی آتیں[4]۔ صوبوں میں صدر صوبہ اور اضلاع میں صدر سرکار اس کی نمایندگی کرتے تھے[5]۔

صدر جہاں یا اس کے محکمہ کو دیوان سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ یہ ایک عارضی عدالت تھی جو صرف محمد تغلق کے زمانے میں قائم ہوئی اور اس کے جانشینوں کے ہاتھوں برخاست ہوگئی۔ چونکہ صدر جہاں کے بہت وسیع اختیارات اور فرائض تھے اور وہ ہر وقت عدالت میں حاضر نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے قاضی القضاۃ اور اس کے مددگار قاضی ان تمام مرافعوں کی سماعت کرتے تھے جو دیوان مظالم میں یا دیوان اسالت میں صوبجاتی قاضیوں یا گورنروں کے فیصلوں کی ناراضی سے آتے تھے۔

قاضی

ہر شہر اور ہر قصبہ میں قاضی مقرر ہوتے تھے اور ملک کے نظم ونسق کا سب سے پہلا اور اہم فرض یہی سمجھا جاتا تھا کہ قاضیوں کا تقرر کیا جائے[6]۔ صدر جہاں کے بعد

---

[1] ۔ بشیر احمد ص ۱۰۶ ۔ [2] ۔ منہاج ص ۱۷۵ ۔ [3] ۔ برنی ص ۵۸ ۔ [4] ۔ ایضاً ص ۵۸ ۔
[5] ۔ بشیر احمد ص ۱۰۶ ۔ [6] ۔ قریشی ص ۱۵۲ ۔

قاضی القضاۃ ہی سلطنت کا سب سے اعلیٰ عہدہ دار سمجھا جاتا تھا۔ قاضی القضاۃ کا تقرر خود سلطان کرتا تھا اور اس خدمت پر ایسے لوگوں کو مقرر کیا جاتا تھا جو بلند کردار اور فقہی معلومات میں "علامۂ روزگار" ہوتے تھے[۱]۔ بادشاہوں نے قاضی القضاۃ کو خدمت سے علیٰحدہ بھی کیا ہے یا نچی خدمت پر بٹھا دیا۔ چنانچہ[۲] قاضی جلال الدین کاشانی کو سلطان معز الدین بہرام نے خدمت سے علیٰحدہ کیا تھا اور قاضی عماد الدین شکور خانی کو ۸ء۴ ۔ یسوی برطرف کیا گیا[۳]۔ سلطان معز الدین بہرام نے قاضی شمس الدین کو بغاوت کے الزام میں موت کی سزا دی[۴]۔

قاضی القضاۃ کے فرائض میں عدلیہ کے کام کے علاوہ یہ چیز بھی داخل تھی کہ سلطان کے سامنے عہدے کی قبولیت کا حلف اٹھائے[۵] اور سلطان کی تخت نشینی کے وقت موجود رہے[۶]۔ قاضی القضاۃ اور دار الخلافہ کے دیگر قاضی کبھی کبھی سلطان کو مدعو بھی کرتے تھے[۷]۔ سلطنت کے قواعد یا قوانین بناتے وقت قاضی القضاۃ سے مشورہ کیا جاتا تھا[۸]۔ بعض اوقات قاضی القضاۃ کو سفارتی مہم پر بھی روانہ کیا جاتا تھا[۹]۔ بعض دفعہ قاضی القضاۃ کے تحت تعلیمی ادارے بھی رکھے گئے[۱۰]۔

ابتدائی زمانے میں تو قاضی کے فرائض صرف فصل خصومات سے متعلق تھے، لیکن رفتہ رفتہ اس کے فرائض اور اختیارات میں توسیع ہوتی گئی، چنانچہ یتیموں اور اور مجنونوں کی جائداد کی نگرانی وصایا کا سرانجام اور اوقاف کی نگرانی بھی اس سے

۱۔ منہاج ص ۳۵۱، ۳۵۲، ۵۷۹، ۵۸۰ ۔ ۲۔ منہاج ص ۱۹۴ ۔ برگس جلد ۱ ص ۲۲۵ ۔

۳۔ الیٹ جلد ۲ ص ۳۴۹ ۔ ۴۔ برگس جلد ۱ ص ۲۲۵ ۔

۵۔ بشیر احمد ص ۱۰۹ ۔ ۶۔ اسٹیوارٹ ص ۱۰۱ ۔

۷۔ بشیر احمد ص ۱۰۹ ۔ ۸۔ بشیر احمد ص ۱۰۹ ۔

۹۔ منہاج ص ۲۲۳ ۔ ۱۰۔ بشیر احمد ص ۱۰۶ ۔

متعلق ہو گئے۔ بلکہ قاضی بیواؤں کے عقد ثانی کا بھی انتظام کرتا تھا۔ نیز بڑکوں اور جائداد لاوارث کا انتظام بھی اس سے متعلق ہو گیا تھا[1]۔ متنازعہ جائدادوں کے متعلق یہ حکم تھا کہ وہ قاضی کے پاس امانتاً رکھی جائیں[2]۔ مقامی گورنر اور عہدہ داروں کو تاکید تھی کہ وہ قاضی کے ساتھ پورا تعاون کریں اور قانون کی عظمت قائم رکھیں۔ قاضی اپنے فیصلوں کی نظر ثانی بھی کر سکتا تھا۔

سلطنت دہلی کے بہت سے قاضی القضاۃ[3] غیر معمولی قابلیت کے لوگ تھے۔ بہ قول برنی، قاضی صدرالدین عارف۔ جو صدر جہاں اور قاضی القضاۃ تھا، اس قدر وسیع معلومات رکھتا تھا اور اتنا مردم شناس تھا کہ اس کی عدالت میں کوئی شخص جھوٹ کہہ سکتا اور نہ حیلہ حوالہ کرتا[4]۔ سلطان علاؤ الدین خلجی اور قاضی مغیث الدین میں کئی دفعہ کشمکش ہو گئی، چنانچہ ایک مرتبہ سلطان نے قاضی مغیث سے دیوگیر کے مال غنیمت کے متعلق پوچھا کہ دولت کس کی ملک ہے؟ قاضی نے کہا شرعاً بیت المال کی ملک ہے کیونکہ اسلامی فوج نے حاصل کیا ہے۔ اس پر علاؤ الدین نے پوچھا کہ بیت المال پر میرا اور میرے ورثا کا کیا حق ہے۔ قاضی نے جواب دیا کہ اگر آپ خلفائے راشدین کے نقش قدم پر چلیں تو آپ کو اسی قدر حصہ کا حق ہے جتنا کہ ہر سپاہی یا افسر لیتا ہے۔ لیکن اگر آپ ضرورت سے زیادہ حصہ لیں تو پھر آپ کو خدا کے سامنے جواب دینا پڑے گا[5]۔ علائی عہد کے ایک اور قاضی علاء الملک بہت مشہور ہیں۔ جب سلطان نے ساری دنیا فتح کرنے کا منصوبہ سوچا اور ایک نئے مذہب کی

---

[1] قریشی ص ۱۵۲ ۔ [2] ۔ قریشی ص ۱۵۲ ۔

[3] ۔ مشہور قاضیوں کی فہرست جو اس عہدے پر مامور تھے، ملاحظہ ہو بشیر احمد ص ۱۱۶ ۔

[4] ۔ برنی ص ۱۵۱ ۔

[5] ۔ محمد اللہ ص ۵۹ ۔ فرشتہ جلد ۱ ص ۱۱۱ ۔

ایجاد کا خیال کیا تو قاضی نے کہا کہ مذہب اور قانون آسمانی ہدایتوں سے وجود میں آتے ہیں، بادشاہوں کے منصوبوں سے نہیں بن سکتے۔ سلطان کو چاہئے کہ صرف ہندوستان کی حد تک اپنے کو مستحکم کرلے[1]۔ محمد تغلق نے قاضی القضاۃ کی عدالت سے اپنا ایک مقدمہ اٹھالیا، کیونکہ عدالت نے اس کی طرفداری سے انکار کردیا تھا[2]۔

عدالت قاضی القضاۃ کے دیگر عہدہ دار:

(۱) مفتی:۔ مشہور فقیہہ ہوتے تھے جو قاضی کو قانونی مشورہ دیتے۔ مفتی اور قاضی میں اختلاف ہو تو سلطان سے مشورہ کیا جاتا تھا[3]۔

(۲) پنڈت:۔ ہندوؤں کے دیوانی معاملات میں مفتیوں کی طرح پنڈتوں کو مقرر کیا جاتا تھا[4]۔

(۳) محتسب[5]:۔ عام اخلاق کی نگہداشت کرتے تھے اور کمزوروں کو ظالموں کے ظلم سے بچانے کی کوشش کرتے تھے[6]۔ دراصل بغداد میں ایک محکمہ "الحسبہ" قائم تھا[7] جو قانون ملک اور عام احکام کی پابندی اور نفاذ کرواتا تھا[8]۔ اس کے مطابق دلی میں بھی یہ محکمہ قائم ہوا۔ محتسب کا یہ فرض تھا کہ وہ مسجدوں میں دورہ کرے کہ آیا نماز برابر ہوتی ہے یا نہیں[9]۔ شاہراہ عام یا عام مقامات پر کسی شخص کو نشہ کی حالت میں

لہ۔ محمد اللہ ص ۵۹ ۔ ٹہ۔ بدایونی جلد ۱ ص ۲۳۹ ۔

تہ۔ بشیر احمد ص ۱۱۵ ۔ ٹہ۔ بشیر احمد ص ۱۱۵ ۔

شہ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خدا بخش ص ۲۹۲-۲۹۶ ۔ قریشی ص ۱۵۵-۱۶۴ ۔ برنی ص ۱۴۱ ۔

لہ۔ قریشی ص ۱۵۵-۱۵۶ ۔ شہ۔ بشیر احمد ص ۱۱۲ ۔

شہ۔ خدا بخش ص ۲۹۲-۲۹۶ ۔

لہ۔ خدا بخش ص ۲۹۳ ۔

نہ آنے دے۔ منشیات یا آلات موسیقی عام طور پر فروخت نہ ہونے دے[1]۔ محتسب یہ بھی دیکھتے تھے کہ کوئی شخص ناپ تول وغیرہ میں کسی کو کوئی فریب یا دھوکہ تو نہیں دے رہا ہے[2]۔ محتسب قرض داروں کو مجبور کرتے تھے کہ قرض خواہوں کے قرض ادا کریں اور اگر مدیون انکار کرتے تو معاملہ قاضی کے پاس جاتا تھا۔ قاضی اور محتسب میں بڑا فرق[3] یہ تھا کہ قاضی کے پاس جب تک معاملہ مقدمہ کی شکل میں نہ آتا، وہ دخل نہیں دیتا تھا۔ اور محتسب لوگوں کے معاملات میں دخل دیتا تھا[4]۔ نیز محتسب عاملہ کا عہدہ دار تھا اور قاضی عدلیہ کا[5]۔

(۴) قاضی القضاۃ کی مدد کے لئے ایک اور عہدہ دار "دادبک"[6] بھی ہوتا تھا[7]۔ دادبک صوبوں میں بھی متعین تھے اور یہ دراصل قاضیوں کے انتظامی مددگار تھے۔ دادبک کا فرض یہ تھا کہ ہر شخص جس کے نام عدالت سے حاضری کا حکم نامہ دیا جائے، برابر عدالت میں حاضر رکھا جائے۔ نیز عرضیوں کو ترتیب کے ساتھ رکھے[8] اور موجودہ زمانے کے سررشتہ دار عدالت کا کام کرے[9]۔

امیر داد:

عدلیہ کے مطالعہ کے سلسلے میں ایک اور اہم عہدہ دار غور طلب ہے

۱۔ خدابخش ص۲۹۴۔ ۲۔ قریشی ص۱۵۶۔

۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خدابخش ص۲۹۲-۲۹۳۔ ۴۔ خدابخش ص۲۹۳۔

۵۔ خدابخش: اورینٹ خلیفس ص۲۹۲۔ ۶۔ برنی ص۴۳۱۔

۷۔ راورٹی، طبقات ناصری ص۹۔

۸۔ راورٹی ص۹۔

۹۔ بشیر احمد ص۱۱۹-۱۲۰۔

جو امیر داد کہلاتا تھا۔ دار السلطنت میں امیر داد ایک اہم شخصیت کا مالک تھا اور سلطان کی عدم موجودگی میں یہ عدالت مظالم کی بھی صدارت کرتا تھا[1]۔ اور جب سلطان دار السلطنت میں موجود ہوتا تو امیر داد عادل نہ ہوتا بلکہ اس کا کام عاملانہ اور انتظامی شکل اختیار کرتا تھا[2]۔ عام طور پر امیر داد بلند کردار اور قابلیت کے لوگ ہوتے تھے اور ان کی تنخواہ بھی زیادہ ہوتی تھی، کیونکہ یہ گورنروں اور سپہ سالاروں کی شکایتیں سننے کے مجاز ہوتے تھے[3]۔ محمد تغلق کے عہد میں امیر داد کو پچاس ہزار "تنکہ" سالانہ دیے جاتے تھے[4]۔ صوبوں اور فوجوں میں امیر داد کے نائب کام کرتے تھے[5]۔ امیر داد کا بڑا کام یہ ہوتا تھا کہ قاضیوں کے فیصلوں کی تعمیل کروائے اور قاضی جو سزا سناتے تھے اس کا نفاذ کرے[6]۔ اگر امیر داد کو یہ شبہ ہوتا کہ قاضی نے فیصلے میں کوئی غلطی کی ہے تو وہ قاضی کو اس طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ نیز قانون کے متفقہ فیصلے یا اعلیٰ عدالت کے فیصلے تک تعمیلی کارروائی ملتوی رکھتا تھا[7]۔ کوتوال، پولس اور محتسب پر بھی اس کو اقتدار حاصل تھا[8]۔ امیر داد کے دفتر میں وہ تمام دستاویزات اور وثیقے محفوظ ہوتے تھے جن کو قاضی کی توثیق حاصل ہو جاتی[9]۔

محکمۂ عدلیہ کے اس مختصر سے مطالعہ کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ سلطنت دہلی میں کونسی عدالتیں تھیں اور ان کی نوعیت کیا تھی۔ اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ سلطنت کی انتظامی تقسیم کو پیش نظر رکھا جائے۔ یعنے یہ دیکھنا چاہیئے کہ (۱) دار السلطنت

۱۔ قریشی ص۱۵۳۔ ۲۔ منہاج ص۲۷۴-۲۷۶۔
۳۔ آداب الملوک اور کفایۃ الملوک کے حوالے سے قریشی ص۱۵۳۔
۴۔ قریشی ص۱۵۳۔ ۵۔ برنی ص۳۵۸-۳۶۱۔ ۶۔ قریشی ص۱۵۳۔
۷۔ قریشی ص۱۵۳ (ماخوذ از آداب الملوک)۔
۸۔ قریشی ص۱۵۳۔ ۹۔ قریشی ص۱۵۳-۱۵۴۔

(۲) صوبوں یا اقطاع (۳) ضلع یا سرکار (۴) پرگنے اور (۵) دیہات کی عدالتیں کون کونسی تھیں نیز یہ کہ (۶) فوج کی عدالت کس نوعیت کی تھی۔

(۱) دارالسلطنت کی عدالتیں:

مرکز میں بشیر احمد نے حسب ذیل عدالتیں بتائی ہیں[۱]:۔

عدالت	نوعیت	عہدہ دار
(۱) دیوان مظالم	فوجداری مرافعوں کی اعلیٰ ترین عدالت	صدر جہاں
(۲) دیوان رسالت	دیوانی 〃 〃 〃	〃
(۳) عدالت شاہی	ہر قسم کے مقدمات پیش ہوتے	سلطان
(۴) عدالت قاضی القضاۃ	〃 〃 〃 〃	قاضی القضاۃ
(۵) عدالت صدر جہاں	امور مذہبی سے متعلق مقدمات	صدر جہاں
(۶) دیوان سیاست	تعزیری جرائم سے متعلق عارضی طور پر قائم ہوئی تھی۔	محمد تغلق

بشیر احمد کے نقشے کے مطابق دارالسلطنت میں چھ قسم کی عدالتیں موجود تھیں، لیکن، جیساکہ اوپر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، صدر جہاں یا صدرالصدور کا عہدہ جب قاضی القضاۃ کے عہدے سے الگ رہا، صرف اسی وقت یہ نقشہ صحیح تھا۔ اور جب صدر جہاں اور قاضی القضاۃ، دونوں عہدوں پر ایک ہی شخصیت کام کرتی تھی، اس وقت اس نقشے میں صدر جہاں اور قاضی القضاۃ کا فرق باقی

---

[۱] بشیر احمد ص۱۰۴۔

نہیں رہتا۔ فوجداری اور دیوانی قسم کے مقدموں کے لئے علیحدہ علیحدہ عدالتیں یعنے "مظالم" اور "قضا" تو موجود تھیں لیکن "مظالم" کی، بہ قول قریشی صرف سلطان صدارت کرتا تھا اور سلطان کی عدم موجودگی میں امیر داد دیوان مظالم کا صدر ہوتا تھا[1] لیکن بشیر احمد نے صدر جہاں کو مظالم کا صدر بتایا ہے، حالانکہ صدر جہاں نے ہمیشہ اس کی صدارت نہیں کی۔ نیز دیوان رسالت کی بجائے نقشے میں دیوان قضاء لکھنا چاہئے تھا، کیونکہ دیوان رسالت تو قرون وسطی کا دفتر معتمدی تھا جس کی صدارت دیوان انشا یا نائب دیوان انشا کرتا تھا، چنانچہ خود ابوالفضل بیہقی ان دونوں عہدوں پر فائز رہا ہے۔ چوں کہ صدر جہاں یا صدر الصدور اور قاضی القضاۃ سلطنت دہلی میں عام طور پر ایک ہی شخص رہا[2]۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ دیوان قضا کا عہدہ دار قاضی القضاۃ ہی تھا۔ عدالت شاہی ہر سلطان کے زمانے میں قائم رہی اور اس میں ابتدائی اور مرافعہ دونوں نوعیت کے مقدمے آتے تھے۔ البتہ عدالت قاضی القضاۃ اور عدالت صدر جہاں ایسی عدالتیں تھیں جو صدر جہاں کے قاضی القضاۃ سے علیحدہ عہدہ دار ہونے کی صورت میں قائم رہیں۔ دیوان سیاست کو ایک عارضی عدالت سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ صرف محمد تغلق کے زمانے میں ہی قائم تھی اور محمد تغلق نے اپنے کو اعلیٰ ترین حاکم عدالت سمجھا تھا[3]۔ اس لئے دیوان سیاست کا تذکرہ بھی اس نقشے میں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

واحد حسین نے سلطنت دہلی کی حسب ذیل عدالتیں بتائی ہیں[4]:-

عہدہ دار	عدالت
سلطان	(۱) عدالت شاہی
میر عدل	(۲) چیف کورٹ آف جسٹس
قاضی القضاۃ	(۳) عدالت قاضی القضاۃ
قاضی	(۴) عدالت تحت متعلق امور مذہبی
عادل یا قاضی	(۵) عدالت تحت متعلق قانون ملک (کامن لا)

۱۔ قریشی ص۱۵۳۔ ۲۔ قریشی ص۱۵۱۔ ۳۔ محمد اللہ ص۵۹-۶۰۔
۴۔ اڈمنسٹریشن آف جسٹس ڈیورنگ مسلم رول ان انڈیا (کلکتہ ۱۹۳۴ء) ص۲۹۔

لیکن یہ تقسیم بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سلطنت دہلی کی عدالتیں جو دارالسلطنت میں تھیں، حسب ذیل ہیں :-

عدالت	نوعیت	عہدہ دار
(۱) عدالت شاہی	ابتدائی و مرافعہ	سلطان
(۲) دیوان مظالم	مرافعہ فوجداری	سلطان یا امیر داد (دیا بہ قول بشیر احمد صدر جہاں)
(۳) دیوان قضاء	دیوانی مرافعہ	صدر جہاں یا قاضی القضاۃ
(۴) عدالت امور مذہبی	معاملات امور مذہبی	" " " "
(۵) عدالت ماتحت مظالم	ابتدائی قسم کے فوجداری مقدمات	قاضی یا مددگار امیر داد
(۶) عدالت ماتحت قضاء	ابتدائی قسم کے دیوانی مقدمات	قاضی
(۷) دیوان ریاست	متعلق محکمۂ احتساب	محتسب
(۸) عدالت قاضی اُردو	فوجی چھاؤنی کی عدالت	قاضی اُردو[۲]

یہ نقشہ سلطنت دہلی کے تقریباً ہر سلطان کے زمانے میں صحیح بیٹھتا ہے۔

دیوان ریاست :

اس موقع پر دیوان ریاست کا مختصر سا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ دراصل محتسب کی عدالت تھی جہاں ان بیوپاریوں کو سزا دی جاتی تھی جو ناپ تول میں دھوکہ دیتے یا کھانے پینے کی چیزوں میں کچھ ملا دیتے تھے۔ مارکٹ کا

۱۔ بدایونی جلد ا صـ۱۱۲ ۔ ۲۔ قریشی صـ۱۲۰ ۔

یہ انتظام ایک ماتحت افسر کرتا تھا جو رئیس کہلاتا تھا۔ رئیس اشیاء کی مناسب قیمتیں مقرر کرتا اور بیوپاریوں اور خریداروں دونوں کا مفاد پیش نظر رکھتا[1]۔ محتسب کا یہ محکمہ دیوان ریاست یا دیوان عدل کہلاتا تھا۔ خلافت میں تو "معادل" کا یہ فرض تھا کہ دستاویزات کی رجسٹری کرے اور کوئی شخص عدالت میں بطور گواہ کے پیش ہو تو اس کے متعلق عدالت کے لئے ضروری معلومات فراہم کرے[2]۔ لیکن سلطنت دہلی نے "معدل" کا یہ فرض "داد بک" کے تفویض کر دیا اور "عدل" کا لفظ دیوان ریاست سے متعلق ہو گیا۔ دیوان ریاست کا قیام معاشی نظام پر قابو رکھنے کا اچھا حربہ تھا اور اس کی صحیح افادیت علاؤالدین خلجی کے عہد میں نظر آتی ہے۔ ان نئے اشیاء کی قیمتوں کا تعین اور مارکٹ پر قابو رکھنے کے لئے یعقوب نامی ایک افسر کو رئیس مقرر کیا تھا[3]۔

(۲) صوبوں یا اقطاع کی عدالتیں حسب ذیل تھیں[4]:

عدالت	نوعیت	عہدہ دار
(۱) عدالت ناظم صوبہ	ابتدائی و مرافعہ	گورنر
(۲) عدالت قاضی صوبہ	ابتدائی و مرافعہ متعلق امور مذہبی و قانون ملک	قاضی صوبہ
(۳) گورنر کی مجلس عدالت	صوبہ کی اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ	گورنر وغیرہ
(۴) عدالت دیوان صوبہ	عدالت مال۔ ابتدائی و مرافعہ	دیوان صوبہ
(۵) عدالت صدر صوبہ	امور مذہبی	قاضی صوبہ اور صدر صوبہ (متفقہ اجلاس)

---

[1] قریشی ص ۶۰-۶۱۔ [2] قریشی ص ۱۶۱۔

[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قریشی ص ۱۶۱-۱۶۲۔ [4] بشیر احمد ص ۱۱۶۔

صوبوں میں گورنر یا ناظم صوبہ، سلطان کی نمائندگی کرتا تھا، اور یہی سلطان کی طرح ابتدائی استغاثے اور مرافعوں کی سماعت کرتا تھا۔ ابتدائی مقدموں میں تو تنہا اجلاس کرتا تھا، اور جب اس کے فیصلوں سے تشفی نہیں ہوتی تو مقدمہ باز دارالسلطنت کی عدالت مرافعہ میں چارہ کار اختیار کرتے تھے۔ لیکن جب گورنر کے پاس صوبہ کے دیگر عہدہ داروں کے فیصلوں کے خلاف مرافعہ ہوتا تو اس کی سماعت کے لئے ایک مجلس منعقد ہوتی جو قاضی صوبہ اور گورنر پر مشتمل ہوتی۔ اس مجلس میں نہ صرف تمام صوبہ داری عدالتوں کے مرافعے پیش ہوتے تھے بلکہ خود قاضی صوبہ کے فیصلوں کے مرافعے بھی آتے تھے۔ اور شاید ایسی صورت میں قاضی صوبہ مجلس کا رکن نہ ہوتا۔ مجلس کے فیصلوں سے بھی تشفی نہ ہو تو دارالسلطنت کی عدالت مرافعہ میں چارہ کار تھا۔[1] مالگزاری سے متعلق مقدمات گورنر یا دیوان کے پاس آتے تھے اور قاضیوں کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔[2]

صوبے کا سب سے بڑا قاضی، قاضی صوبہ تھا اور اس کو دیوانی و فوجداری دونوں قسم کے اختیارات حاصل تھے۔[3] قاضی، صوبے کے تمام نظام عدلیہ کا ذمہ دار اور اعلیٰ افسر تھا۔ اس کے اختیارات غیر محدود تھے اور اضلاع سے اس کے پاس مرافعے آتے تھے۔ قاضی صوبہ کا درجہ صوبہ کے گورنر کے بعد سمجھا جاتا تھا، مگر یہ گورنر کا ماتحت نہ تھا۔ جو کارروائیاں مذہب کے خلاف ہوتی تھیں، ان کے انسداد کے لئے مخصوص عدالتوں کا قیام عمل میں آتا تھا اور قاضی صوبہ ان عدالتوں کی صدارت کرتا تھا۔[4]

قاضی صوبہ کا انتخاب دارالسلطنت کا قاضی القضاۃ یا صدر جہاں کرتا

---

[1] بشیر احمد ص۱۱۷۔ [2] بشیر احمد ص۱۱۷-۱۱۸۔
[3] بشیر احمد ص۱۱۸۔ [4] بشیر احمد ص۱۱۸۔

اور سلطان کے فرمان سے اس کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ قاضی کے تقرر کی شرط یہ تھی کہ وہ جید عالم اور فقیہہ ہو۔ اور بہ قول برنی "شرط قضا علم مجرد نیست۔ بلکہ از لوازم شرط قضا تقویٰ است...... نجات بادشاہ نہ باشد تا قصاء بہ متقی ترین علماء بلاد ممالک خود نہ دہد[1]۔ قاضیوں کا ایک صوبے سے دوسرے صوبے کو تبادلہ بھی ہوا کرتا۔ نیز قاضی کا تنزل بھی ہو سکتا تھا اور وہ برطرف بھی کیا جاتا تھا[2]۔ اضلاع کے قاضیوں کا انتخاب قاضی صوبہ ہی کرتا اور گورنر کے پاس ان کے تقرر کی سفارش ہوتی تھی[3]۔ صوبے کے قاضی ترقی کر کے قاضی القضاۃ کی خدمت پر فائز ہو سکتے تھے[4]۔

دیگر عہدہ دار جو قاضی صوبہ کے ماتحت تھے، مفتی۔ محتسب۔ پنڈت اور داد بک ہیں[5]۔ دیوان صوبہ[6]، مالیہ اور مالگزاری کا عہدہ دار تھا اور اس کے فیصلوں کی ناراضی سے گورنر یا سلطان کے پاس مرافعہ ہوتا تھا۔ صدر صوبہ[7]، صوبوں میں صدر جہاں کی نمایندگی کرتا تھا اور محکمۂ امور مذہبی اس سے متعلق تھا۔ اور ایسے انتظامی معاملات جو قاضی سے غیر متعلق رکھے گئے تھے، صدر صوبہ کے پاس آتے تھے۔

۱۔ برنی ص ۳۵۲۔

۲۔ قاضی تاج الدین کو اودھ کی قضاۃ سے معزول کیا گیا۔ ملاحظہ ہو برنی ص ۳۴۸۔ قاضی جلال الدین کاشانی کو بدایون کی قضاۃ پر منتقل کر دیا گیا۔ ملاحظہ ہو الیٹ جلد ۳ ص ۱۴۵۔

۳۔ بشیر احمد ص ۱۱۹۔

۴۔ عباسی خلافت کا بھی یہی طریقۂ عمل تھا۔ ملاحظہ ہو امیر علی ص ۱۸۸۔

۵۔ بشیر احمد ص ۱۱۹۔ ۶۔ بشیر احمد ص ۱۲۰۔

۷۔ فیناگس۔

۸۔ بشیر احمد ص ۱۲۰۔

(۳) ضلع یا سرکار کی عدالتیں[1]:

اختیار سماعت	عہدہ دار عدالت
(۱) تمام قسم کے دیوانی و فوجداری مقدمے (۲) پرگنہ کے (الف) قاضیوں (ب) کوتوالوں اور (ج) دیہی پنچایتوں کے فیصلوں کے مرافعے۔	(۱) قاضی
معمولی قسم کے دیوانی مقدمے۔ مرافعہ قاضی صوبہ کے پاس ہوتا۔	(۲) داد بک
معمولی قسم کے فوجداری مقدمے، مرافعہ ناظم صوبہ کے پاس ہوتا۔	(۳) فوجدار
زمینات اور رجسٹری وغیرہ کے جھگڑے۔ صدر صوبہ کے پاس مرافعہ ہوتا۔	(۴) صدر
مالگزاری کے مقدمات۔ دیوان صوبہ کے پاس مرافعہ ہوتا۔	(۵) عامل
معمولی قسم کے تعزیری مقدمات۔ پولس کے مقدمات۔ مرافعوں سے متعلق کوئی مواد نہیں ملتا۔	(۶) کوتوال

قاضی کو دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے مقدموں کی سماعت کا اختیار تھا:۔
امور واقعاتی اور امور قانونی دونوں میں قاضی کو فیصلے کا اختیار تھا البتہ امور قانونیہ

---

[1] بشیر احمد صفحہ ۱۲۰-۱۲۱۔

وہ مفتی کا مشورہ حاصل کرتا تھا۔ تعزیری جرائم میں قاضی سزائے موت بھی دے سکتا تھا۔[1]
قاضی سرکار کے دیگر فرائض حسب ذیل تھے:[2]—

(۱) شادیوں کا رجسٹری میں اندراج کرنا (۲) وقف اور امانتوں سے متعلق مقدمات کی سماعت (۳) لاوارث جائداد، کمسن، مفقود الخبر اور مجنونوں سے متعلق مقدمات کی سماعت (۴) جیل خانوں کی نگرانی۔

دیگر عہدہ داروں میں، جو قاضی سرکار کے ماتحت تھے، مفتی، پنڈت، محتسب، اور داد بک شامل ہیں۔[3] قاضی سرکار کی عدالت میں حسب ذیل عملہ کام کرتا تھا:—

(۱) کاتب۔ جو بیانات اور شہادت قلمبند کرتا تھا۔
(۲) فقیہ۔ جو فتوے اور نظائر لکھتا تھا۔
(۳) ناظر۔ جو عدالت کے تمام انتظامی امور کا ذمہ دار تھا۔
(۴) ماتحت منشیاں۔
(۵) برقنداز۔ یعنے چوکیدار اور نگران کار۔

نیز علاؤالدین خلجی کے زمانے سے اخبار نویس بھی مقرر ہونے لگے اور ان کا کام یہ تھا کہ عدالت کی روزانہ روئداد لکھا کریں تاکہ معائنہ کے لئے جو عہدہ دار دورہ کرتے ہیں، ان کے سامنے عدالت کا پورا کام آجائے۔[4]

سرکار میں فوجدار کو گورنر مقرر کرتا تھا اور اس کا کام یہ تھا کہ جن اشخاص پر کسی جرم کا یا کسی اور قسم کا شبہ ہو، ان کو پابند رکھے۔ یہ دراصل مقامی فوجوں کو کمان کرتا تھا اور اس کا کام عاملانہ تھا۔[5]

۱۔ بشیر احمد ص ۱۲۱۔　۲۔ بشیر احمد ص ۱۲۲۔　۳۔ بشیر احمد ص ۱۲۲۔
۴۔ بشیر احمد ص ۱۲۳۔　۵۔ بشیر احمد ص ۱۲۳۔

(۴) پرگنے کی عدالتیں:[1]

(۱) قاضی پرگنہ .... (۱) تمام قسم کے دیوانی و فوجداری مقدمے
(۱) مقدمات متعلق امور مذہبی
(۲) کوتوال .... معمولی قسم کے تعزیری مقدمے

قاضی پرگنہ کو قاضی سرکار کے تمام اختیارات حاصل تھے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ قاضی پرگنہ کو مرافعہ کے اختیارات حاصل نہ تھے۔ قاضی سرکار کی طرح قاضی پرگنہ کے تحت بھی مفتی، محتسب وغیرہ تھے۔ پرگنوں میں کوئی فوجدار نہ تھا۔ سب سے بڑا پولیس کا عہدہ دار کوتوال تھا اور یہ معمولی قسم کے تعزیری مقدموں کی سماعت بھی کرتا تھا۔

(۵) دیہات کی عدالت:

دیہات میں پنچایت دیہی عدالت کا کام دیتی تھی اور اس کا سرپنچ ناظم یا فوجدار کی طرف سے مامور ہوتا تھا۔ مقامی نوعیت کے تمام ابتدائی اور فوجداری مقدمات پنچایت کے سامنے آتے تھے۔[2]

(۶) فوج کی عدالتیں:

ہر فوجی چھاؤنی کے لئے قاضی اردو یا قاضی عسکر مقرر ہوتا تھا اور فوجی چھاؤنی کی حد تک اسے پورا اختیار سماعت حاصل تھا۔ اس قاضی کے اختیارات وہی ہوتے تھے جو قاضی پرگنہ کو حاصل تھے۔[3] نیز فوجی چھاؤنیوں میں قاضی کے علاوہ امیر داد کے نائب مقرر ہوتے تھے۔[4]

---

[1] بشیر احمد ص ۱۲۳۔ [2] بشیر احمد ص ۱۲۴-۱۲۵۔ [3] بشیر احمد ص ۱۲۵۔ [4] برنی ص ۳۵۰-۳۵۱۔ نیز دیکھئے قریشی ص ۱۹۳۔

دہلی کے نظام عدل گستری کی خصوصیتیں

سلطنت دہلی کے نظام عدل گستری کے اس مطالعہ کے بعد اس نظام کی بعض خصوصیتیں ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ دہلی کے بہت سے ادارات بغداد کے ادارات سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ اور جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، سلاطین دہلی نے غزنویوں، اور پھر ان کے توسط کی عرب حکومت نیز سامانیوں وغیرہ کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھایا اور براہ راست خلافت بغداد سے بھی متاثر ہوئے۔ اس سے بظاہر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ سلاطین دہلی کو تمام بنے بنائے ادارات مل گئے اور سلاطین کو اس میں کچھ اضافہ کرنا نہیں پڑا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سلاطین نے بغداد وغیرہ سے ادارات کے اسلوب تو ضرور حاصل کئے تھے لیکن ان کو جوں کا توں نہیں رکھا بلکہ ان کو ہندوستانی ماحول میں ضروریات کے مطابق ڈھال دیا اور سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں جب کہ دنیا کی اکثر حکومتیں نظم ونسق میں ناکام تھیں اور انتشار پھیلا ہوا تھا، ان سلاطین نے بڑی کامیابی سے ایک بہترین نظم ونسق قائم کیا اور پھر اسلامی عدل گستری کے ادارے میں، جو ان کو باہر سے ملا تھا بہت سے اضافے بھی کئے۔

خصوصیتیں:

(۱) ایسے لوگوں کے لئے جو خلاف اخلاق اور خلاف شرع زندگی گذارتے تھے، محتسب مقرر کئے گئے اور ان کے فرائض اتنے وسیع تھے کہ افراد مملکت کی خانگی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھے۔

(۲) قاضی اور مملکت کے دیگر عہدہ دار محض سرکاری ملازمت کی خاطر نہیں بلکہ

اپنے ضمیر کو سامنے رکھ کر اور خدا سے ڈر کر نظم ونسق میں حصہ لیتے تھے۔

(۳) دیہی پنچایتوں کو سلاطین نے قائم رکھا اور قدیم دیہی نظم ونسق سے پورا فائدہ اٹھایا۔

(۴) محمد تغلق کے زمانے میں ایک نیا محکمہ "دیوان سیاست" بنایا گیا جو سنگین جرائم کی سزائیں دیتا تھا۔

(۵) فیروز تغلق نے تعزیری سزاؤں میں جو حسب شرع مقرر تھیں، ترمیم کی اور ایک نئے ضابطہ قانون کی بنا ڈالی[۱]

(۶) عدالتوں کی کارروائیوں سے واقف ہونے اور عدالتوں کو صحیح راستے پر چلانے کے لئے سلاطین عدالتوں سے باخبر رہتے تھے اور اخبار نویس عدالتوں کی روزانہ روئداد لکھ کر سلطان کو عدالتوں سے باخبر رکھتے تھے۔

(۷) ہندوؤں سے متعلق دیوانی مقدموں میں پنڈتوں سے کام لیا جاتا تھا۔ بغداد میں غیر مسلموں کے معاملات میں بھی یہی طریقۂ عمل تھا[۲]

(۸) ایسے قاضی جو نااہل یا بدکردار ثابت ہوئے خدمت سے الگ کر دیئے گئے۔

(۹) وزیر یا وزیر اعظم کو خاص مقدموں میں اختیار سماعت حاصل تھا۔ بغداد میں بھی یہی طریقہ رائج تھا[۳]

(۱۰) سلاطین دہلی نے ہندوستان کے قدیم نظم ونسق سے فائدہ اٹھایا۔

(۱۱) سلاطین نے رسم ورواج کو بھی نظام عدل گستری میں جگہ دی جس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ہندوستانی رسوم مسلمانوں کی زندگیوں پر قابل لحاظ اثر کرنے لگے۔

(۱۲) عدلیہ کو عاملہ سے حتی الامکان علیحدہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔

---

[۱] بشیر احمد ص [illegible] امیر علی ص۱۸۸-۲۳۳ [۲] بیانات بنام خواجہ احمد و فیروز شمس سراج عفیف ص [illegible] وغیرہ [illegible] ص۱۴۸۔

پندرھویں صدی کے بعد اسلامی دنیا کی حالت

از

جناب محمد ابو نصر خالدی صاحب (ایم اے عثمانیہ)

پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی اسلام کی فوجی کامیابیوں کا نہایت شاندار زمانہ ہے۔ ایک طرف تو اسلامی فوجوں نے بازنطیہ فتح کرکے دنیا کو دھمکی دینا شروع کردیا اور دوسری طرف عثمانی سلطنت کے پہلو بہ پہلو دو زبردست اسلامی قوتوں کو بھی عروج ہونے لگا یعنی ایران میں خاندان صفویہ کو اور ہندوستان میں بابر کی اولاد کو جو عام طور پر شاہان مغلیہ کہلاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہی دو صدیاں پوری اسلامی دنیا کی قسمت کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوئیں۔ پورے ایک ہزار سال سے مسلمانوں کو مغربی ایشیا کی تہذیب میں جو بلند مرتبہ حاصل تھا وہ اب ختم ہو گیا اور ترقی کی علمبرداری مغربی یورپ کے حصہ میں آئی۔ جن واقعات کا ہم نے ذکر کیا ہے ان سے ظاہر ہے کہ اس مظہر کو صرف اس طرح نہیں سمجھایا جاسکتا کہ ایک ہزار سال تک تہذیبی جد و جہد کرنے کے بعد مسلمانوں میں قدرتاً کمزوری پیدا ہوئی تھی۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ عرب و ایران اس وقت تک وہ سب کچھ کر چکے تھے جو وہ کرسکتے تھے اور یہ کہ ترکوں میں

کسی قسم کے تخلیقی کام کی صلاحیت نہیں تھی۔ قدیم تہذیب کے زوال سے کچھ ہی پہلے رومی مصنف یہ خیال کرنے لگے تھے کہ غیر معمولی بار پڑنے کی وجہ سے دنیا از کار رفتہ ہوگئی ہے زمین کی زرخیزی ختم ہوگئی ہے اور معدنیں خالی ہوگئیں ۔ آبادی کم ہو رہی ہے حتیٰ کہ کسی کو سپاہیوں کی کافی تعداد بھی مہیا نہیں ہو رہی ہے اور نہ کافی ملاح دکاشت کار مل رہے ہیں۔ لیکن پندرھویں صدی عیسوی کے اسلامی ادب میں ہم کو اس قسم کی شکایتیں نہیں ملتیں اور اگر ہم اس دور کے سیاسی واقعات سے اندازہ لگائیں تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کی شکایت کا کوئی عذر وحیلہ بھی ان کے پاس نہ تھا۔ تہذیب کو ترقی دینے اور اس کی رہبری کرنے کے لیئے اسلامی دنیا میں اب بھی تازہ قوت وصلاحیت موجود تھی۔ بایں ہمہ وہ نصرانی یورپ سے مسابقت نہ کر سکی کیوں کہ تیرھویں صدی عیسوی کے بعد سے یورپ میں شہری زندگی، تجارت اور صنعت وحرفت میں بہت تیزی سے ترقی ہو رہی تھی۔ بخلاف مغربی ایشیا کے جہاں کے مہذب ملکوں پر وحشیوں کے قبضہ کی وجہ سے مملکت اور مختلف طبقوں کی کشمکش نے کوئی پیچیدہ صورت اختیار کرلی تھی۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یورپی اصول فن کو وہ فتوحات حاصل ہوئیں جن کی وجہ سے بعد میں یورپ کو تمام دنیا پر سیاسی وتمدنی اقتدار حاصل ہوا۔ مشرق بعید اور غالباً مشرق قریب میں بھی بارود کی صنعت ایک مدت سے معلوم ومصروف تھی اور شاید جنگوں میں استعمال بھی ہوتی تھی۔ لیکن آتشیں اسلحہ صرف یورپ ہی میں ایجاد ہوئے۔ یورپی صناعوں کے ذریعہ ان کے مسلمان ہمسائے بھی بہت جلد اس ایجاد سے واقف ہوگئے۔ چناں چہ قسطنطنیہ کے محاصرہ میں ترکوں نے آتشیں اسلحہ بکثرت استعمال کیئے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے فنون حرب کسی طرح اہل یورپ سے کم درجہ نہیں تھے لیکن دور و دراز کی اسلامی تہذیب کی انتہائی حد ملائیشیا میں سولھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک آتشیں اسلحہ سے کوئی واقف

نہ تھا اور اسی وجہ سے روسیوں کو یہ علاقہ فتح کرنے میں بہت سہولت ہوئی۔ بارود کے استعمال کی طرح فن جہاز سازی میں اہل یورپ کی کامیابیوں سے بھی اس کشمکش میں بڑی مدد ملی۔ راس امید کی دریافت کے بعد جب یورپی جہاز بحر ہند تک پہنچ گئے تو اس وقت مسلمانوں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اہل یورپ کے خلاف جنگ آزمائی کر سکے۔ اس لیئے ان کو ہندوستان و چین کی بحری تجارت اہل یورپ کے حوالہ کرنی پڑی۔ مسلمان فوراً اس نقصان کی تلافی نہ کر سکے۔ سولھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ترکی میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کیا جاتا تھا کہ سمندروں پر اہل یورپ کے تسلط سے مسلمانوں کو کس قدر زبردست خطرہ پیدا ہو گیا ہے جس طرح کسی زمانہ میں اہل یورپ نے عربوں کی تقلید کی تھی اسی طرح اب مسلمانوں نے یورپی نمونہ پر بحریہ تیار کرنے کی طرف قدم اُٹھایا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اسلامی ترکی میں بحریہ کے صدر کو یورپی لفظ - ۔کپودوں پاشا سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس تمام نصرانی یورپ میں کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو عربی لفظ امیر البحر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ صرف ایک مرتبہ یعنے ۱۵۳۸ء میں ہندوستانی ساحلوں پر چڑھائی کرنے کے لیئے ترکی سلطان ایک بحریہ تیار کرنے میں کامیاب ہوا لیکن یہ کوشش ناکام ہوئی اور اس قسم کی کوشش دوبارہ پھر کبھی نہیں کی گئی یورپ کی فن جہاز سازی میں کامیابی اور امریکہ کی دریافت کی وجہ سے عالم گیر تجارت کے پرانے راستے بے کار ہو گئے، اور اب بحری تجارت کا دور شروع ہوا۔ کاروانی تجارت جس کی وجہ سے سمرقند اور ہرات جیسے شہروں کو ترقی و مرفہ الحالی نصیب ہوئی تھی بالکل ختم تو نہیں ہوئی لیکن اب اس کی پہلی سی اہمیت باقی نہیں رہی۔

اسی صدی میں یورپی اصول فن نے تمدن کو ایک زبردست ایجاد یعنے طباعت سے مالامال کر دیا۔ چین میں فن طباعت سے لوگ اس سے مدتوں پہلے

واقف ہو چکے تھے۔ خود اہل یورپ بھی اس فن سے غالباً چین میں روشناس ہوئے تھے۔ چین سے یہ فن مشرق بعید کے ملکوں میں داخل ہوا۔ اسی ملک کی دوسری قوم یعنے کوریا کے رہنے والوں نے متحرک دھاتی حروف ایجاد کرلیئے تھے۔ اس حیثیت سے یہ لوگ اہل چین اور اہل یورپ دونوں کے پیشرو تھے۔ چینیوں کے ذریعہ اہل ایران بھی فن طباعت سے اچھی طرح واقف تھے چنانچہ رشید الدین نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ بایں ہمہ مشرق بعید کی دنیا نے اس ایجاد سے وہ فائدہ نہیں اُٹھایا جو اہل یورپ نے اُٹھایا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں نے بھی اس سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ یورپ میں پندرھویں صدی عیسوی میں خواندہ لوگوں کی تعداد نسبتاً بہت کم تھی بریں ہم نہ صرف بہت سی ادبی کتابیں بلکہ علمی کتابیں بھی طبع کی گئیں حتیٰ کہ سولھویں صدی عیسوی میں اہل یورپ نے علمی اغراض کے لیئے مشرقی زبانوں کی کتابیں چھاپنی شروع کردیں۔ اسلامی دنیا خصوصاً ترکی میں طباعت کے فن سے استفادہ کرنے کی ابتدا اٹھارھویں عیسوی جاکر شروع ہوئی۔ مسلمانوں نے اہل یورپ کے آتشیں اسلحہ تو بلا پس و پیش اختیار کرلیئے لیکن کافروں کی دوسری ایجادوں خصوصاً فن طباعت کو رائج کرنے کے لیئے مذہبی حاکموں کا مخصوص فتویٰ حاصل کرنا ضروری تھا اس لیئے کہ مطبوعہ کتابوں کے استعمال سے مدرسہ کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ اور مذہب و مدرسہ میں جو قریبی تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔

چین اور مغربی یورپ کا موازنہ اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کردیگا کہ فنّی کارنامے بجائے خود معاشری زندگی میں ترقّی کا باعث نہیں ہوئے۔ چین کی مثال سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بارود سے واقف ہو کر بھی فوج تیار نہ کرنا، قطب نما سے واقفیت کے باوصف جہازرانی میں مصروف نہ ہونا اور طباعت کا فن جاننے کے باوجود رائے عامّہ کو تشکیل نہ دینا ممکن ہے۔ یورپ میں

نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ساتھ معاشی وتمدنی زندگی میں بھی عام ترقی ہوتی گئی اور اس چیز نے اسلامی تہذیب کو دوسرے درجہ پر لا ڈالنے میں اہل یورپ کی بڑی مدد دی، غرض اگر یہ عام ترقی نہ ہوئی ہوتی تو صرف چھاپے کے رواج سے یورپ میں وہ نتائج نہ نکلتے جو اس صورت میں نکلتے۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کو مجبوراً اسلامی زبانوں اور ادب وتاریخ کے مطالعہ کے لئے بھی اہل یورپ کا دست نگر ہونا پڑا۔ اسی سترھویں صدی عیسوی میں یورپی ہئیت داں چین میں مسلمانوں کی جگہ لے رہے تھے اور یورپ میں مشرقی مخطوطوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ مشرق کا سفر کیئے بغیر ایک فرانسیسی عالم اسلامی علوم کا انسائیکلو پیڈیا تیار کر دیتا ہے[1]۔

یہ خیال کرنا سخت غلطی ہوگی کہ پندرھویں صدی عیسوی کے بعد اسلامی دنیا جہالت کے غار میں پڑ گئی تھی اور یہ کہ اس نے قدر وقیمت کی کوئی چیز پیدا نہیں کی۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کی ترکی سلطنت صرف اپنی فوجی قوت ہی کی وجہ سے مشہور نہیں تھی۔ قسطنطنیہ اسلامی دنیا کا ایک سب سے زیادہ اہم تہذیبی مرکز بن گیا تھا۔ یہاں کے کتب خانوں میں فارسی کے جو مخطوطات تھے اس کے اعتبار سے سینٹ پیٹرزبرگ اور لندن کے بعد اسی کا درجہ تھا۔ اس زمانہ کا تہذیبی کام صرف گزشتہ زمانہ کی کتابوں کے مطالعہ تک ہی محدود نہیں تھا۔ ایک نئی قسم کا فن تعمیر جدید اصول پر قائم کیا گیا جو ایرانی طرز سے بہت مختلف تھا۔ سولھویں صدی عیسوی کے بہترین یونانی الاصل ترکی کارستان کی بنائی ہوئی عمارتیں فنی شان وشوکت کے اعتبار سے نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپی فن تعمیر کے مقابلے میں امتیازی شان رکھتی تھی۔ خود سنان کا خیال تھا کہ اس کی بنائی ہوئی عمارتوں میں بہترین عمارت ریڈریا نوپل میں سلطان سلیم ثانی (۱۵۶۶ء تا ۱۵۷۴ء) کی مسجد ہے۔

---

[1] ۔

کاتب چلپی یا حاجی خلیفہ سترھویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس نے دوسری کتابوں کے علاوہ ایک مکمل کتاب کشف الظنون بھی تالیف کی تھی جس میں اس نے علوم و فنون کی تمام شاخوں سے بحث کی ہے۔ حاجی خلیفہ کی دوسری کتابوں میں علم جغرافیہ پر ایک تالیف خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں سب سے پہلی مرتبہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ یورپی جغرافیائی ادب کا مسلمانوں کی جغرافیائی معلومات سے مقابلہ و موازنہ کیا جائے۔ اس وقت تک یورپ میں اس قسم کی کوئی کوشش نہیں ہوئی تھی۔ اس صدی میں علائی چلپی نے اپنے سفر کے حالات ایک کتاب میں جمع کر دیئے ہیں۔ گو اس میں کچھ ایسی باتیں بھی درج ہیں جن کا کہیں وجود نہیں تھا تاہم اپنی حد تک مکمل اور ہر جہتی معلومات پر مشتمل ہونے کی حیثیت سے یہ سفرنامہ ان تمام کتابوں سے بلند مرتبہ ہے جو عرب جغرافیہ نویسوں نے لکھی تھیں۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ایران میں عباس اعظم کی شاندار حکومت کا آغاز ہوا۔ اس دور حکومت کی یادگاریں دارالسلطنت اصفہان اور دوسرے شہروں میں آج تک باقی ہیں۔ عباس کے ایک ہم عصر اطالوی سیاح کے الفاظ میں شاہ کے عہد حکومت میں بنے ہوئے شاہی چوک اور چہار باغ کی سڑکیں نصرانی شہروں کے بہترین بازاروں اور سڑکوں سے کس طرح کم درجہ نہیں تھے۔ حالیہ قاچاری خاندان نے بھی مرکزی حکومت کو قوی کرنے کے علاوہ شہری زندگی کو ترقی دینے کی بھی کوشش کی۔ اس زمانہ میں نہ صرف دارالسلطنت طہران بلکہ شہر تبریز نے بھی ترقی کر کے بڑا شہر بن گیا ہے حال آں کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں تبریز پر زوال آچکا تھا۔ سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں شاہان مغلیہ کی حکومت صفویوں کی حکومت سے بھی زیادہ شاندار رہی۔ یہاں ہندی اثرات کے تحت اسلامی فن تعمیر نے ایک نئی شکل اختیار کر لی تھی۔ مغلوں کی بنائی ہوئی عمارتیں

اس زمانہ میں سب سے زیادہ شان دار سمجھی جاتی تھیں۔ شاہان مغلیہ کے تصرف میں جتنی دولت تھی وہ فرانس کے چودھویں لوی کے سالانہ موازنہ سے کہیں زیادہ تھی حال آں کہ تمام یورپ میں فرانس ہی سب سے زیادہ مال دار مُلک تھا۔

ترکستان میں بھی، جہاں سولھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں وحشی ازبکوں نے تیموریوں کی سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا۔ وحشت و بربریت کو تہذیب پر پورا غلبہ حاصل نہیں ہوا، جیسا کہ شیر دار اور تلیکری کے مدرسوں کی عمارتوں سے ظاہر ہے۔ سمرقند میں تیمور اور آل تیمور کے دَور کی تعمیری روایات سترھویں صدی عیسوی میں بھی باقی تھیں اگرچہ بعد کو کاشی کاری کا فن باقی نہیں رہا۔ جس کی وجہ سے یہاں کی عمارتوں کی شان دوبالا ہو جاتی تھی۔ اس عہد میں بھی بخارا میں بہت سے شان دار کتب خانے موجود تھے اور اس زمانے کے مورخ اپنی کتابوں میں شائین اور را واقین کے فلسفہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ازبکوں کے تسلط سے خوارزم میں تجارت اور تمدنی زندگی درہم برہم ہوگئی تھی۔ بریں ہم بڑی بڑی نہریں تیار ہو جانے کی وجہ سے فن زراعت میں بھی کچھ نہ کچھ ترقی ضرور ہوئی۔ انیسویں صدی عیسوی میں فرغانہ میں خوقند قانون کے زیر حکومت نہ صرف آب رسانی کے نہایت زبردست کام انجام پائے بلکہ بڑے بڑے جدید شہر بھی بسائے گئے۔ ترکستان کے جن حصوں کو چینیوں نے فتح کر لیا تھا وہاں کے اسلامی فن تعمیر پر چینی اثر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ جس طرح ہندوستان میں شاہان مغلیہ کے دورِ حکومت میں ایک مخلوط طرز تعمیر وجود میں آیا اسی طرح ترکستان میں نہ صرف سرکاری عمارتیں بلکہ مسجدیں بھی مخلوط طرز تعمیر کی ہونے لگیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا کا اکثر اوقات جو یہ نقشہ کھینچا جاتا ہے کہ اس زمانہ سے پوری اسلامی دنیا اس وقت تک خواب غفلت میں پڑی رہی جب تک کہ انیسویں صدی عیسوی میں اہل یورپ نے اسے دوبارہ

بیدار نہیں کیا ۔ بڑی حد تک یہ رائے مبالغہ آمیز ہے اور اس لئے گمراہ کن ہے۔ البتہ صرف اتنی بات صحیح ہے کہ اسلامی تہذیب جن موافق حالات میں پیدا ہوئی تھی وہ حالیہ زمانہ میں مفقود ہیں ۔ اس عہد کی اسلامی قوتوں کو مجبوراً حربی معاملات کو سب سے مقدم رکھنا پڑا اور آبادی کی انہی عناصر کی حمایت کرنی پڑی جن سے ان کو فوجی امداد مل سکتی تھی ۔ اگرچہ ایسا کرنے میں ان کو بعض وقت تہذیبی مقاصد کو قربان کرنا پڑتا تھا ۔ عثمانلی خاندان ابتداء میں مذہب سے بالکل بے پرواہ اور درویشوں کی آزاد خیالی سے متاثر تھا لیکن حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر ان کو مسلمانوں کی حربی روایات پر زیادہ زور دینا پڑا ۔ سنہ ۱۵۹۳ء عیسوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سبز جھنڈا پہلی مرتبہ میدان مصاف لایا گیا۔ (مشہور ہے کہ یہ پرچم دمشق میں دستیاب ہوا تھا ۔ مگر تعجب ہے کہ ابتدائی ماخذوں میں اس کی موجودگی کا کوئی ذکر نہیں ملتا) ان حالات کے تحت مملکت کو آزاد خیالی کے خلاف مذہب کے حامیوں کی اور کاشت کاروں اور شہری باشندوں کے خلاف البانیوں اور کردوں جیسی جنگجو قوموں کی طرفداری کرنی لازمی تھی۔

ایران میں بھی اسی قسم کے رجحانات تھے جہاں صفوی خاندان کے بانی نے شیعیت کو مملکت کا مذہب قرار دے کر مغرب میں عثمانلی ترکوں اور مشرق میں ازبکوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے کا بہانہ بنایا اس لئے کہ ایران کے یہ دونوں ہمسائے سُنی مذہب کے پیرو تھے ۔ سولھویں صدی عیسوی سے شیعہ سُنی کشمکش نے سخت تعصب آمیز رنگ اختیار کر لیا حالانکہ قرون وسطیٰ میں بھی یہ بات پیدا نہیں ہوئی تھی ۔ اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ شیعوں اور سُنیوں نے اپنے اپنے مذہبی عالموں کے فتووں کی بناء پر ایک دوسرے کو کافر بنانا شروع کیا ۔ صفویوں کا خیال تھا کہ ایران کو بچانے کا تنہا ذریعہ شیعیت ہی ہو سکتی ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے خاندانی جھگڑوں کے زمانہ میں سکوں پر بعض وقت ایک شیعی امام کا نام کندہ ہوتا تھا۔ جو نویں صدی عیسوی کی ابتدا میں گزرے تھے۔ اور مشہد میں دفن تھے۔ مذہب کے حامیوں نے راسخ العقیدہ ترکی کی بہ نسبت آزاد خیال ایران میں زیادہ قوت حاصل کی اور عامۃ الناس میں ترکی سے زیادہ وحشیانہ اور بے لگام مذہبی جوش پیدا کیا۔ مغلوں کے زیر حکومت صرف ہندوستان کے حالات مختلف تھے۔ اس مُلک کی اسلامی حکومت مال و دولت اور مذہبی رواداری دونوں میں ہم عصر یورپ سے بہت برتر تھی۔ بایں ہمہ ہندی مسلمان بھی تہذیبی کاموں میں اہل یورپ کا مقابلہ نہ کر سکے لیکن اس کے اسباب کی نوعیت جداگانہ ہے۔ شاہان مغلیہ کی سلطنت مشرقی ایشیائی مملکت کے نمونہ کی تھی، دولت کی فراوانی اس قدر تھی کہ اس کو بیرونی دنیا سے تعلقات رکھنے کی بہت کم ضرورت پڑتی تھی۔ ہندوستان کے انگریز حکمران بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ مغلوں کے زمانے کے مقابلے میں ملک کی زرعی صلاحیت خود ان کے زمانہ سے بہت زیادہ تھی۔ انگریزوں کا خاص کام جس پر وہ فخر کر سکتے ہیں یہ ہے کہ انھوں نے ملک کو بحری تجارت سے روشناس کرایا اور اس کو ترقی دی اور یہ کہ کلکتہ، بمبئی، اور مدراس ایسے تجارتی شہر تعمیر کیئے جن سے سابق کا کوئی ہندوستانی بندرگاہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس طرح تہذیبی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر نصرانیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ یورپ میں ہر وہ چیز پیدا کی گئی جو موجودہ زندگی کو قرون وسطیٰ کی زندگی سے ممتاز کرتی ہے۔ اب تہذیب کا دھارا روز بروز شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق کی طرف چلنے لگا نہ کہ جنوب سے شمال یا مشرق سے مغرب کی طرف۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو مغربی یورپ کی تاریخ کے لیئے ہر دوسری چیز سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور اس سے روس کی تہذیبی ذمہ داریوں کی حدود معین ہوتی ہیں۔ قدیم زمانہ کی طرح قرون وسطیٰ میں بھی بحیرۂ اسود کے شمالی ساحل

تہذیبی اور عموماً سیاسی حیثیت سے جنوبی ساحل کا محتاج رہا ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں شمالی ساحل پر ایسے شہر آباد ہوئے جن کا مقابلہ جنوبی ساحل کے شہر نہیں کر سکتے۔ قرون وسطیٰ کی تہذیبی برکتیں بخارا و جنیوا سے والگا کے کنارے پہنچی تھیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں وادیٔ والگا کے تاتاریوں نے روس کے ذریعہ یورپی تہذیب کا علم حاصل کر کے، ترکستان میں اپنے ہم مذہبوں میں روشنی پھیلانے کا کام اپنے ذمے لیا۔

حیدرآباد میں ریلوں کی تاریخ

از

جناب محمد ثناء اللہ صاحب ایم اے (عثمانیہ)

(۱)

ریاست حیدرآباد میں ریلیں جاری کرنے کا خیال ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوا جبکہ حکومت بمبئی نے یہ تحریک پیش کی کہ شولا پور تا حیدرآباد ایک لائین کی پیمایش کی جائے۔ اس تحریک پر سرکار عالی نے ... ۵ روپے کا پیش کش کیا تاکہ حکومت بمبئی کے مصارف پیمایش پورے ہوسکیں لیکن اس تحریک کے دس سال بعد یعنے ۱۸۷۱ء میں مملکت حیدرآباد میں پہلی ریل تعمیر کی گئی۔ یہ لائین شولا پور سے تنگبھدرا تک چلی گئی تھی۔ جی۔ آئی۔ پی ریلوے کمپنی نے اس لائین کے شمال مغربی حصہ (یعنے شولا پور تا رائچور) کی تکمیل کی اور مدراس ریلوے نے اس لائین کے جنوبی حصہ (تنگبھدرا تا رائچور) کو مکمل کیا۔ اس لائین نے بمبئی اور مدراس کو

ملانے کا کام کیا۔ اس میں ریاست حیدرآباد کا کوئی دخل نہ تھا کیونکہ ایک طرف تو اُس کی مالک حکومت ہند تھی تو دوسری طرف انتظام جی۔ آئی۔ پی ریلوے کمپنی اور ایم۔ ایس۔ ایم کے ذمہ تھا۔

حیدرآباد کی تاریخ ریلوے میں ۱۸۷۴ء ایک یادگار سال رہے گا اس لئے کہ اسی سال سے حقیقی معنوں میں نظام اسٹیٹ ریلوے کی بنیاد پڑتی ہے۔ جبکہ واڑی تا سکندرآباد لائین کی تعمیر شروع ہوئی۔ تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ جب مقامی تاجروں نے گلبرگہ تا حیدرآباد ریلوے لائین کی شاخ جاری کرنے کا تہیہ کیا تو اس وقت کے رزیڈنٹ سر جارج یول اور پھر ان کے جانشین سر رچرڈ ٹیمپل نے حیدرآباد میں ریلوں کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے حکومت ہند کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے۔ حکومت ہند کی منظوری اور تصفیہ طلب امور طے پاتے تک ۱۳ سال گذر گئے، حالانکہ ریلیں جاری کرنے کا خیال ۱۸۶۱ء میں پیدا ہو گیا تھا۔

نومبر ۱۸۶۹ء میں میجر میڈا اور مسٹر رینالڈس کی قیادت میں ہاتھیوں پر ایک دورہ کیا گیا تاکہ ریلوے کی سڑک معلوم کی جائے۔ بلارم سے نلکرمنا گل گرگنتا پلی چیتا پور شاہ آباد سے ہوتے ہوئے یہ لوگ واڑی پہنچے اور پھر یہاں سے گلبرگہ کا بھی دورہ کیا۔ واپسی تانڈور اور کوکٹ پلی سے عمل میں آئی۔ یہ دورہ ایک مہینہ تک جاری رہا۔

اب سوال یہ تھا کہ جنگشن گلبرگہ ہو یا شولاپور لیکن فوجی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے واڑی کا انتخاب ہوا۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ حیدرآباد ٹرمینس کہاں بنایا جائے۔ تین صورتیں درپیش تھیں۔ ایک صورت یہ تھی کہ افضل گنج ایک تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے اسی کو ٹرمینس بنایا جائے۔ یہ انجینیوں کی غور کردہ رائے تھی۔ دوسری صورت

یہ تھی کہ "ٹرمینس" قلعہ گولکنڈہ کے ایک میل کے احاطہ میں ہو۔ اس کی حمایت سرکارِ عالی نے کی لیکن حکومت ہند نے تیسری صورت جو اختیار کی وہ یہ تھی کہ ترملگری کو جو سکندرآباد کنٹونمنٹ میں واقع ہے مرکز بنایا جائے۔ بالآخر سکندرآباد کو "ٹرمینس" بنایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت ہند نے فوجی ضروریات کو مقدم رکھا۔ ۷ راکتوبر ۱۸۷۴ء کے "ٹائمس آف انڈیا" نے صاف صاف لکھا کہ

> "The object was to avoid the guns of the Nizam's fortress of Golconda, and get the trains within the influence of our own Secunderabad. The direct route would have been not only the shortest but the best from an engineering point of view, and it would have cost a lakh or two less than the one actually taken."

حکومت ہند کے نزدیک پٹری کا مسئلہ بھی اہم تھا میجر میڈ جو سپرنٹنڈنگ انجینئر تھے بڑی پٹری کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بڑی پٹری ڈالی جائے تو برطانوی ہند سے گردشی اثاثہ (رولنگ اسٹاک) وغیرہ راست منگوایا جا سکتا ہے۔ نیز حکومت ہند کا خیال تھا کہ اگر کبھی برطانیہ اور ریاست کے تعلقات خراب ہوں اور جب کبھی ضرورت درپیش ہو تو بڑی پٹری ہونے کی صورت میں نقل و حمل میں آسانی رہے گی۔ لیکن سرکارِ عالی نے چھوٹی پٹری پر زور دیا اس لئے کہ چھوٹی پٹریوں میں اخراجات کم ہوتے ہیں۔ بالآخر حکومت نے ۳ر اکتوبر ۱۸۷۱ء میں[1] بڑی پٹری اختیار کرنے کا تصفیہ کیا۔

---

[1] دیکھئے "حیدرآباد افیسرس" مرتبہ مولوی سید مہدی علی صاحب۔

جب یہ تمام مسائل سلجھ گئے تو جی۔آئی۔پی ریلوے کمپنی اور سرکار عالی کے مابین ۸ر اکتوبر ۱۸۷۴ء کو ایک معاہدہ ہوا جس کے شرائط یہ تھے :۔

(۱) جی۔آئی۔پی ریلوے کمپنی گردشی اثاثہ (رولنگ اسٹاک) انجن وغیرہ جو لائین کے چلانے کے لئے ضروری ہوں مہیا کرے گی۔

(۲) سرکار عالی کمپنی کو ۱۲۶۰ روپے فی میل کے حساب سے دے گی بشرطیکہ سی۔آئی۔پی ریلوے چھ مہینے تک راست ایک پیاسنجر گاڑی اور ایک مال گاڑی پابندی سے لے جانے کا انتظام کرے اور زاید ریلیں لے جانے پر زاید ادائی ہوگی جو خام آمدنی کے کم از کم نصف حصہ پر مشتمل ہوگی۔

(۳) کمپنی نے گردشی اثاثہ وغیرہ کے لئے جو رقم قرض لی ہے اس کا سود ½ فیصد سرکار عالی کو دینا ہوگا۔

(۴) ششماہی حسابات کی ادائی کے لئے سرکار عالی کو چھ ہفتوں کی مدت دی جاتی ہے اور اگر یہ مدت ختم ہو جائے تو سرکار عالی کو پانچ فی صد سالانہ کے حساب سے سود دینا ہوگا۔

۸ر اکتوبر ۱۸۷۴ء کو معاہدہ طے پانے کے بعد ۹ر اکتوبر ۱۸۷۴ء سے واڑی تا سکندرآباد (۱۲۱) میل طویل لائین چالو کی گئی، اس معاہدہ پر ۳۱ر ڈسمبر ۱۸۷۵ء یعنے ۱۵ مہینوں تک عمل ہوتا رہا، اس کے بعد ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے جی۔آئی۔پی ریلوے کمپنی کو خام آمدنی کا ۶۴ فیصد حصہ دیے جانے کا وعدہ کیا گیا۔

یکم جنوری ۱۸۷۹ء کو حکومت ہند نے جی۔آئی۔پی ریلوے کمپنی سے انتظام اپنے ذمہ لے لیا۔ ۱۸۸۴ء کے اختتام تک حکومت ہند نے اس کام کو سنبھالا لیکن اس کے بعد انتظام نظامس گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے

سپرد کیا گیا۔ گو معاہدہ ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۳ء میں طے پایا لیکن ۱۸ر مئی ۱۸۸۵ء سے کمپنی نے حقیقی کام شروع کیا۔

اب سنہ ۱۸۸۵ء تک ریلوے کی مالی حالت پر ایک تبصرہ ضروری ہے۔ ابتداء میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ واڑی تا سکندرآباد ریلوے لائین کی تعمیر میں (۱۲۸۰۲۵۲۱) روپے حالی خرچ ہوں گے لیکن اس تخمینہ کے مطابق جو سرسالار جنگ بہادر کے حکم پر تیار ہوا تھا حقیقی اخراجات (۱۲۷۹۵۶۴۸) روپے حالی ہوئے۔ گردشی اثاثہ جو آگے چل کر خرید اگیا اس کے اخراجات (۸۰۰۰۰) ہوئے اس طرح سے کل مصارف تقریباً (۱۳۸۰۰۰۰۰) روپے حالی ہوئے یا (۱۲۱۰۰۰) روپے فی میل ہوئے۔[1]

یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ چونکہ سامان کی خریدی کے وقت فرانس اور جرمنی میں جنگ جاری تھی اس لئے پٹریاں وغیرہ مہنگی پڑگئیں۔ جو لوہے کی پٹری دو سال پیشتر ۸ یا ۹ پونڈ میں ملتی تھی وہی جنگ کی وجہ سے ۱۴ پونڈ ۵ شلنگ میں فروخت ہو رہی تھی۔ اس طرح جنگ کی وجہ سے قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو جانے سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ دس لاکھ روپے حالی زیادہ خرچ ہوئے۔

اس کے علاوہ کچھ شرح تبادلہ کی وجہ سے بھی نقصان رہا۔ پہلے شرح سو (۱۰۰) روپے کلدار مساوی ۶-۱۴-۱۱۶ روپے حالی رہی اور جب ریلوے حکومت ہند کے تحت چلائی جا رہی تھی اس وقت شرح تبادلہ سو (۱۰۰) روپے کلدار مساوی (۱۱۸) روپے حالی تھی۔

لیکن نقصان کی ایک اساسی وجہ یہ تھی کہ راستہ اختیار کرنے میں

---

[1] دیکھئے رپورٹ بابتہ سنہ ۱۸۷۴ء تا ۱۸۸۵ء۔ مرتبہ سردار دلیر جنگ بہادر

فوجی اغراض کو ملحوظ رکھا گیا اور تجارتی اغراض و مفاد عامہ کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ [illegible]
تا سکندرآباد لائین ایسے مقامات سے گذرتی ہے جہاں سے نہ ابھی اتنے لوگ [illegible]
سفر کرتے ہیں نہ اشیاء کی حمل و نقل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ لائین [illegible]
نفع بخش نہ ہو سکی۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ "معاون سڑکیں" بالکل نہیں تھیں۔
"معاون سڑکوں" سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی وجہ سے مال ریلوے اسٹیشن تک
پہنچ سکتا ہے۔ اگر سڑکوں سے اسٹیشنوں تک مال لانے کا کرایہ بڑھا ہوا ہو تو لوگ
اپنی اشیاء کو اسٹیشن تک لانے کی زحمت ہی نہ کریں گے۔ اس لئے جب تک
حیدرآباد کی معاون سڑکوں میں اضافہ نہ ہو تب تک اس لائین کے نفع بخش
ہونے میں شبہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ واڑی، سکندرآباد کے [illegible]
(۳۵۸) فٹ پستی میں واقع ہے۔ چڑھاؤ کی وجہ سے بعض دفعہ انجنوں کو [illegible]
پڑتا ہے۔ اس لئے جب نقصان ہی نقصان نظر آنے لگا تو سردار دلیر جنگ بہادر نے
سوچا کہ اگر سنگرینی اور چاندہ جیسے مقامات میں ریل جاری کی جائے [illegible]
استحصال کیا جائے تو ایک جگہ تو کوئلہ ملے گا اور دوسری جگہ غلہ زیادہ مقدار میں
حاصل ہوگا۔ اس طرح نئی لائین نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے۔

ریلوے کے جاری ہونے سے محکمۂ فوج کو یکم جولائی ۱۸۷۵ء سے [illegible]
۱۸۸۵ء تک (۲۰۰۵۷۴) روپیوں کا فائدہ ہوا۔ اگر رعایت [illegible]
حکومت کو (۹۹۳۵۸۷) روپے (محکمۂ ریلوے کو) ادا کرنے پڑتے [illegible]
حکومت نے صرف (۵۱۸۵۸۵) روپے ادا کئے۔

جن اشیاء کی نقل و حمل ہوئی ان میں اہم غلہ اور دالیں ہیں۔ [illegible]
دالوں سے ۱۸۷۹ء میں (۱۰۰۵۳۵) روپے اور ۱۸۸۳ء میں [illegible]
روپے حاصل ہوئے۔ یہ حاصل کی ہوئی آمدنی زیادہ ہوتی اگر [illegible]
[illegible] تک سے آمدنی حاصل ہوئی ۱۸۷۹ء کے [illegible] روپیوں کے

مقابلہ میں ۱۸۸۵ء میں (۹۳۸۱۸) روپے رہی۔ بیجوں سے ۱۸۷۹ء کے (۵۲۰۷۱) روپیوں کے مقابلہ میں ۱۸۸۵ء میں (۹۹۵۱۸) روپے فائدہ ہوا۔ روئی، شکر، پھلوں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا گیا اور فوجی اسٹورس اور مسالے کی آمدنی ۱۸۸۵ء میں اپنی انتہا پر تھی۔ افیون کی مقدار آئے دن گھٹتی رہی۔ ۱۸۸۲ء میں پہلی مرتبہ ۳۳ ٹن افیون جس سے (۸۰۲) روپے فائدہ ہوا واگن میں لائی گئی لیکن ۱۸۸۵ء میں صرف پانچ روپے فائدہ ہوا۔ ریشم کی نقل وحمل میں بھی بہت کمی ہوئی۔ ۱۸۸۲ء کے ۲۶ ٹن ریشمی پارچہ کے مقابلہ میں مقدار ۱۸۸۵ء میں گھٹ کر ۱۹ ٹن رہ گئی۔[1]

معاہدہ ۱۸۸۳ء:

۲۷ ر دسمبر کو جو معاہدہ سرکار عالی اور نظامس گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے کمپنی کے مابین ہوا وہ ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ ریلوے کی سرکاری خریدی تک اس معاہدہ پر عمل ہوتا رہا ہے۔ معاہدہ کی اہم دفعات کو حسب ذیل عنوانات کے تحت پیش کیا جا سکتا ہے:۔

فرائض:

واڑی تا سکندرآباد لائن کمپنی کے حوالہ کر دی جائے گی۔ کمپنی نے ایک سنگل لائن (۶ ـ ۵) بنانے کا ذمہ لیا اور یہ بھی واضح کیا گیا کہ یہ لائن حیدرآباد سے ورنگل اور ورنگل سے بجواڑہ تک جاری رہے گی۔ اس لائن کا طول ۱۰۲ میل ہوگا۔ اس لائن کا دوسرا حصہ ورنگل سے چاندہ تک پھیلا ہوا رہے گا جس کا طول ۱۶۰ میل ہوگا۔ اس طرح کل ۳۷۰ میل کی لائین تعمیر ہوگی۔ یہ بھی طے پایا کہ

[1] دیکھئے رپورٹ مرتبہ سردار دلیر جنگ بہادر۔

پایا کہ یہ کام متعلقہ زمینات ملنے کے تین سال بعد ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ بھی طے ہو گیا کہ کمپنی لائنوں، انجنوں اور دیگر متعلقہ سامان کو چالو حالت میں رکھے گی۔ اس کا بھی تصفیہ کیا گیا کہ اگر سرکار عالی یا حکومت ہند ضرورت محسوس کرے تو کمپنی کی لائنوں پر دوسری کمپنیوں کی ریلیں بھی چلائی جا سکتی ہیں۔ آخر میں یہ طے پایا کہ کمپنی بمبئی یا حیدرآباد میں جیسے بھی وہ مناسب سمجھے ایک دفتر قائم کرے گی۔

رعایتیں :

سرکار عالی کمپنی کو لائن کی تعمیر اور دیگر تعمیری کاموں کے لئے زمین مفت مہیا کرے گی اور تعمیر سے متعلقہ سامان پر کوئی محصول کروڑگیری عاید نہیں کرے گی۔ یہ بھی طے پایا کہ کمپنی کو دوسری ریلوے لائنوں کے ساتھ اتصال پیدا کرنے اور ان پر اپنی ریلیں چلانے کا اختیار حاصل ہوگا۔ کمپنی سرکار عالی اور حکومت ہند کے طلا و سیم (مسکوکہ و غیر مسکوکہ) اور تانبے کے سکوں کو خاص خاص نرخوں پر لے جائے گی اور ڈاک اور ڈاک خانہ و فوج کے عہدہ داروں کو کم کرایہ پر لے جائے گی۔

میعاد :

زمین، لائن و دیگر کارہائے تعمیر کا اجارہ یا کسی دوسرے قسم کا حق ۹۹ سال کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد موجودہ ریلوے حکومت کے تصرف میں آجائے گی۔ میعاد ختم ہونے پر کمپنی اپنے سامان کو واجبی قیمت پر فروخت کرے گی اور اختلاف کی صورت میں قیمتوں کا تعین ثالثوں کے ذریعہ ہوگا۔ میعاد تو ۹۹ سال مقرر کی گئی لیکن اگر سرکار عالی چاہے تو ریلوے کو کم یا جنوری

۱۹۳۴ء یا ۱۹۴۴ء یا ۱۹۵۴ء کو خرید سکتی ہے، بشرطیکہ اس کی اطلاع ایک سال پیشتر دی جائے۔ اس طرح اگر ریلوے قبل از وقت حاصل کی جائے تو کمپنی کو اسٹرلنگ میں واجب الادا رقم کے علاوہ ۲۵ فیصد بونس بھی دینا ہوگا۔

مالیات

کمپنی کے سرمایہ کی اجرائی حسب ذیل طریقہ پر ہوگی: اس لاین کے دوسرے حصہ (یعنے درنگل تا چانده) کی تعمیر کے سوائے دوسرے اغراض کے لئے بیس لاکھ پونڈ کے حصص اور پندرہ لاکھ کے قابل انفکاک مارٹگیج ڈبنچر جس کا سود سالانہ ۴ فیصد ہوگا جاری کئے جائیں گے۔ اور اس لاین کے دوسرے حصہ کے لئے اسی قسم کے پانچ لاکھ پونڈ ڈبنچر اور زاید سرمایہ کی رقم (جو ۵ لاکھ پونڈ سے زیادہ نہ ہوگی) کی اجرائی ہوگی۔ کمپنی اپنے حصص کی عام اجرائی کے وقت سردار دلیر جنگ بہادر یا دوسرے مختار کل کو پانچ لاکھ پونڈ کے کامل القیمت حصص دیدے گی۔ یہ بھی طے پایا کہ کمپنی ایک مالی حساب رکھے گی جس میں اس کی تمام آمدنی اور لائینوں کے چلانے کا خرچ درج کیا جائے گا۔ یہ مالی حساب ہر ششماہی۔ ۳۰ رجون و ۳۱ ر ڈسمبر یا کسی ایسی تاریخ تک مرتب ہوگا جو وقتاً فوقتاً سرکارعالی اور کمپنی کے درمیان قرار پائے۔ سرکارعالی کو ان حسابات کی تنقیح و تصحیح کا اختیار حاصل رہے گا۔ اور تصحیح تین ماہ کے اندر ہو جانی چاہیے۔ اس کا بھی تصفیہ کیا گیا کہ دو لاکھ پونڈ کی رقم جس کو کمپنی امانتاً نیشنل پروونشیل بنک آف انگلینڈ میں رکھے گی دو ٹرسٹیوں کے حوالہ کی جائے گی جن میں سے ایک سرکارعالی اور دوسرا کمپنی کی جانب سے مقرر کیا جائے گا۔ رقم مذکور ٹرسٹیوں کے نام سے انگلستان یا برطانوی ہند کے کسی پبلک اسٹاک یا فنڈ یا دستاویزات میں لگائی جائے گی اور یہ رقم ایک قسم کی دستاویز سے دوسری قسم کی دستاویز میں

تبدیل کی جاسکے گی۔ یہ بھی طے پایا کہ ریلوے کی جمعیت کو توالی اور مجسٹریٹ کی تنخواہوں کا (۱/۴) حصہ کمپنی دے گی اور (۳/۴) حصہ سرکار عالی ادا کرے گی۔

۱۸۸۳ء کے بعد ریلوے کی تعمیر تیزی سے جاری رہی اور حسب ذیل جدول سے اس کا پتہ چلتا ہے:۔

سال	مقام	میلانہ
۸؍اپریل ۱۸۸۶ء	سکندرآباد تا ورنگل	۸۷
۱؍جنوری ۱۸۸۸ء	ورنگل تا ڈورنکل	۵۳
۱؍جنوری ۱۸۸۸ء	ڈورنکل تا سنگرینی کالریز	۱۰۶
۱۵؍اگست ۱۸۸۸ء	ڈورنکل تا بوناکلو	۴۲
۱۰؍جنوری ۱۸۸۹ء	بوناکلو تا حدود انگریزی	۲۳

اس طرح معاہدۂ ۱۸۸۳ء کے طے پانے کے بعد ۱۸۸۹ء تک ۳۱۱ میل کی لاین تعمیر ہوئی۔

معاہدۂ ۱۸۹۷ء:

۱۸۸۳ء[1] کے معاہدہ کے بعد دوسرا اہم معاہدہ ۱۸۹۷ء کا ہے اس معاہدہ کو ۱۸۸۳ء کے معاہدہ کا ضمیمہ کہنا چاہیے۔ یہ معاہدہ طامس جارج رابنسن (سرکار عالی کے ایجنٹ) اور ریلوے کمپنی کے مابین عمل میں آیا۔

فرائض:

کمپنی ریلوے کی ایک سنگل لاین جس کا طول (۳۸۰) میل ہوگا چھوٹی پٹی

---

[1] اس عہدنامہ کا سرکاری نام "عہدنامہ تعمیر حیدرآباد گوداوری ریلوے فیمابین سرکار عالی و ہز ہائینس دی نظام اور نظامس گارنٹیڈ ریلوے کمپنی مورخہ ۱۶؍مارچ ۱۸۸۷ء" ہے۔

حیدرآباد سے منماڑ تک بنائے گی اور اس لاین کو جملہ مطلوبہ اراضی پر قبضہ پانے کی تاریخ سے چار سال میں مکمل کردے گی۔ کمپنی لاین کو درست حالت میں رکھے گی اور کافی گردشی اثاثہ مہیا کرے گی۔ اس پر واجب ہوگا کہ (سوائے ناگہانی حادثہ یا کسی دوسرے غیر اختیاری سبب سے مجبوری کی حالت میں) روزانہ کم از کم ایک ٹرین چلائے اور اس طرح سرکار عالی اور نیز حکومت ہند کی ڈاک کے لانے لے جانے میں واجبی سہولت پیدا کرے گی۔ کرایوں کو معین کرنے کے لئے سرکار عالی کی منظوری لینی پڑے گی اور یہ کرایے موجودہ لاین کے کرایوں سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اس کو دوسری ریلوے کمپنیوں کے ساتھ تبادلہ ٹرافک وغیرہ کا انتظام کرنا پڑے گا۔ کمپنی سکندرآباد یا حیدرآباد میں ایک دفتر اور ایک ایجنٹ (یا کمیٹی) رکھے گی۔

رعایتیں:

سرکار عالی سامان آلات وغیرہ پر کوئی محصول کروڑگیری عاید نہیں کرے گی۔ کمپنی کو ایک اور رعایت جو دی گئی وہ یہ تھی کہ اس کو دوسری لینوں سے متصل کرنے اور پھر ان پر ریلیں چلانے کا حق حاصل ہو۔ کمپنی نے سرکار عالی کی رعایتوں کا خیال کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا کہ وہ ڈاک خانہ اور فوج کے عہدہ دار مفت لے جائے گی۔

میعاد معاہدہ:

ریلوے بعد ادائی رقم ۱۹۱۴ یا ۱۹۳۴ یا ۱۹۴۵ء میں خریدی جاسکتی ہے۔ اگر کمپنی کی جانب سے عہد شکنی ہو تو سرکار عالی کمپنی کو چھ ماہ کا نوٹس دے کر معاہدہ ختم کرسکتی ہے۔ معاہدۂ ہذا کے اختتام پر زمینات مکانات و

سرکارِ عالی کو واپس کر دیئے جائیں گے اور سرکارِ عالی انجن گردشی اثاثہ وغیرہ واجبی قیمت پر خرید سکے گی ۔ لاین کے مکمل ہو جانے کے بعد سرکارِ عالی کمپنی کو پٹہ یا دوسرے قسم کا کوئی حق یا استحقاق اتنی مدت کے لئے عطا کرے گی جو مدت (۹۹) سالہ کے (چونکہ معاہدۂ ۱۸۸۳ میں مدت (۹۹) سال مقرر کی گئی تھی) باقی ماندہ مدت کے مساوی ہوگی ۔

مالیات :

کمپنی کا سرمایہ قابل الفکاک ڈبینچروں کے ذریعہ فراہم کیا جائے گا۔ یہ رقم بالاقساط نیشنل پروونشل بنک آف انگلینڈ یا کسی اور بنک میں جو اس وقت کمپنی کا بنک ہے جمع کرائی جائے گی ۔ سرکارِ عالی سرمایہ ڈبینچر پر جو (۲۵) لاکھ پونڈ سے زیادہ نہ ہوگا ۔ ۲ سال تک کمپنی کو سالیانہ ادا کرے گی کمپنی سرکارِ عالی کو سالیانہ مذکور مع سود مقررہ ختم مدت پر واپس دیدے گی ۔ کمپنی ایک مالی حساب رکھے گی جو ہر چھ ماہ میں (۳۰ رجون اور ۳۱ رڈسمبر تک) مرتب کیا جائے گا۔ سرکارِ عالی کو حسابات کی تنقیح کرنے کا اختیار حاصل رہے گا۔ اگر سرکارِ عالی اور کمپنی کے درمیان کسی رقم کے متعلق جو خرچ ہو چکی ہو یا ہونے والی ہو اختلاف ہو تو اس کے تصفیہ کے لئے بتوسط رزیڈنٹ بہادر یہ مسئلہ حکومت ہند کے صیغہ ریلوے میں پیش کیا جائے گا۔ اور اس کا فیصلہ (فریقین پر) قطعی اور واجب التعمیل ہوگا۔

معاہدہ کے بعد دو سال کے اندر ۱۸۹۹ تا ۱۹۰۰ "حیدرآباد گوداوری ریلوے لاین" کی تکمیل ہوئی جو کہ ۳۸۰ میل طویل تھی ۔ سکندرآباد تا منماڑ لاین سے علاقہ مرہٹواری کو آباد کرنے میں بہت مدد ملی اور یہاں کی پیداوار کو بمبئی کی منڈی تک پہنچانے میں آسانی ہوگئی ۔ اس ریلوے کی تعمیر کے بعد نئی ریلوں کی تعمیر کا مسئلہ ایک عرصہ تک ملتوی رہا ۔

۱۹۱۱ تا ۱۹۳۰ء

اعلیٰحضرت بندگان عالی کی تخت نشینی کے بعد سے نئی ریلوں کی تعمیر شروع ہوجاتی ہے۔ اس مبارک دور کا آغاز پورنا ہنگولی لاین سے ہوتا ہے جس کا مقصد ہندوستان کی چھوٹی پٹری کی ریلوں میں اتصال پیدا کرنا تھا۔ یہ لاین ۱۵ر مئی ۱۹۱۲ء چالو کردی گئی لیکن جس مقصد کے تحت اس لاین کا آغاز ہوا وہ پورا نہ ہوسکا۔ ۱۹۱۶ء میں سکندرآباد تا کرنول لاین کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ اس کا ایک حصہ بھی ونپرتی روڈ تک ۱۵ر فبروری ۱۹۱۷ء میں مکمل ہوا۔ جنگ عظیم کے بعد کساد بازاری کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس کے علاوہ مالی دقتوں کی وجہ سے بھی یہ کام پانچ سال تک ملتوی رہا۔ اس لاین کی تعمیر حدود انگریزی تک یکم ستمبر ۱۹۲۸ء سے پہلے ختم نہ ہوسکی۔ اس کے دو ماہ بعد کرنول ڈھونا چلم لاین ایم۔ ایس۔ ایم ریلوے سے حاصل کرلی گئی اور سکندرآباد تا ڈورناچلم لاین سے جنوبی ہند کی چھوٹی پٹری کی ریلوں سے اتصال پیدا ہوگیا۔ تقریباً اسی زمانہ میں قاضی پیٹھ بلہارشاہ لاین کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے شمالی اور جنوبی ہند کے درمیان بڑی پٹری کے ذریعہ قریب ترین رستہ مہیا ہوگیا۔ اس کی تکمیل چار حصوں میں ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان ہوئی۔ ۱۶ر ڈسمبر ۱۹۲۸ء کو اعلیٰحضرت بندگان اقدس نے اس لاین کا افتتاح فرمایا۔ مانجرا کی زرخیز وادی کے استحصال کے لئے وقارآباد، محمدآباد بیدر لاین (۵۷ میل) مکمل ہوئی اور ۲۴ر فبروری ۱۹۳۰ء سے چالو کردی گئی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۱۲ء سے ریلوں کی تعمیر سرکار عالی کے سرمایہ سے ہوئی، البتہ ان کی تعمیر اور انتظام "این جی ایس ریلوے کمپنی" کے سپرد رہا۔

۱۹۳۰ء کے بعد ریلوے کی ترقی

۱۹۳۰ء کے بعد سے ریلوے کے تعمیری پروگرام میں کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں ہوا، صرف دو لاینوں کی تعمیر ہوئی۔ ۱۹۳۲ و ۱۹۳۳ء میں محمد آباد بیدر سے پرلی دیناتھ تک لاین دو حصوں میں مکمل کردی گئی جس کا طول ۱۰۹٫۶۸ میل تھا۔ اس لاین سے تجارتی فائدے حاصل ہوئے، مثلاً پربھنی کی روئی اور بیدر کے سامان اور گھی کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ یکم نومبر ۱۹۳۸ء میں جنکم پیٹھ بودھن لاین کی تعمیر ہوئی جس کا طول ۱۲٫۰۴ میل تھا۔ اس لاین سے بودھن کی شکر کی نقل وحمل میں آسانی ہوگئی۔ بودھن شکر کا کارخانہ اب حیدرآباد کی معیشت میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس طرح آغاز سے ۱۹۳۹ء تک ریلوں کا مجموعی میلانہ ۱۳۶۰٫۶۰ میل رہا۔

۱۹۳۰ میں ریلوے کی جو حالت تھی اس کا اندازہ حسب ذیل جدول سے ہوگا۔

مدات	(۲) بڑی پیری	(۳) چھوٹی پٹری	(۴) جملہ
مجموعی میلانہ	۵۷۸۶۴۳	۶۵۹۶۹۰	۱۲۳۸۶۳۳
مسافرین سے آمدنی	۴۰۰۸۸۸۶	۳۹۵۸۹۲۶	۸۰۳۷۵۱۲
اشیاء کی نقل وحمل سے آمدنی	۹۴۴۵۲۷۶	۵۴۴۱۰۹۷	۱۴۸۸۶۳۷۳
خام آمدنی	۱۴۰۵۶۶۹	۹۷۴۵۵۲	۱۵۰۳۱۲۵۱
خام آمدنی فی ٹرین میل	۷۶۳۸	۵۶۴۵	۱۲۶۵۳
مصارف رواں	۵۱۶۹۴۰۸	۴۹۶۳۱۸۵	۱۰۱۳۲۵۹۳
خالص آمدنی	۸۸۸۷۲۹۱	۴۷۸۲۳۶۷	۱۳۶۶۹۶۵۸

لہ۔ دیکھئے

اگر ان اعداد کا مقابلہ ریلوے کے ابتدائی سال یعنے ۱۸۷۴ء سے کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ تقریباً ۶۰ سال کے عرصہ میں حیدرآباد میں کتنی عظیم الشان ترقی ہوئی ہے۔ ۱۸۷۴ء میں ریلوے کا مجموعی میلانہ ۱۲۱ میل تھا ۱۹۳۰ء میں مجموعی میلانہ ۱۲۳۸٫۷۳۴ ہوگیا۔

اگر صرف مجموعی میلانہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو دنیا کے ممالک میں ممالک متحدہ امریکہ کا نمبر اول آتا ہے۔ لیکن محض مجموعی میلانہ سے ریلوے کی ترقی کا پتہ نہیں چلتا جب تک کہ میلانہ کو رقبہ اور آبادی کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔ اگر مجموعی میلانہ رقبہ کے تناسب سے دیکھا جائے تو بلجیم کا درجہ سب سے بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہاں ہر سو مربع میل کے لئے ۴ میل کی رلیں ہیں۔ انگلستان اور جرمنی میں ہر سو مربع میل کے لئے ۲ میل کی رلیں ہیں۔ ہندوستان میں ہر سو مربع میل کے لئے ۲ میل اور حیدرآباد میں صرف ۸۰۱ء میل رلیں ہیں۔ اگر آبادی کے تناسب سے میلانہ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک لاکھ کی آبادی کے لئے کنیڈا میں ۵۲۴ میل۔ ممالک متحدہ امریکہ میں ۔۱۱ میل۔ اور حیدرآباد میں ۹ میل کی رلیں ہیں۔ حسب ذیل جدول سے آبادی کے لحاظ سے میلانہ میں اضافہ کا پتہ چلتا ہے:۔

سال	آبادی	میلانہ	میلانہ ہر ایک لاکھ کی آبادی کے لئے
۱۸۸۱ء	۹۸۴۵۵۹۴	۱۲۱	۱٫۰۲
۱۹۳۱ء	۱۴۴۳۶۱۴۸	۱۲۳۸	۸٫۰۵
۱۹۳۹ء	۱۶۳۳۲۶۴۴	۱۴۹۳	۹٫۰۱

نوٹ: آخری مد میں مردم شماری کے اعداد ۴۱ء کے ہیں' اس لئے کہ مردم شماری ہر دس سال کے بعد ہوتی ہے۔ گو ۴۱ء کی مردم شماری اور ۳۹ء کے مجموعی میلانہ سے سنوں میں یکسانیت نہیں رہی لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

حیدرآباد کے رقبہ (۵۲۶۹۸ مربع میل) کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ۳۸ تا ۳۹ء میں میلانہ کا فیصد ہر (۱۰۰) مربع میل کے لئے ۱.۰۸ رہا۔

مجموعی میلانہ کے ساتھ ساتھ خام آمدنی میں بھی اضافہ ہوا۔ ۱۸۷۴ء میں ریلوے کی خام آمدنی ۱۳۴۰۱۷ روپے (سکہ عثمانیہ) تھی، لیکن ۱۹۳۰ء میں خام آمدنی بڑھ کر ایک کروڑ ۵۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس طرح ۱۹۳۰ء میں خالص آمدنی ایک کروڑ ۲۶ لاکھ سے زیادہ تھی، لیکن ۱۸۷۴ء میں ۷۹۴۳ روپے تھی۔ ۱۸۷۴ء میں تعمیری مصارف ۱۴۵۹۶۴۸ روپے تھے اس میں سائیڈنگ کی رقم شامل نہیں ہے۔ سائیڈنگ کی رقم کو شامل کرنے کے بعد ۱۲۱۰۰۰ روپے فی میل رقم صرف ہوئی، لیکن ۱۹۳۹ء تک ریلوے کے تعمیری مصارف ۱۴۹۷۷۰۰۰ روپیوں تک رہے۔

حیدر آباد میں ریل کی سرکاری خریدی

(۲)

۸ر ڈسمبر ۱۸۸۳ء کے معاہدہ کی رو سے یکم جنوری ۱۹۳۴ء کو کمپنی کی ریلوے پر سرکار عالی کو ملکیت حاصل کرنے کا حق تھا لیکن ان فوائد کے پیش نظر جو ریلوے پر بعجلت ممکنہ ملکیت حاصل کر لینے سے ریاست کو حاصل ہو سکتے تھے ضروری تھا کہ کوئی تدبیر ایسی نکالی جائے جس سے کمپنی کو اپنی ملکیت سے دست کش ہونے کی ترغیب ہو اور ساتھ ہی ساتھ سرکار عالی کا بھی کوئی نقصان نہ ہو۔

اس امر پر غور کرنے کے لئے کہ بطور ترغیب کیا خاص "آفر" دیا جانا چاہیئے۔ سرکار عالی نے ریلوے کے دو ماہرین کی خدمات حاصل کیں، ان کے سپرد دو کام کئے گئے، انہیں نہ صرف آفر سے متعلق مشورہ دینا تھا بلکہ یہ بھی معلوم

لہ۔ دیکھئے نوٹ صدر المہام بہادر فینانس۔

کرنا تھا کہ کمپنی کی طرف سے ریلوے کی نگہداشت اطمینان بخش طور پر ہوئی تھی یا نہیں۔ مالی امور سے متعلق مشورہ دینے کے لئے سر فریڈرک گانٹلٹ منتخب کئے گئے۔ آخر کے تصفیہ میں حسب ذیل اعداد کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا:۔

(۱) وہ رقم جو ۱۹۳۴ء میں ریلوے خریدی جانے کی صورت میں معاہدہ کے تحت منجانب سرکار عالی واجب الادا ہوگی۔	پونڈ ۵۹۳۳۸۴۳
(۲) اندازہ آمدنی جو یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے ۱۲ دسمبر تک کمپنی کو وصول ہوتی اور جو خریدی ریلوے کے بعد بحق سرکار عالی رہیگا۔	۲۱۱۸۱۸۷
(۳) انگلش انکم ٹکس کی بچت یعنی وہ رقم جسے ریلوے خرید لئے جانے کے باعث سرکار عالی کی طرف سے ادا کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔	۳۸۰۵۴

مسٹر رالف فریمن نے حسب خواہش صدر المہام فینانس ۱۹۳۰ تا ۱۹۳۴ء کی بابت آمدنی کے حسب ذیل دو تخمینہ جات مرتب کئے:۔

(۱) موافق حالات میں زیادہ سے زیادہ آمدنی	۱۴۶ ۷ ۵ لاکھ روپے (۲۱۶۲۱۰۸) پونڈ
(۲) مخالف حالات میں کم سے کم آمدنی [1]	۸ ۷ ۵ ۴ لاکھ روپے (۱۹۴۴۴۰۵) پونڈ

ان دو تخمینہ جات سے مسٹر لائیڈ جونس (کمپنی کے ایجنٹ) کے اعداد کی تائید ہوتی ہے، جن کو سر فریڈرک گانٹلٹ نے نہایت واجبی ظاہر کیا۔ آخر کار

---

[1] دیکھئے ۱۷ فقرہ ایس کے آینگار۔

۱ ایک کمیٹی منعقد کی گئی جس میں سرکار عالی کے مامور کردہ ماہرین و معتمد فینانس اور صدر المہام فینانس (بہ حیثیت صدر) شریک تھے۔ اس کمیٹی میں متفقہ طور پر یہ قرار پایا کہ بتاریخ یکم اپریل ۱۹۳۰ء معاہدہ ختم کرنے کے لئے ریلوے کی قیمت کے طور پر ۸۳ لاکھ پونڈ کا آفر دیا جانا چاہئے۔ باب حکومت کی متفقہ سفارش پر کمپنی کو آفر دئے جانے کی منظوری بارگاہ خسروی سے بذریعہ فرمان مبارک مؤرخہ ۸ ؍رجب سنہ ۱۳۴۸ ہجری (مطابق ۱۰ ؍ڈسمبر ۱۹۲۹ء) ہوئی۔

آفر سے متعلق اعداد مرتب کرنے میں ان جملہ ترمیمات و تجدیدات کا کافی لحاظ رکھا گیا جن کی یکم جنوری ۱۹۲۴ء سے پہلے ضرورت پڑتی تھی۔ مسٹر فریمن نے اپنی رپورٹ میں یہ ظاہر کیا کہ ریلوے لاین کا معاینہ ہر سال حکومت ہند کے مقرر کردہ عہدہ دار کے تفویض رہا ہے۔

۲ یہاں تک تو آفر کا مسئلہ رہا، اب دوسرا سوال آفر کے طریقۂ ادائی سے متعلق تھا، اس سلسلے میں سرکار عالی اور کمپنی کے مابین یہ طے پایا کہ آفر (یعنے ۸۳ لاکھ) کا ایک حصہ بتاریخ یکم اپریل نقد ادا کیا جائے اور بقیہ رقم بحق حصہ داران سالانہ (۵½) فیصد سود والے سہ سالہ "ڈبنچرز" جاری کر کے ادا کی جائے۔ سر آسبرن اسمتھ مینجنگ گورنر امپیریل بنک نے سرکار عالی کو تقریباً (۶) فیصد پر رقم دلانے کا وعدہ کیا۔

۴ اندازہ لگایا گیا کہ ریلوے کی قبل از وقت خریدی سے زائد از ۳۵ لاکھ سکہ ع (۳۰۳۰۰۰ پونڈ) کا مالی فائدہ ہوگا۔ سرکار عالی کے پیش نظر یہ بھی خیال تھا کہ آگے چل کر محاصل ریلوے میں تقریباً ایک کروڑ سکہ ع کا سالانہ اضافہ ہوگا اور جو رقم خریدی پر صرف کی گئی اس پر ۶ فیصد سود سالانہ بھی لگایا جائے تو سرکار عالی کا خیال تھا کہ تقریباً ۱۱ سال میں رقم خریدی پوری بے باق ہو جائے گی۔

این۔جی۔ایس ریلوے کمپنی نے بالآخر سرکار عالی کے آفر کو منظور کر لیا اور ضروری دستاویزات کی حسب ضابطہ تکمیل بتاریخ ۸ مارچ ۱۹۳۰ء میں آئی۔

تیسرا سوال یہ تھا کہ ریلوے سرکار عالی کے ملکت ہو جانے کے بعد اس کا طریقہ انتظام کیا ہونا چاہئے۔ باب حکومت کی متفقہ سفارش پر بارگاہ خسروی سے بذریعہ فرامین مبارک مزینہ ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۴۸ ہجری و ۸ رجب ۱۳۴۸ ہجری یہ تصفیہ فرمایا گیا کہ ایک ایجنٹ اور اس پر ایک ریلوے بورڈ ہو جو باب حکومت سرکار عالی کے تابع رہے گا۔ حیدرآباد ریلوے بورڈ کے صدر صدر المہام فینانس مقرر کئے گئے۔ صدر المہام فینانس کو ریلوے کے حسابات کی تنقیح اور ارکان ریلوے بورڈ (مقیم لندن) سے تبادلہ خیالات کے پورے اختیارات دئے گئے۔ یہ بھی طے پایا کہ صدر المہام فینانس کے ساتھ دو ارکین رہیں گے جن کو فی کس سالانہ (۱۲۰۰) پونڈ معاوضہ ادا کیا جائے گا، ان دونوں کا تقرر (۵) سال کے لئے ہوگا اور صدر نشین کی عدم موجودگی میں ان میں سے ایک بورڈ کا صدر ہوگا اور دوسرا بحیثیت مینجنگ ڈائرکٹر سر ریجنالڈ گلانسی اور مسٹر لائیڈ جونس علی الترتیب صدر (صدر نشین کی عدم موجودگی میں) اور مینجنگ ڈائرکٹر مقرر کئے گئے اگر سرکار عالی پسند فرمائے تو ایک یا دو ارکان کو بہ معاوضہ سالانہ ایک ہزار پونڈ فی رکن معمور کرنے کی گنجائش رکھی گئی اسی سلسلہ میں سر رابرٹ ہائٹ (کمپنی کے ڈائرکٹر) کا تقرر ایک سال کے لئے کیا گیا اور مسٹر لائیڈ جونس کا نام دوسری جائداد کے لئے تجویز کیا گیا۔

اعتراضات:

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس لین دین میں سرکار عالی کو مالی نقصان ہوا ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جب قبل از وقت خریدی سے محاصل میں اضافہ عوام کا فائدہ یا دیگر فوائد ہونے والے ہیں تو یہ ۱۹۳۴ء کے بعد بھی ہو سکتے تھے پھر کیوں

اتنی عجلت سے کام لیا گیا اگر ۱۹۳۴ء ہی میں ریلوے خریدی جاتی تو کمپنی کو از روئے معاہدہ سامان ریلوے میں ترتیب و تجدادت کرنی پڑیں ۔ ین ریلوے کی قبل از وقت خریدی سے یہ مالی بار سرکار عالی پر پڑا ۔ مگر اس کے جواب میں یہ کہا گیا کہ مسٹر فرین نے جو اعداد پیش کئے ان میں ترمیمات و تجدیدات کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا ۔ دوسرے یہ کہ اگر ۱۹۳۴ء میں ریلوے خریدی جاتی تو کمپنی عمداً تجدیدات و ترمیمات کے لئے کم کام کرتی اور دیگر معاملات میں تنگ نظری سے کام لیتی لیکن ریلوے کے قبل از وقت خرید لینے سے یہ خطرہ دور ہو گیا اور ریلوے پر نگرانی اور توسیع کے مواقع ہاتھ آ گئے ۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جو بونس (عطیہ) حق ملکیت سے ریلوے قبل از وقت دست بردار ہونے کے لئے دیا گیا وہ ضرورت سے زیادہ تھا لیکن اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کا بونس دینا کوئی غیر معمولی چیز نہیں ۔ حکومت ہند نے بھی ریلوں کی خریدی کے وقت اسی قسم کا بونس دیا ۔

تیسرا اعتراض یہ تھا کہ جو رقم سرکار عالی نے اس وقت حاصل کی وہ بازاری شرح پر حاصل کی گئی جس سے سرکار عالی کو زیر بار ہونا پڑا ۔ یہ اعتراض بالکل بجا تھا ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ریلوے کی قبل از وقت خریدی کا سودا بہت مہنگا پڑا اور کساد بازاری کی وجہ سے ریلوے کی خام آمدنی گھٹتی گئی یہاں تک کہ ریلوے کو نفع کی بجائے نقصان اٹھانا پڑا ۔ صدر المہام فینانس کا خیال کہ خریدی سے مفید نتائج نکلیں گے ، کساد بازاری کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا اور ریلوے کی خریدی پر جو رقم صرف کی گئی اس کی تلافی ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء کی آمدنی سے نہ ہو سکی ۔ البتہ کساد بازاری کے ختم ہو جانے کے بعد آمدنی میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا ۔ لیکن فوری فوائد حاصل نہ ہو سکے ۔

نظریۂ اشتراکیت و اشتمالی روس

از

جناب ایم ہنمنت راؤ صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) ایچ سی ایس

عالمگیر جنگ میں متحدین کی فتح اور نا شلطی دول کی شکست و اطاعت پذیری کے بعد سیاست عالم میں مملکت سوویٹ روس کو ایک عظیم اہمیت حاصل ہوگئی ہے سوویٹ مملکت روس اپنی اشتراکی نوعیت اور حکمت عملی کے باعث نہ صرف دنیا کے دیگر ممالک سے مختلف ہے بلکہ اس نے اشتراکیت کو ایک عقیدے اور عملی نظام کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کر کے اقوام عالم کو دعوت فکر و عمل دے رکھا ہے۔ گو دنیا کے دیگر ممالک کی اشتراکی جماعتیں اشتمالی روس کے طریق کار سے متفق نہیں ہیں۔ اور ارتقائی منازل کے ذریعہ بتدریج سیاسی اقتدار کے حصول اور پارلیمنٹری طریقوں سے اشتراکی سماج کے قیام کی سعی میں مصروف ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جماعتی نقطۂ نظر اور طبقاتی عدم مساوات کے خاتمہ کے مسائل عہد حاضر کے سیاسی تخیل اور زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ بجز ریاستہائے متحدہ امریکہ ہر مملکت میں اشتراکی تحریک

ایک پارٹی کے نصب العین کی شکل میں دن بہ دن منظم و قوی ہوتی جاتی ہے اور ان ممالک کے حکومتوں کی تعمیر و تشکیل میں اس پارٹی کا اثر روز افزوں ہے۔
مملکت روس میں اشتمالی خطوط پر زراعت وصنعت کی عظیم پیمانہ پر ترقی اور نئے تصورات حیات کی اساس پر سماج کی تنظیم جدید اور اس کا عملی مظاہرہ اقوام عالم کے لیے ایک دعوت مقابلہ سے کم نہیں ہے۔ بایں وجوہ یہ جاننا ضروری ہے کہ سوویٹ روس کے معاشی و سیاسی فکر اور تصور حیات کی بنیاد کس نظریہ پر قایم ہے۔ چونکہ سوویٹ روس ایک اشتمالی مملکت ہے اس لئے اُس کے "تصور حیات" کو سمجھنے کی خاطر نظریۂ اشتراکیت کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ روس کی اشتمالی جماعت کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے نظری و عملی زندگی کا کامل انحصار کارل مارکس کے اشتراکی نظریہ و تعلیم کی صحیح تعبیر پر ہے۔
انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں براعظم یورپ، خاصکر جرمنی کے سیاسی تخیل پر ہیگل کا نظریۂ مملکت حاوی تھا۔ ہیگل پر کانٹ اور ردسو کے تعلیمات کا اثر پڑا تھا۔ نظریۂ افادیت کے مبلغین نے جس طرح عدم مداخلت اور انفرادی آزادی پر زور دیا، اسی طرح اس کے برعکس ہیگل نے مملکت کے قوت و اقتدار کی پرجوش تائید کی۔ اس عہد میں براعظم یورپ کی معاشی و سیاسی دنیا میں ایک خاص شخصیت کی حامل ہستی کا ظہور ہوا۔ یہ شخص کارل مارکس تھا۔ اس جرمن یہودی کی پیدائش ۱۸۱۸ء میں ہوئی۔ اس نے قانون و تاریخ و فلسفہ کی تعلیم حاصل کی اور ایک اخبار بھی جاری کیا۔ اس اخبار کے سلسلہ میں جرمنی کے ارباب مقتدر اس سے ناراض ہوئے تو اُسے پیرس چلا آنا پڑا۔ پیرس میں اس کی ملاقات نراجی اور اشتراکی خیالات کے لوگوں سے ہوئی اور مارکس نے ان کی صحبت میں ان مسایل کا مطالعہ کیا۔ انہی دنوں میں اس کی ملاقات فریڈرک اینجلس سے ہوئی۔ اینجلس، گو جرمن تھا لیکن انگلستان میں آباد ہوکر ایک کارخانہ کا مالک اور متمول شخص ہوگیا تھا۔ اینجلس کے پہلو میں ایک دردمند دل تھا اس لئے وہ اپنے

زمانہ کے عمرانی حالات اور خاصکر مفلس اور نادار طبقہ کی حالت زار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے رابرٹ اوون کے اصلاحی خیالات اور مساعی کا غائر مطالعہ کیا، اور جب پیرس میں اس کی ملاقات مارکس سے ہوئی تو دونوں نے متحدہ طور پر سیاسی و معاشی مسایل پر غور و فکر شروع کیا۔ ان کے باہمی اتحاد کا یہ حال تھا کہ ان دونوں کے بیشتر تصانیف کی اشاعت متحدہ طور پر ہوئی۔

مارکس پر ہیگل کے نظریات کا ضرور اثر پڑا، لیکن مارکس نے مملکت کے ہیگلی تصور سے اپنے حسب منشا کام لیا اور اس شہرۂ آفاق نظریہ کو پیش کیا جس کو علمی اصطلاح میں "تاریخ کی مادی تعبیر" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مارکس نے معاشی مظاہر کو معاشرتی ارتقا کی بنیاد قرار دیا، اور یہ خیال ظاہر کیا کہ 'پیدائش دولت کے رائج الوقت طریقوں ہی کی بدولت معاشرہ (سوسائٹی) کے ادارے قایم ہوتے ہیں' اور سماج کے مختلف طبقات کے باہمی تعلقات کا تعین اور نوعیت معاشرہ کی تکمیل تمام تر عاملین پیدائش کی پیہم ارتقائی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

عاملین پیدائش، یعنے وہ مادی ذرایع جن پر انسان کو تصرف حاصل ہے اور انسان کا وہ علم جو ان مادی وسایل کے استفادہ سے متعلق ہے ترقی پذیر ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس تصرف و علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور نئے معاشی تنظیمات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، جس سے مختلف سماجی طبقات کی تنظیم اور ان میں اقتدار کی تقسیم لازم آتی ہے۔ کسی زمانہ میں یہ "اقتدار اعلیٰ" بڑے بڑے زمینداروں کے قبضہ میں تھا اور سماج کی تنظیم بھی انہی جاگیرداروں اور زمینداروں کی ضروریات کے مطابق عمل میں آئی۔ اس کے بعد صنعتی اور تجارتی ترقیات کا زمانہ آیا۔ نتیجہ قدیم زمیندار طبقہ کا روایاتی اقتدار زوال پذیر ہوا، صنعتی جماعتوں کے اعلیٰ طبقوں کے افراد نے قدیم زمیندار طبقہ کے مقابل حصول اقتدار کے لئے کشمکش کی۔ بتدریج یہ اقتدار صنعتی و تجارتی طبقہ کے ہاتھوں منتقل ہوا اور ایک ایسا حکمران طبقہ

وجود میں آیا جو زمینداروں اور صنعتی سرمایہ داروں کے امتزاج کا نتیجہ تھا۔ صنعتی انقلاب و ترقی کے لئے مزدوروں کا اجتماع لازمی تھا، اور مزدوروں نے اس اجتماعی قوت سے کام لیا اور اپنے حقوق کی حفاظت میں اپنے "آقاؤں" کے خلاف متحدہ تنظیم کی بنا ڈالی۔ دوسرے الفاظ میں موجودہ تحریک عمال کا آغاز ہوا جو سرمایہ دار طبقہ کے مطالبات و مفروضات کے خلاف ایک قومی اور منظم جد وجہد ہے۔

مارکس کا خیال تھا کہ مزدوروں کا یہ محکوم طبقہ جو اپنے حق تنظیم و احتجاج سے کسی حال محروم نہیں کیا جا سکتا۔ بالآخر سرمایہ دار طبقے اور سرمایہ داری کے معاشی نظام کو تباہ کر کے دم لے گا، اور پرولتاری طبقہ کو کامرانی نصیب ہوگی۔ پرولتاری طبقہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد کوئی اور طبقہ ہی باقی نہ رہے گا جس کا استحصال کیا جا سکے۔ اس طرح پر ایک ایسے "سماج" کے قیام سے جس میں طبقات کا وجود ہی نہ ہو، استحصال کا اپنے آپ خاتمہ ہو جائے گا، اور پوری جماعت پر پوری جماعت کی حکومت سے ایک ایسا معاشری نظم ونسق قایم ہوگا جو پوری جماعت کے وسایل کی تنظیم جماعت کے مفاد کی خاطر انجام دے گی۔

مارکس کے تعلیمات کا ماحصل یہ ہے کہ مزدوروں کے طبقہ کا فرض صرف اسی قدر نہیں کہ وہ اقتدار مملکت پر حاوی ہو جائے اور اس کو اپنے مقاصد و اغراض کی تکمیل میں کام میں لائے، بلکہ اہم فرض یہ ہے کہ وہ اس مملکت اور اس طبقہ کو جس کی کہ مملکت نمایندہ ہے، تباہ کر دے، اور اس کی جگہ ایک نیا ادارہ قایم کرے۔ اس نئے ادارہ کی نوعیت اور اس کے قیام کے تدابیر سے متعلق مارکس کے "تابعین میں اختلاف رائے ہے۔ کمونیٹ (اشتمالی) اور سوشل ڈموکراٹک (اشتراکی جمہوری) جماعتیں اسی

اختلاف آراء کا نتیجہ ہیں۔ اشتمالیت اور اشتراکی جمہوریت کا یہ اختلاف عہد حاضر میں بہت نمایاں ہوگیا ہے۔ مارکس نے اپنے نظریات کو نہایت واضح طور پر ۱۸۴۸ء میں کمیونسٹ مینیفسٹو کے ذریعہ ظاہر کیا۔ لیکن اس کے اثرات ایک عرصہ بعد ظاہر ہوئے۔ ابتدا میں "سوشیل ڈیموکریٹک" کا زور رہا، اور ۱۸۶۴ء میں پہلی بین الاقوامیہ کا انعقاد ہوا۔ انقلاب روس ۱۹۱۷ء کے بعد اشتمالیت کو عروج ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جب کہ روس کی نیم مہذب مطلق العنان حکومت کا خاتمہ ہوا، ایک عارضی حکومت قائم ہوئی جو تقریباً جرمنی کے ایبرٹ اور شیڈمان کی حکومتوں کے مشابہ تھی۔ لغاف کی یہ عارضی حکومت نہایت قلیل عرصہ تک قائم رہی۔ زار کی حکومت کے خاتمہ کے چند ماہ بعد ہی بالشویک جماعت نے نکولائی لینن کی قیادت میں اقتدار حاصل کی۔ جرمنی کی سوشیل ڈیموکراٹک پارٹی اور اسی نمونہ کی دیگر جماعتوں نے جن میں روس کے منشویک بھی داخل ہیں، پارلیمنٹری اشتراکی پارٹیاں قائم کرکے یہ کوشش کر رہی تھیں کہ حکومت کی مشنری پر قابض ہوجائیں اور قانون سازی کے ذریعہ سرمایہ داری نظام کو اشتراکی نظام سے بدل دیا جائے، اور اس طرح سماج کی نوعیت تبدیل کی گئی۔ بالشویک اشتمالی جماعت کو اس طریق کار سے صریح اختلاف ہے۔ وہ کبھی یہ تصور نہیں کرسکتی کہ ایک سرمایہ دارانہ مملکت پر قبضہ کرکے اس مملکت کو اشتراکی مفاد کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اشتمالیوں کا ایقان ہے کہ صرف انقلاب ہی کے ذریعہ موجودہ نظام بدلا اور اس کی جگہ دوسرا نظام قائم ہو سکتا ہے۔ مارکس کا عقیدہ ہے کہ جب تک سرمایہ داری نظام برقرار ہے۔ اصلی معنوں میں

جمہوریت کا وجود ہی نہیں ہوسکتا۔ خواہ حق رائے دہی میں کتنی ہی وسعت کیوں نہ پیدا کی جائے، کیونکہ ایک ایسے سماج میں جہاں کہ عظیم معاشی عدم مساوات موجود ہیں مساوی سیاسی حقوق کا تصور کرنا ہی غلط ہے۔ اصلی جمہوریت کا قیام معاشی عدم مساوات کے اختتام ہی پر ممکن ہے۔

مارکس کے نزدیک مملکت کا تصور ایک مجلس عاملہ سے زیادہ نہیں، اور ایک ایسی مجلس عاملہ جو حکمران طبقہ کا من حیث المجموع انصرام کرتی ہے۔ اشتمالی ذہن کبھی کسی اشتمالی مملکت کا تصور کرہی نہیں سکتا کیونکہ یہ اصطلاح بجائے خود اجتماع ضدین ہے۔ ایک اشتمالی کے نقطۂ نظر سے مملکت سے مراد وہ آلہ یا ذریعہ ہے جس کے توسط سے ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر ظلم کرتا ہے۔ کامل اشتمالیت کے قیام سے جو سماج قایم ہوگا اس میں طبقات، ہی نہ ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے ظلم کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ اس وجہ سے مملکت کی ضرورت ہی نہیں رہتی، البتہ سماج کے انتظامی امور ایک انتظامی مشنری کے ذریعہ انجام پاسکتے ہیں۔

اشتمالیوں کا نظریہ ہے کہ سرمایہ داری نظام کے خاتمہ کے ساتھ ہی "کامل اشتراکی سماج" کا قیام ممکن نہیں ہے، اس کے لیے کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے، اور عبوری دور میں کامران پرولتاری جماعت کو اپنی قوت کی تنظیم اور "مخالف انقلابیت" عناصر کے استیصال میں مصروف رہنا پڑتا ہے، اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ پرولتاری جماعت قدیم حکمران طبقہ کا انضمام اور جدید غیر طبقاتی سماج کے استحکام اور بقا کی تدابیر پر غور کرتی ہے۔ اور ایسے اداروں اور

تنظیمات کے قیام میں منہمک رہتی ہے، جو ایک اشتراکی سماج کے آزادی عمل کے لیے لابُدی ہیں۔ علاوہ ازیں اس دور میں پرولتاری طبقہ خود کو ایک غیر طبقاتی سماج کی طرز زندگی کا عادی بنانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اس عبوری دور کو اشتمالی جماعت "پُرولتاری آمریت" سے موسوم کرتی ہے۔ پرولتاری آمریت کی اصطلاح مارکس کے تصانیف ہی سے لی گئی ہے۔ روس کا وہ چودہ سالہ زمانہ جو انقلاب کے بعد گذرا اور جس دور سے روس اب بھی گذر رہا ہے اسی نام سے موسوم ہے۔ اشتمالی نظریہ میں "آمریت" کے تصور کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ نظام سرمایہ داری کے اختتام اور کامل اشتراکی سماج کے قیام کے درمیانی دور میں "آمریت" لازمی سمجھی جاتی ہے تاکہ مملکت کو ایسا قومی اقتدار حاصل رہے جس سے اشتراکی معاشرہ کے قیام میں سہولت ہو۔ اشتمالین کا ایقان ہے کہ جونہی کامل اشتراکی سماج قایم ہو جائے، آمریت خود بہ خود ختم ہو جاتی ہے۔

پرولتاری جماعت صرف مقتدر اعلیٰ کی شکل رکھتی ہے۔ چونکہ وہ ایک طبقہ یا جماعت ہے اس لیے یہ ممکن نہیں کہ پورا طبقہ حکومت کی مجلس عاملہ کے فرائض انجام دے سکے۔ بدیں وجہ ایک عاملانہ کمیٹی کا وجود لازم ہو جاتا ہے، اور عاملانہ مجلس کی رہبری و رہنمائی کے ایک ایسی جماعت کا وجود ضروری ہے جو پرولتاری عوام کی "منظم رائے عامہ" کو ظاہر کر سکے۔ اس لیے اشتمالی نظریہ کے مطابق یہ فرض "کمونیسٹ پارٹی" کا ہے۔ مملکت سوویٹ روس میں پرولتاری جماعت کی نیابت (مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے) مقامی اور ضلع واری

سوویٹس (پنچایتوں) اور مرکز میں مملکت روس کی قومی سوویٹ کانگریس میں ہوتی ہے اور حکمران طبقہ کی حیثیت کا اظہار کمونسٹ پارٹی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ کمونسٹ پارٹی، پرولتاری عوام کے اعلیٰ اور بہتر دماغوں پر مشتمل ہے۔ کمونسٹ پارٹی ہی وہ جماعت ہے جو بعد بحث و تمحیص حکومت کی پالیسی اور اہم امور مملکت کے بارے میں تجاویز پیش کرتی ہے اور پنچایتوں کی کانگریس جو از روئے دستور اعلیٰ مجلس قانون ساز ہے، فی الحقیقت کمونسٹ پارٹی کی مرتبہ پالیسی اور تجاویز کی تشہیر و اشاعت کا فرض انجام دیتی ہے۔ مخفی نہ رہے کہ سوویٹ کانگریس مغربی یورپ اور امریکہ کی پارلیمانٹوں کے مماثل نہیں اور نہ اس کا کوئی مستقل وجود ہے، بلکہ خاص خاص موقعوں پر اس کے مندوبین کا اجتماع ہوتا ہے اور حکومت کی مجلس عاملہ یعنی کونسل آف ڈیپوٹیس کمسرز اور کمونسٹ پارٹی کی سیاسی شاخ کانگریس سے قریبی ربط اور مستقبل تعلق رکھتے ہیں۔ سوویٹ دستور حکومت اور حکومت کا طریق کار، پارلیمنٹری جمہوریت کے اساسی مفروضات اور تصورات کے مغایر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سوویٹ روس میں حق رائے دہی نہایت وسیع پیمانہ پر عطا کیا گیا ہے، لیکن یہ صرف طبقہ واری رائے دہی ہے۔ اس میں وہ افراد اور جماعتیں شامل نہیں ہیں جن کا تعلق خانگی تجارت اور زمیندار (متمول) طبقہ سے ہے۔ حق رائے دہی کا اصول ایک فرد ایک رائے (ووٹ) کے بجائے ایک مزدور ایک رائے کے اساس پر ہے۔ سب سے پہلے مقامی پنچایتیں منتخب ہوتی ہیں اور یہ پنچایتیں، ضلع واری اور قومی سوویٹس اور کانگریس کے نمائندوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ نتیجتہً بالعموم کمونسٹ پارٹی کی سرکاری فہرست کے مندرجہ

افراد بلاکسی مخالفت کے منتخب ہو جاتے ہیں۔ اس طریق کا مقصد یہ ہے کہ انتخابات انفرادی اثرات سے محفوظ رہیں اور تمام تر جماعتی نقطۂ نظر و مفاد کی نیابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انتخابات پر کمونیسٹ پارٹی پورے طور پر حاوی ہوتی ہے۔ پس موجودہ مملکت سویٹ روس ایک ایسی جماعتی مملکت جو ایک طبقہ کی اساس پر قایم ہے اور یہ مملکت کسی مکمل اشتراکی نظام کا آلۂ حکومت نہیں ہے، بلکہ کامل اشتراکی نظام کے قیام تک کے عبوری دور کا ایک امدادی ذریعہ ہے جو اپنے معاشی و سیاسی تدابیر اور تجاویز کے ذریعہ بتدریج خانگی تاجر اور متمول زمیندار طبقات کو ختم کرکے زراعت کو اشتراکی سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ سویٹ مملکت کا مقصد یہ ہے کہ ایک معین مدت کے معاشی منصوبہ کے تحت ملک کو صنعتی وزراعتی ترقی سے مالامال کردیا جائے اور کامل اشتراکی سماج قایم کردیا جائے جس کے بعد مملکت کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی اور صرف ایک ہی طبقہ رہ جائے گا۔ اس مقصد کے پیش رفت میں کمونیسٹ پارٹی اس وقت معاشی نظم ونسق کے ایسے اداروں اور تنظیمات کے قیام اور تنظیم میں منہمک ہے جو بہ زمانہ مستقبل کسی سیاسی نگرانی کے بغیر اپنے آپ انصرام کار کے قابل ہو جائے گی۔ ٹرسٹس (جو اس وقت ملک کی صنعتوں کو چلا رہی ہیں) اور منصوبہ بندی کی کمیشنیں اور کنٹرولنگ کونسلیں (جو ملک کی معاشی زندگی کی رہنمائی اور تنظیم کررہی ہیں) اور ٹریڈ یونینس و انجمن امداد باہمی جس کو کہ نظم ونسق میں مسلمہ حیثیت حاصل ہے، اصلی معنوں میں سوشیل کنٹرول کا فرض انجام دے رہی ہیں، اور ان اداروں کی کارکردگی کی بنا پر بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل میں یہی ادارے پرولتاری آمریت

اور طبقہ واری مملکت کی جگہ لیں گے اور ان کے نعم البدل ثابت ہوں گے اور سیاسی حکومت کے بجائے معاشی نظم ونسق قایم ہوگا۔

یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ اشتمالی نظریہ کے مطابق "انقلاب روس" مستقبل کے "انقلاب عالم" کا صرف ایک جز ہے۔ جب تک روس سے باہر سرمایہ داری نظام موجود ہے، باہر کی دنیا سے روس کو رد انقلاب کا خطرہ لگا ہوا ہے، تا وقتیکہ دنیا میں انقلاب نہ ہو روس کی اشتمالی تحریک محفوظ و مامون سمجھی نہیں جاسکتی۔ انھی وجوہ سے اشتمالین کا ایقان ہے کہ جب تک روس سے باہر دنیا کے کسی حصہ میں پرولتاری طبقہ محکوم حالت میں ہے، روس میں طبقہ واری مملکت کا وجود لازم ہے۔ اس طرح پر روس میں مملکت کا خاتمہ ایک غیر معین مدت تک کے لیے ملتوی ہوگیا ہے۔ اور سویٹ روس کے جو دوستانہ تعلقات دنیا کے سرمایہ دار اقوام اور ممالک سے قایم ہیں ان کی نوعیت طبقاتی جنگ کے دوران میں "عارضی صلح" سے زیادہ نہیں۔ ان طبقات کا خاتمہ صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ ساری دنیا اشتراکیت کی اور سلامتی کی ضامن نہ ہو جائے۔

عوام کا منصہ

از

جناب سید معین الدین قادری صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

جنگ ختم ہو چکی، اور جنگ کے ساتھ تخریبی کارروائیوں کا دور بھی ختم ہو چکا۔ آج کل ہر ملک میں تعمیر نو اور تنظیم جدید کی تحریکات موضوع بحث بنی ہوئی ہیں۔ شاید ہی دنیا کا کوئی متمدن ملک ایسا ہو جہاں تعمیری منصوبے تیار نہ کئے گئے ہوں۔ جنگ کے بعد کے اس دور کو اگر کوئی موزوں نام دیا جا سکتا ہے تو وہ منصوبوں کا دور ہو سکتا ہے۔

منصوبہ بندی کا لفظ اگرچہ کہ آج کل ہر ایک کی زبان پر ہے لیکن تعمیری کاروبار کا یہ طریقہ کوئی اس جنگ کی پیداوار نہیں ہے۔ اس جنگ سے قبل بھی کئی منصوبے بنائے گئے اور انہیں روبہ عمل لایا گیا۔ شاید اس سلسلہ میں روس کو اولیت حاصل ہے جس نے اپنے پنجسالہ منصوبوں کو کامیاب انصرام تک پہنچا کر منصوبہ بندی کے تخیل کو بہت تقویت پہنچائی اور عام کیا۔ ہٹلر نے جرمنی میں چار سالہ منصوبوں کے ذریعہ قوم و ملک کو

جنگ کے لیے تیزی سے تیار کرنے کا طریقہ اختیار کیا، اور صدر روزویلٹ نے عظیم کساد بازاری کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنا منصوبہ 'نیوڈیل' کے نام سے امریکہ میں جاری کیا۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی لوگ منصوبہ بندی کے طریقوں سے محض ناآشنا نہیں تھے۔ اگرچہ کہ حکومت نے کسی منصوبہ کے تحت ملک کے کاروبار کی تعمیر کا کام انجام نہیں دیئے لیکن بعض لوگوں نے نجی طور پر منصوبے پیش کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایم۔ ویسی وریا کی شخصیت بہت نمایاں ہے جنھوں نے باضابطہ طور پر ہندوستان کی معاشی ترقی کے لیے کتابی شکل میں ایک مبسوط منصوبہ پیش کیا۔

اس جنگ کے بعد بھی موصوف نے اپنا ایک منصوبہ رسالہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ پرشوتم داس ٹھاکر داس اور ان کے ساتھیوں کا منصوبہ، گاندھی منصوبہ، اور خود حکومت کے پیش نظر بھی باضابطہ منصوبہ بندی کے تحت ملک کے معاشی و دیگر حالات کی تنظیم ہو رہی ہے۔ اس مضمون کا مقصد اس منصوبہ کا خلاصہ پیش کرنا اور اس پر تبصرہ کرنا ہے جو ہندوستان کے اشتراکی حضرات کی طرف سے ایم۔ این، رائے صاحب کی نگرانی میں تیار ہو کر لوگوں کے سامنے بحث ونظر کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ اس منصوبہ کا نام "عوام کا منصوبہ" ہے۔ پہلے اس منصوبہ کا خلاصہ پیش کیا جائے گا اور اس کے بعد اس پر اظہار خیال کیا جائے گا۔

ہندوستان کی معیشت کا مرکزی مسئلہ غربت کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے سے پہلے ملک میں صنعتی ترقی کی کوششیں کی جائیں، پر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ باشندگان ملک کی قوت خرید پست ہونے کے باعث ملک کے بازار میں صنعتی پیداوار بک نہ سکے گی اور مجبوراً بیرون ملک بازاروں کی تلاش کرنی پڑے گی۔ ان طریقوں سے فاشزم یا فسطائیت کے طریقوں کو

تقویت پہنچتی ہے۔ اور ملک کا اہم مسئلہ یعنے غربت کا مسئلہ بغیر حل ہوئے اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ ان حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستان کی منصوبہ بندی میں سب سے زیادہ توجہ زراعت پر دی جانی چاہیئے، کیونکہ ملک کی آبادی کا تقریباً چوتھائی حصہ اس پیشہ میں مصروف ہے اور یہی طبقہ ملک میں سب سے زیادہ غریب طبقہ ہے۔ زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملک کے عوام کی قوت خرید میں خود بخود اضافہ ہوتا جائے گا جس کے بعد صنعتی ترقی کے لیے ملک میں کافی وسیع بازار نکل آئے گا۔ معاشی ترقی کی موجودہ کوششوں میں اگر صنعت کو اولیت اور تقدیم حاصل ہو جائے تو بہت جلد سرمایہ دارانہ نظام کا وہ قدیم تجربہ پھر دہرایا جائے گا کہ جس میں کاروبار ماند پڑ جاتے اور کارخانے بند کر دئے جاتے ہیں اور کساد بازاری کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر صنعتی کاروبار کا محرک بدل جائے یعنے بجائے ذاتی منفعت کے استعمال کے لیے اشیا پیدا کی جائیں تو ایسی صورت میں یہ معاشی افراتفری پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ ذاتی املاک پر تحدیدات قائم کی جائیں۔

باشندگان ہند کے ایک بہت بڑے طبقہ کی ابتدائی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں، ان کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قدیم صنعتوں کو وسعت دی جائے اور بعض نئی صنعتیں قائم کی جائیں۔ ان صنعتوں کی جو پیداوار ہو ان کی قیمتیں ایسی مقرر کی جائیں کہ وہ عوام کے دسترس میں رہیں۔ ورنہ قیمتیں زیادہ رہیں گی تو پھر ان اشیا کی تیاری عوام کے لیے نہیں بلکہ مالدار طبقات کے لیے سمجھی جائے گی۔ صنعتی ترقی کے ذریعہ عوام کی احتیاجات کو رفع کرنے کا مقصد اس وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ پیدائش دولت کا مقصد بجائے نفع اندوزی کے

استعمال کی اشیا پیدا کرنا ہو۔

اس قسم کی صنعتی ترقی کے لیے ذاتی سرمایہ سے کام نہیں چلے گا کیونکہ اول تو اس کا مقصد نفع کمانا نہ ہوگا اور دوسرے یہ سرمایہ کاری طویل مدت کے لیے ہوگی جس کا لوگ انتظار نہ کرسکیں گے، اس لیے ان کاروبار میں شغل اصل کا کام ایک بڑی حد تک حکومت کو کرنا ہوگا اور ایسی صورت میں نگرانی بھی حکومت ہی کی ہوگی۔ جو پیدائش مرفہ الحالی کے مقصد کے تحت ہو وہ ذاتی املاک اور نفع اندوزی کے مقاصد کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

جن معاشی کاروبار میں ذاتی سرمایہ لگا ہوا ہے ان کو بھی ایک حد تک حکومت کو اپنی نگرانی میں لینا ہوگا۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ ۳٪ منافع مقرر کردے۔ اگر یہ نہ مل سکے تو حکومت اپنے مالیہ میں سے ان کی ادائی کرے۔ اس طرح سرمایہ داری کی ایک قسم کی راتب بندی ہو جائے گی اور صنعتی کاروبار بازار کے آئے دن کے نشیب و فراز سے محفوظ رہ سکیں گے۔

یہ تمام منصوبہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ حکومت کی ہئیت ترکیبی میں تبدیلی ہوگی ورنہ حکومت کی نگرانی کا سوال خود حکومت پر نگرانی کے بغیر بالکل بے معنی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کے موجودہ نظام میں تبدیلی کی جائے۔ حکومت کو عوام کی حکومت بنایا جائے جو منتخب نمائندوں کے تحت رہے۔ ہندوستان میں ایک وفاقیہ قائم کیا جائے جو زبان اور معاشرت کی اساس پر ہو، اور راکین وفاقیہ جہاں تک ہو سکے ایک ہی قسم کے جمہوری آئین کے تحت ہوں۔ زیر زمین جو ذرائع ہیں وہ حکومت کی ملک متصور ہوں۔ محنت کی پیداآوری میں میکانی طریقوں کا اضافہ کا کام حکومت کی ذمہ داری میں شامل رہے۔ بھاری صنعتیں

اور بنک حکومت کی راست نگرانی میں رہیں ۔ کاشت کاروں کو لگان کی ادائی کے بعد پورا پورا اطمینان حاصل رہے اور کاشت بر پیمانۂ کبیر حکومت کی طرف سے رائج کی جائے ۔ مختلف کار و بار میں جو مزدور مشغول ہوں ان کی اقل اُجرتیں مقرر کی جائیں اور روزگار یا امداد کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری رہے ۔ اوقات کار چھ گھنٹے روزانہ ہوں اور سال میں ایک ماہ کی تعطیل کا حق دیا جائے اور مزدور عورتوں کو حمل اور زچگی کے زمانہ میں خاص رخصتوں کا حق حاصل رہے ۔ سولہ سال کی عمر تک مفت اور جبری تعلیم رہے ۔ حفظان صحت کا کام حکومت کی نگرانی میں رہے ۔ سب کے لیے تحریر و تقریر اور جلسوں کی آزادی رہے اور اسی طرح مذہبی آزادی سب کو حاصل رہے ۔ شہری آزادی میں ذکور و اناث کو مساوی حقوق عطا کئے جائیں ۔ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت متنا سب نمائندگی کے اصول پر ہو ۔ اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے لیے ہر تہذیبی منطقہ کو خود اختیاری حاصل رہے ۔

اس منصوبہ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو ضروریات زندگی مہیا کرنے کے علاوہ تعلیم اور صحت کی سہولتیں بھی بہم پہنچانا ہوں گی ۔ ان تمام ضروریات کی تکمیل کے لیے ملک کی پیداوار میں کافی اضافہ کرنا ضروری ہے ۔ اس اضافہ پیداوار کو مفید بنانے کے لیے ذاتی املاک اور نفع کے محرک پر تحدید قائم کرنی پڑے گی اور اس کے ساتھ ربا کی روک تھام ، لگان کے قدیم طریقوں کی اصلاح اور تقسیم دولت کے بہتر طریقوں کی ترویج ضروری ہے ، ورنہ بغیر ان کے صرف پیدائش دولت کا اضافہ مرفہ الحالی پیدا نہیں کر سکتا ۔ بہتر تقسیم دولت کے لیے موجودہ طریقوں میں تغیرات کرنا ضروری ہے ۔

ذاتی املاک اور نفع اندوزی کی تحدید اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس طریقے سے لوگوں کو ان کی محنت کا پورا معاوضہ ملنے کے بعد ماحصل زائد یا منافع کا ایک بڑا حصہ حکومت کے ہاتھ میں آجائے گا جس کو حکومت ملک کے معاشی کاروبار میں پھر مشغول کر سکے گی اور اس طرح منصوبہ کی تکمیل میں آسانی اور تیزی پیدا ہو جائے گی۔

زراعت کو چونکہ منصوبہ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور موجودہ حالات میں کاشت کار، ساہوکاروں اور زمینداروں کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہیں کہ ان کی محنت کا حقیقی معاوضہ نہیں مل سکتا، اس لیے زمین اور زیر زمین ذرائع کو حکومت کی ملک بنانا ضروری ہے تاکہ کسان اور حکومت کے درمیان کوئی پردے حائل نہ رہیں اور کاشت کے ساتھ کاشت کار کی اصلاح میں بھی رکاوٹیں باقی نہ رہیں۔

زیر زمین ذرائع سے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس قدر ہیں۔ لیکن جو کچھ بھی ہیں ان کو حکومت کی ملکیت میں لے لیا جانا چاہیئے۔ ملک کے مالی ادارے، مثلاً بنک وغیرہ بھی حکومت کی ملکیت میں رہیں۔ اسی طرح تجارت خارجہ اور بیرونی ممالک سے مالی تعلقات بھی حکومت ہی کا اجارہ متصور ہوں۔ اندرون ملک شہر و دیہات کے درمیان امداد باہمی کی انجمنوں کے ذریعہ کاروبار طے پائیں، لیکن ان کے پورے طور پر قائم اور جاری ہونے سے قبل ان بین ملکی تجارتی تعلقات پر بھی حکومت کی سخت نگرانی رہے۔ دوران جنگ کے تلخ تجربوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ذاتی منفعت کے محرکات نفع بازی، احتکار، اور ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ قیمتوں میں نشیب و فراز کر کے باشندگان ملک کے لیے کافی پریشانی کا باعث ہے۔

ملک کی مکمل مرفہ الحالی کے لیے ریاستوں کو ساتھ لینا ضروری ہے۔

منصوبہ میں جو اعداد اور ترقی کے امکانات پیش کئے گئے ہیں وہ محض تخمینے ہیں، کیونکہ یہاں کے اعداد وشمار ناقابل بھروسہ ہوتے ہیں۔ اس لیے جیسے جیسے منصوبہ کی تکمیل وتعمیل ہوتی جائے گی حالات کا ٹھیک جائزہ لے کر صحیح اندازے قائم کرنے پڑیں گے اور کافی تحقیقات کا کام انجام دینا پڑے گا۔

ہندوستان کے زرعی حالات کی اصلاح وترقی کے لیے روسی تجربہ سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس ملک میں روس سے کہیں زیادہ آبادی ہے اس لیے ان کی پیداآوری میں اضافہ کرکے اس ملک سے بہت زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے۔

کاشت کاروں کی فلاح وبہبود کے لیے حقیت اراضی کے طریقے اور ربائی قرض کا ختم کر دیا جانا اولین کام ہے۔ زمینات کو قومی ملک بنادیا جائے۔ لیکن انقلابی طریقوں سے نہیں بلکہ اصلاحی طریقوں سے۔ اس سلسلہ میں فلاؤڈ کمیشن کی سفارشات بہت مفید اور کارآمد ہیں۔ کمیشن، بنگال کے زرعی حالات کا تفصیلی معائنہ کرکے اس نتیجہ پر پہنچا کہ دوامی بندوبست اور زمینداری نظام دونوں بھی از کار رفتہ ہو چکے اور زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ان کی خرابیوں کو دُور کرنے اور کسانوں کی اور زراعت کی اصلاح کے لیے سب سے بہتر طریقہ ان سب کی متفقہ رائے میں یہ ہے کہ ان دونوں طریقوں کا خاتمہ کرکے حکومت زمینداروں کو معاوضہ دے دے اور زمینات کو اپنی ملک بناکر کاشت کاروں سے براہ راست تعلق قائم کرے۔ زمینداری طریقہ کو ختم کرکے زمینات کو حکومت کی ملک بنانے پر تو سب متفق ہیں، لیکن معاوضہ سے متعلق اب کسی ایک شرح پر متفق نہیں۔

سب سے زیادہ تائید اس رائے کو حاصل ہوئی کہ خالص منافع کا دس گنا معاوضہ دے کر زمینات کو حکومت کی ملک بنا لیا جائے۔

اگرچہ کہ یہ تحقیقات اور یہ رائے بنگال کے حالات سے متعلق ہے لیکن کمیشن کا یہ خیال ہے کہ ان تجاویز میں ضروری ترمیم کر کے اور مقامی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا پورے ملک پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ زیر تبصرہ منصوبہ پیش کرنے والوں کی بھی یہی رائے ہے کہ اس کمیشن کی تجاویز کو کم از کم منصوبہ کی ابتدائی منازل میں قبول کر کے پورے ملک میں اس کو وسیع کر دیا جائے۔ انھوں نے ان زمینداری علاقوں کے ساتھ اوقاف کی زمینات کو بھی شریک کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض زمینات غیر کاشت کار طبقہ کے ہاتھ میں چلی گئی ہیں، اور چونکہ یہ حقیت بھی زراعت کے لیے نقصان رساں ہے اس لیے ان کو حکومت کی ملکیت میں لے لینا چاہیے۔ انھی کے ساتھ زیر زمین ذرائع اور ماہی گیری وغیرہ کے حقوق بھی حکومت ہی کی ملکیت میں آجائیں۔ اس طرح زمینداری نظام کی حکومت کی ملکیت میں تبدیلی، اوقاف اور غیر کاشت کار طبقہ کی زمینات کا حصول اور زیر زمین ذخائر کی ملکیت کے حقوق حاصل کرنے کے لیے حکومت کو مجموعی طور پر تقریباً (۱۷٫۳۵) کروڑ روپیہ صرف کرنا پڑے گا۔

دوسرا اہم مسئلہ زرعی قرضداری کا ہے جس کا تخمینہ (۹۰۰) سے (۱۸۰۰) کروڑ تک کیا گیا ہے۔ جنگ کے دوران میں کاشت کاروں کو جو فائدہ ہوا اس کی وجہ سے قرض کے ایک حصہ کی بے باقی کو مان بھی لیا جائے تو یہ قرضہ اوسطاً (۱۰۰۰) فرض کیا جا سکتا ہے۔ حکومت مصالحت قرضہ کے طریقہ پر اس کا ۲۵ ٪ دینے پر قرض خواہوں کو

راضی کرلے سکتی ہے۔ اس طرح زمینات حاصل کرنے اور قرض ادا کرنیکے مجموعی مصارف (۱۹۸۵) کروڑ ہو جاتے ہیں۔

زرعی پیداوار کو دو طرح پر بڑھایا جاسکتا ہے۔ ایک وسعت کاشت کے ذریعہ دوسرے زمین کی پیداآوری میں اضافہ کے ذریعہ۔ اعداد و شمار یہ بتلاتے ہیں کہ ابھی (۱۷) کروڑ ایکڑ ایسے ہیں جن کا شمار قابل کاشت بے کار زمین میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ سب تو قابل کاشت نہیں ہوسکتے ورنہ بے کار نہ پڑے رہتے۔ لیکن میکلیگن گوری صاحب کا خیال ہے کہ ان میں سے (۱۰) کروڑ تو ضرور ایسے ہیں کہ جن پر اگر حکومت چاہے تو میکانی طریقوں اور دوسرے ترقی یافتہ زرعی طریقوں کی مدد سے کاشت کو وسیع کرسکتی ہے۔ گویا اس طرح موجودہ رقبہ (۲۱) کروڑ میں (۵۰) ٪ کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے علاوہ بہتر طریق کاشت کو رائج کرنے کے لیے کھاد اور تخم کی اچھی قسمیں رائج کرنی پڑیں گی۔ آب پاشی کو وسیع کرنے کے لیے کئی تعمیری کام انجام دینے پڑیں گے اور خود حکومت کو بڑے بڑے مزرعے قائم کرنے پڑیں گے۔ ذرائع آب پاشی میں آئندہ منصوبہ میں ۴۰ فی صد تک اضافہ ہونا چاہیئے۔ دیسی کھاد کی مقدار میں زیادتی کے علاوہ چند مصنوعی اور کیمیاوی کھادوں کو بھی رائج کرنا پڑے گا۔ ان کے علاوہ مشترکہ کاشت کے فوائد بتلانے کے لیے حکومت کو خود کئی مزرعہ جات کے لیے ان سے کافی خام پیداوار حاصل ہوسکتی ہے لیکن اس کے کافی مصارف برداشت کرنے پڑیں گے۔

اس طرح قابل کاشت بے کار اراضیات کو زیر کاشت لانے میں، آب پاشی میں وسعت کرنے میں، بڑے بڑے مزرعہ جات قائم کرنے میں،

زمین کی اصلاح اور جنگلات کی ترقی کے سلسلہ میں اور دیہی صنعتوں کے قیام اور بہتر کھاد و اعلیٰ تخم کی فراہمی میں حکومت کو (۲۷و ۹۵) کروڑ روپیہ صرف کرنا پڑے گا۔

اس طرح زرعی ترقی، وسعت کاشت اور اضافہ پیداوار کی وجہ سے کاشت کاروں کی قوت خرید میں اضافہ ہوگا اور وہ اس قابل ہوں گے کہ اپنی مختلف ضروریات کو پورا کر سکیں۔ ادھر ان عوام کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں گی اور دوسری طرف صنعتوں کے لیے ملک ہی میں بازار وسیع ہونے لگے گا منصوبہ کی تکمیل کے ساتھ اشیائے صرف کی طلب میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ اگر صنعتی ترقی ساتھ نہ دے سکے تو شاید بیرون ملک سے اشیا درآمد کرنی پڑے۔

صنعتی ترقی پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ۱۹۵۰ء کے حالات ۱۹۲۰ء سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ موجودہ ہندوستان کو ۱۹۲۰ء کے روس کی طرح کسی بیرونی حملہ کا خوف نہیں ہے۔ اس لیے سب سے پہلے یہاں کے بنیادی پیشہ، یعنے زراعت کو اہمیت حاصل ہونی چاہیئے اور اس کے بعد صنعت کو۔

صنعت میں بھی پہلے کلیدی صنعتوں پر مصارف برداشت کئے جائیں، مثلاً برقابی قوت، لوہا و فولاد، بالخصوص زرعی آلات، معدنیات، بھاری کیمیاوی اشیا، مشنری، سمنٹ اور ریلوے انجن وغیرہ، ان پر پہلے توجہ اس لیے دی جانی چاہیئے کہ انھی پر دوسری صنعتوں کا انحصار ہے۔

اشیائے صرف کی صنعتیں کچھ تو پہلے ہی سے ملک میں رائج ہیں اور کچھ مزید قائم کی جانی چاہئیں، کیونکہ موجودہ کارخانے آئندہ کی بڑھتی ہوئی ملکی طلب کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔

ان مختلف صنعتوں پر حکومت کا تقریباً (۵۶) ارب روپیہ صرف ہوگا۔ جو صنعتیں حکومت قائم کرے گی وہ تو حکومت ہی کی ملک ہوں گی اور اس کی نگرانی میں کام کریں گی، لیکن وہ صنعتیں جن میں ذاتی سرمایہ مشغول ہے اس میں بھی حکومت کو مداخلت کرنی اور نگرانی رکھنی چاہیئے۔ سرمایہ داروں کو ان کے مشغول سرمایہ پر ۳٪ سے زیادہ منافع نہ ملے اور اتنا نہ مل سکے تو حکومت اپنے مالیہ سے ادا کرنے کی ذمہ داری لے۔ اشیا کی قیمتیں بھی حکومت کی طرف سے مقرر کی جانی چاہئیں، ورنہ طلب ورسد کے عوامل پر چھوڑ دیا جائے تو پھر دوران جنگ کے تلخ تجربوں کے دہرائے جانے کا اندیشہ ہے۔ اس سے حکومت کو بھی آمدنی ہوگی اور نفع بازی کے محرک پر بھی تحدید قائم ہو جائے گی۔

دیہی صنائع اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کا مسئلہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ان صنعتوں کو زیادہ پیداآور بنانے کے لیے مشنری کا استعمال ضروری ہے۔ مشنری کے استعمال پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس سے محنت بے کار ہو جائے گی اور بے روزگاری پھیلے گی لیکن ان اندیشوں کے مستقبل قریب میں رونما ہونے کے امکانات نہیں ہیں۔ جیسے جیسے منصوبہ تکمیل پاتا جائے گا نئے نئے ذرائع روزگار نکلتے جائیں گے اور مزدوروں کی قوت خرید بڑھنے سے اشیا کی طلب میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح ایک طرف تو بے روزگاری کا خدشہ نہ رہے گا اور دوسری طرف مشنری کی وجہ سے کافی فرصت نکل آئے گی جس میں تہذیبی و تمدنی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کا مزدوروں کو موقع ملے گا۔

صنعت و زراعت کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے ریلوے، سڑک، بحری اور دریائی راستے، جہاز سازی، ٹیلیفون و ٹیلیگرام کے ذرائع کو کافی وسعت دینی پڑے گی جس میں ملک کی محنت کے لیے کافی ذرائع روزگار نکل آئیں۔

ریلوے کے موجودہ ۴۲ ہزار میل میں کم سے کم ۷۰ فی صد کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ اسی طرح سڑک میں بھی کم و بیش اتنی ہی وسعت کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں بعض کچی سڑکوں کو پکی سڑکوں میں منتقل کرنا پڑے گا جو (۲۸۰) ہزار میل میں (۲۳۰) ہزار میل ہیں۔ ظاہر ہے اس کے لیے کافی مصارف برداشت کرنے پڑیں گے۔

جہازوں کے متعلق قطعی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا کہ کس قدر وسعت ہو اور کتنے مصارف ہوں گے، لیکن یہ بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ان کی تعداد موجودہ ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں۔ اسی طرح دریائی حمل و نقل اور بندرگاہوں کی تعمیر بھی ضروری ہے۔ دریائی حمل و نقل کے کام کو آبپاشی کے کاموں کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔

ٹیلیفون اور ٹیلگرام اور دیگر ذرائع رسل و رسائل کی ضرورت بھی معاشی سرگرمی کے ساتھ بڑھتی جائے گی اور ان میں بھی ملک کی محنت کے لیے ذرائع روزگار نکل آئیں گے۔

اس طرح بحری و بری ذرائع حمل و نقل اور ذرائع خبر رسانی کو وسعت دینے کے لیے جملہ تخمیناً (۱۵۰۰) کروڑ روپے درکار ہوں گے۔

ان مختلف ذرائع معیشت میں ملک کی کافی محنت کھپائی جا سکتی ہے۔ اگر منصوبہ کو تیزی سے روبہ عمل لایا گیا تو ممکن ہے بہت جلد محنت کی قلت محسوس ہونے لگے۔ خصوصاً مہارت طلب محنت کی۔ اس طرح مشنری کے استعمال سے مستقبل قریب میں تو بے روزگاری کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔

ان ذرائع حمل و نقل پر بھی حکومت کی نگرانی ضروری ہے۔ شرح ٹکٹ مقرر کر دینی چاہیئے، اور وہ ایسی رہے کہ ملک کے عوام ان ذرائع سے استفادہ کر سکیں۔

صحت عامہ کے مسئلہ پر بھی جلد توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ شہری اور دیہی آبادی کے ہر ہزار سے بارہ سو افراد کے لیے ایک چھوٹا سا ہسپتال ہونا چاہیئے۔ اسی طرح زچگی خانے اور بہبودیٔ اطفال کے مراکز بھی قائم کئے جائیں۔ ان چھوٹے دواخانوں کے علاوہ بڑے بڑے ہسپتال اور خاص امراض، مثلاً جذام، دق، جنون وغیرہ کے لیے خاص دواخانے قائم کرنے پڑیں گے۔

علاج کے انتظامات کے علاوہ حفظ ما تقدم کی تدابیر بھی اختیار کرنی پڑیں گی۔ اس کے لیے صفائی کا تمام بستیوں میں انتظام کرنا پڑے گا، اور کئی نئے چشمے کھودنے اور نل نصب کرنے پڑیں گے۔

ان کاموں پر مجموعی طور پر تقریباً (۶۰ر۷) کروڑ کے مصارف ہوں گے۔ ان مصارف سے کسی قسم کی آمدنی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لیکن جب تک ان پر مصارف نہ برداشت کئے جائیں اس وقت تک ملک کا معیار صحت بلند نہیں ہوسکتا۔

تعلیمی اعتبار سے ملک کی موجودہ حالت بہت ہی پست ہے۔ اس صدیوں کے جہل کو مٹانے کے لیے ملک کے طول و عرض میں تقریباً (۶۰ر۲) ہزار تحتانی مدارس (۶۰) ہزار وسطانی اور (۱۵) ہزار فوقانی مدارس قائم کرنے پڑیں گے۔ ان مدارس میں تعلیم دینے کے لیے معلمین کی ایک بڑی تعداد کو تربیت دلانی ہوگی۔ کوئی عجب نہیں کہ روس کی طرح ہم کو بھی بیرون ملک سے ماہرین کو طلب کرنا پڑے اسلیے کہ یہ تعلیم صرف ادبی نہیں ہوگی بلکہ ملک کی مختلف ضروریات کو پورا کرنے والی ہوگی۔ اس طرح انجینیر، ماہرین زراعت، میکانکس، ڈاکٹر اور دیگر قسم کے علوم وفنون میں مہارت رکھنے والے لوگوں کی خدمات

کرنی پڑیں گی۔

تعلیم کو عام کرنے کے لیے تحتانی اور وسطانی تعلیم کو مفت اور جبری کرنا پڑے گا۔

تعلیم کے اثرات کو پائیدار بنانے کے لیے صرف جبری تعلیم کافی نہیں۔ کیونکہ چھوٹے بچوں میں اتنی پختگی نہیں ہوتی کہ وہ تعلیم کے اثرات کو باقی رکھ سکیں، اس لیے ماحول کو علم کے لیے سازگار بنانے کے لیے تعلیم بالغان بھی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ سماجی اور تہذیبی ترقی کے لیے مختلف کلب اور اسی قسم کے ادارے قائم کرنے پڑیں گے جہاں ریڈیو، کھیل کی سہولتیں، چمن وغیرہ کا انتظام کیا جائے گا۔

ان تمام کاروبار کے لیے بغیر کسی منفعت اور معاوضہ کے خیال کے مصارف برداشت کرنے پڑیں گے جس کا اندازہ یہ ہے کہ وہ (۳۰و۱۰) کروڑ ہوں گے۔

ہمارے ملک میں دوسرے مسائل کی طرح امکنہ کا مسئلہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ گھروں کا ماحول نہ صرف صحت کے لیے مضرت رساں ہوتا ہے بلکہ زندگی سے متعلق کوئی خوش گوار تخیل بھی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اکثر حیوان اور انسان دونوں ایک ہی چھت کے نیچے زندگی گذارتے ہیں۔ زندگی کی اس تیسری اہم ضرورت کی ترقی کے لیے شہر و دیہات میں مجموعی طور پر (۵۰و۳۱) کروڑ روپے صرف کرنے پڑیں گے۔

اس طرح زراعت، صنعت، حمل و نقل، صحت، تعلیم اور تعمیر امکنہ پر مجموعی طور پر (۰۰و۵۰و۱) کروڑ روپے کے مصارف ہوں گے۔

یہ تو مصارف ہیں جو باشندگان ملک کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے برداشت کرنے پڑیں گے۔ ان مقاصد کے حصول سے منصوبہ کی

بنیادیں مستحکم ہوں گی۔ ملک کو دنیا کے دوسرے ممالک کے صف اول میں لانے کے لیے اس کے بعد اور منصوبے بنانے پڑیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے سرمایہ کہاں سے فراہم ہوگا؟

سرمایہ کی فراہمی کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ ابتدائی دور میں تو حکومت کو مصارف برداشت کرنے پڑیں گے۔ زراعت چونکہ اس ملک کا بنیادی پیشہ ہے اس لیے ابتدائی تین سال تک اس پر زیادہ توجہ دینی پڑے گی۔ اس کے بعد کے پانچ سالہ دور میں صنعتی ترقی کی کوشش کی جائے گی۔ ابتدائی تین سال تک تو یقیناً حکومت کو بار برداشت کرنا پڑے گا، لیکن آگے چل کر زراعت اور صنعت وحرفت اور ذرائع حمل ونقل وغیرہ سے حکومت کو آمدنی ہونے لگے گی، اور چونکہ سرمایہ واریت پر کافی روک تھام عائد کی جائے گی اس لیے حکومت کو مشغول کرنے کے لیے کافی رقم ان مختلف ذرائع سے حاصل ہونے لگے گی۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کے بالواسطہ بلاواسطہ محاصل سے بھی حکومت کو آمدنی ہوگی اور معاشی ترقی کے ساتھ لوگوں کی محاصل ادا کرنے کی استطاعت بھی بڑھتی جائے گی۔ علاوہ ازیں انگلستان میں جمع شدہ اسٹرلنگ سے بھی اس سلسلہ میں کافی رقم حاصل کی جاسکے گی۔ اس طرح ان اخراجات کی بالآخر پابجائی ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔

یہاں تک تو اس منصوبہ کا خلاصہ پیش کیا گیا، اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ جہاں تک ہوسکے اعداد وشمار سے کم ازکم بحث کی جائے، کیونکہ یہ اعداد کسی خاص تحقیق کی بنیاد پر مبنی نہیں ہیں بلکہ محض تخمینے ہیں۔ خود ہندوستان کے سرکاری اعداد وشمار قابل بھروسہ نہیں۔ ٹھیک اندازوں کے لیے منصوبہ کی تکمیل کے ابتدائی مراحل ہی میں باقاعدہ

تحقیقات کے ذریعہ صحیح تخمینے تیار کر لینا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں روس، جرمنی اور دیگر ممالک کے تجربات سے ضرور استفادہ کرنا چاہیئے۔

اس منصوبے میں برخلاف بمبئی کے منصوبہ کے زراعت پر زیادہ زور دیا گیا ہے، اور ہندوستان جیسے زرعی ملک میں اسی پیشہ کی ترقی ہر منصوبہ کا اولین مقصد ہونا چاہیئے۔ زراعت ملک کی تین چوتھائی آبادی کا پیشہ ہے اور اس کی ترقی اور اصلاح کے معنی تین چوتھائی ملک کی اصلاح کے ہیں۔ یہ پیشہ اس لیے بھی توجہ کا محتاج ہے کہ یہ ملک کے اہم ترین پیشوں میں سے ہونے کے باوجود پست ترین پیشہ ہے۔ زرعی مزدور اپنی غربت میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ وہ زمینداروں اور ساہوکاروں کے ہاتھوں میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے نہ کوئی اس کی اصلاح کرتا ہے اور نہ وہ خود اپنی آپ اصلاح کر سکتا ہے۔ صدیوں کی غربت اور جہل کے باعث اس کو اپنی تکالیف کا احساس رہا نہیں ہے، وہ اس کو بالکل قدرتی سمجھتا ہے اور اپنی اس پست تقدیر پر قانع رہنے پر مجبور ہے۔ جیسا کہ اس کے متعلق مشہور ہے کہ "وہ مقروض پیدا ہوتا ہے، مقروض جیتا ہے اور مقروض مرتا ہے، اور مرتے ہوئے قرض کا بار اپنے پسماندگان کے لیے چھوڑ جاتا ہے" وہ ان تکالیف کو تکالیف نہیں بلکہ مقدر سمجھتا ہے۔ تقدیر کا یہ غلط تصور جب تک نہ بدلا جائے اور کی روح ان میں نہ پھونکی جائے اس وقت تک یہ طبقہ اصلاح پذیر نہیں ہو سکتا۔ کوئی عجب نہیں کہ جبر نہ استعمال کرنے کی صورت میں اس طبقہ کے یہی جاہلانہ خیالات منصوبہ کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جائیں۔

اس لیے یہ ضروری ہے کہ زراعت کی اصلاح و ترقی کے ساتھ ساتھ تعلیم کی مہم کا بھی جلد آغاز کر دیا جائے۔ منصوبہ میں تحتانی و وسطانی تعلیم کو جبری اور مفت بنانے کی تجویز تو ٹھیک طور پر پیش کی گئی لیکن ایک اہم مسئلہ بالکل بھلا دیا گیا ہے۔ یعنے تعلیم کا کوئی نظام نہیں پیش کیا گیا۔ جرمنی اور روس وغیرہ نے تو اپنے نظام تیار کئے اور ان کی قوموں کو اس سے فائدہ بھی ہوا، لیکن یہاں کوئی خاص نظام نہیں ہے۔ انگریزی نظام یا مغربی نظام جو موجودہ زمانہ میں چل رہا ہے وہ بہت کچھ ادبی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور شاید ایک مبسوط اسکیم کے لیے جیسی کہ منصوبہ میں پیش کی گئی ہے یہ نظام ملک کے لیے مفید ثابت نہ ہو۔ اس کے علادہ تعلیم علاوہ دماغی صلاحیتوں کو ابھارنے کے سیاسی، معاشی یا معاشری مقاصد کو حاصل کرنے کا بھی ایک ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس منصوبہ میں نہ ملک و قوم کے آگے کوئی ایک مقصد رکھا گیا ہے اور نہ اس کے لیے ظاہر ہے تعلیم دی جا سکتی ہے۔

صنعتی ترقی کو منصوبہ میں جو مقام دیا گیا ہے وہ بہت مناسب ہے۔ نہ منصوبۂ بمبئی کی طرح اس کی سرمایہ دارانہ تائید کی گئی ہے اور نہ گاندھی منصوبہ کی طرح اسے پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ سرمایہ دارانہ طریقوں پر صنعتی ترقی سے قومی آمدنی میں تو یقیناً غیر معمولی اضافہ ہو جائے گا لیکن فی کس آمدنی مالدار طبقات کی اور خصوصاً آجروں کی بڑھے گی، جبکہ دوسرے طبقات کو اپنی جگہ "قانع" ہی رہنا پڑے گا۔ اس منصوبے میں ان پر جو قیود عائد کرنے کی تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ بالکل مناسب ہیں۔ اس سے صارفین کو بھی فائدہ پہنچے گا اور حکومت کو بھی شغل کے لیے کافی سرمایہ مل جائے گا۔

صنعتی ترقی اور مشنری کی مخالفت جو عام طور پر گاندھی جی اور ان کے پیروؤں کی طرف سے کی جاتی ہے وہ اس زمانہ میں جبکہ مشینری چل پڑی اور پیدائش کے طریقے بدل چکے، بالکل بے سود ہے۔ نہ ان ایجاد شدہ مشنری کو پھر تباہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اختراع شدہ طریقوں کو بھلایا جا سکتا ہے۔ اگر ہندوستان ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو اس مسابقت اور گلوتراش مقابلہ کے دور میں اس کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا اور لوگوں کو راہبانہ کہنی زندگی گذارنی پڑے گی جس کے لیے یقین ہے کہ ہندوستانیوں کی اکثریت تیار نہیں ہے۔ لہذا ایسا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیئے جو دو انتہاؤں کے بین بین ہو۔ اس کے لیے یہ ہو سکتا ہے کہ مجنونانہ صنعت پرستی اور مسابقت پر روک تھام قائم کی جائے اور صنعت کے اصلی مقصد یعنے استعمال کے لیے اشیا کی پیدائش کی جائے۔ اس منصوبہ میں اس کے لیے درمیانی راستہ اختیار کر کے ٹھیک تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ کلیدی صنعتوں اور اشیائے صرف کی صنعتوں کو اولیت دینے کی تجویز بھی منصوبہ بندی کے مقاصد کے اعتبار سے بالکل ٹھیک ہے۔

ذرائع حمل و نقل اور وسائل رسل و رسائل کی ترقی معاشی ترقی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کی طلب کو روکا جائے تو معاشی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور اس کی تعمیل کی جائے تو گرم بازاری کے پیدا ہونے میں سہولت کا باعث ہوتی ہے۔ زرعی اور صنعتی ترقی کے بعد جب آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا اور شغل کے لیے اصل کی تھوڑی بہت مقدار مہیا ہونے لگے گی تو اس طرف باضابطہ توجہ کی جا سکتی ہے۔

صحت کا مسئلہ ملک کے اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے۔ یہاں کی شرح اموات بہت بلند ہے۔ مختلف وباؤں ... امراض ... کا ... اموات

زچاؤں اور بچوں کی ہوتی ہیں۔ صحت کی خرابی علاوہ اتلاف جان کے کارکردگی کی خرابی کا بھی بہت بڑا سبب بنی ہوئی ہے۔ لیکن کسی نے یہ خوب کہا ہے کہ اس ملک میں جانیں سستی ہیں کونین مہنگی ہے۔ دیہاتوں اور قصبات کی ایک خاص تعداد کے لیے ایک دواخانہ ہونا انتہائی ضروریات میں سے ایک ہے۔ ان کے علاوہ خاص امراض کے دواخانے خاص خاص مقامات پر بڑے پیمانے پر قائم کئے جائیں۔ اسی طرح اطفال کی شرح اموات کو گھٹانے کے لیے زچگی خانوں کا قیام اور ان سے زیادہ ضروری پرانی دایاؤں کی تربیت ہے۔ زچگی خانوں کے مصارف عوام سے برداشت نہیں ہوسکتے اور ان کے لیے اتنے بڑے پیمانہ پر انتظامات کرنا بھی بہت مصارف طلب ہے۔ دایاؤں کی معقول تربیت سے بھی ایک حد تک یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ان اہم ضروریات کے ساتھ امکنہ کی تعمیر کو بھی منصوبہ میں بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے گندہ مکانات اور بستیوں کو دیکھتے ہوئے ان کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے لیکن منصوبہ میں اس کو کافی اہمیت دیدی گئی ہے۔ منصوبہ کی تکمیل کے لیے مصارف کا سوال بہت ہی اہم سوال ہے اور امکنہ کی تعمیر کو غیر پیدا آور رکھا جائے تو یہ مسئلہ اور بھی بھاری بار بن جائے گا۔ گو تعلیم بھی مادی طور پر غیر پیدا آور ہے لیکن اس کی حیثیت بنیادی ہے۔ اگرچہ مکان کو ضروریات زندگی میں تیسرا درجہ حاصل ہے لیکن ان کو ہندوستان میں اتنی زیادہ اہمیت اس لیے حاصل نہیں کہ یہ قول کسی کے ہمارا ملک گرم اگرم تر [illegible] گرم ترین موسمیں رکھتا ہے جس کی وجہ سے مزدوروں کے اوقات زیادہ تر مکانات سے باہر یا گھر کے صحن میں گزرتے ہیں۔ [illegible] مکان تازہ ہوا [illegible]

صحت کی نگہبانی کرسکتی ہے۔ یہ بتلانے سے یہ مقصد نہیں کہ ان کی طرف توجہ نہ دی جائے بلکہ یہ مقصد ہے کہ ان کو منصوبہ کے آخری حصہ میں شروع کیا جانا چاہیئے، جبکہ منصوبہ کافی حد تک خودمکتفی ہو جائے اس وقت تک لوگوں کی مالی حالت بھی درست ہو جاتی ہے اور ان سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ بھی ان کے صحت بخش مکانات کی تعمیر میں کچھ مصارف برداشت کریں۔ جب حکومت اتنی سہولتوں کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری لے تو اس کو حق بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ باشندوں کو اس بات پر مجبور کرے کہ وہ بستی کی صفائی اور حفظان صحت کا پورا پورا خیال کریں۔

منصوبہ میں ضروری احتیاجات کی تکمیل پر تو کافی توجہ دی گئی ہے لیکن اس انہماک میں بعض حقائق کو بھلا دیا گیا ہے۔ مثلاً آبادی کا مسئلہ جو روز بہ روز اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے اس کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ صرف ایک دو جگہ ضبط تولید کو اس کا حل بتلا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ضبط تولید اس کا کوئی معقول حل ابھی تک تسلیم نہیں کیا گیا۔ پہلے تو مانع حمل ادویہ کا استعمال ابھی تک خود مغربی ممالک میں پوری طور پر موثر ثابت نہیں ہوا۔ دوسرے یہ کہ ان سے دوسرے مضر اثرات کا اندیشہ رہتا ہے۔ ان کا استعمال کافی تعلیم و تربیت چاہتا ہے ہندوستان جیسے ان پڑھ اور جاہل ملک میں، خواہ کتنا ہی تعلیم کو عام کیا جائے، ٹھیک اور صحیح طریقہ پر ان کا استعمال مشکل ہے، ان ادویہ کی کافی قیمتیں ہوتی ہیں۔ ان کی عوام میں مفت تقسیم مصارف کے مد میں کافی زیادتی کا باعث ہوگی۔ علاوہ ازیں پدری و مادری تمنائیں نہیں معلوم اس میں کس قدر حائل ہوں گی۔ پھر مذہبی تعلیمات سے بھی مقابلہ کرنا پڑے گا اور یہ آخری مقابلہ سب سے زیادہ سخت اور فیصلہ کن جنگ ثابت ہوگا

اور یقین ہے کہ ملک کے ہندو اور مسلمان اس کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر کے مانع حمل گولیوں کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں گے اور بالآخر مذہب کی جئے پکاری جائے گی۔ ایسی صورت میں ہر سال پچاس لاکھ یا ہر مہینہ چار لاکھ افراد کے لیے روزگار فراہم کرنا پڑے گا جو ظاہر ہے بہت مشکل مسئلہ ہے۔ بہ قول شخصے ہندوستان ہر دسویں سال ایک برطانیہ پیدا کر لیتا ہے۔ اگر صرف اس اضافہ شدہ آبادی ہی کو صنعتوں میں مشغول کیا جا سکے تو ہندوستان میں غیر معمولی صنعتی ترقی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس وقت تو مسئلہ موجودہ آبادی ہی کو بہتر ذرائع روزگار میں لگانا ہے۔ مشنری کا بڑھتا ہوا استعمال اور صنعتوں کی عقلی تنظیم مستقبل قریب میں تو نہیں لیکن پندرہ بیس سال ہی کے اندر کم روزگاری اور بے روزگاری کے مسائل پیدا کر دے گی، اور آبادی کا متوالی اضافہ اس مسئلہ کو اور بھی پریشان کن بنا دے گا۔ اس لیے ابھی سے اس پر جائز قسم کی تحدیدات قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے شادی بیاہ کے موجودہ تخیلات اور رسم و رواج کے بھی خلاف مہمیں جاری کرنی پڑیں گی، اور ملک ہی میں آبادی کی ساری تقسیم کے مختلف طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔ کیونکہ بیرون ملک آبادی کی نقل و حرکت یا توطن خارجی پر سخت بین الاقوامی قوانین قیود بنے ہوئے ہیں۔ جنگ تو اس کے لیے لڑی گئی لیکن امن نے بھی اس اہم مسئلہ کا ابھی تک تصفیہ نہیں کیا۔ منصوبہ میں ملک کے اس اہم مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر کچھ بھی روشنی نہیں ڈالی گئی۔

ایک آزاد ملک کے اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ بیرونی حملوں سے مدافعت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ آزادی تو اس منصوبہ میں مضمر ہے لیکن مدافعت کے مسئلہ کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۵۰ء کے حالات سنہ ۱۹۲۰ء سے مختلف رہیں گے اور ہندوستان کو جمہوریتوں کی فتح کی وجہ سے دشمن کی طرف

بیرونی حملوں کا اندیشہ کئی سال تک نہیں رہے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ ہندوستان کے حالات ۱۹۱۷ء کے روس سے بہت کچھ مختلف ہیں، لیکن جمہوریتوں پر اس قدر اعتماد کر لینا صرف زود اعتقادی کہا جا سکتا ہے۔ جب تک قومیت کے شدید تخیلات موجود رہیں اس وقت تک جمہوریت کا تخیل بین الاقوامی مسائل میں اصل معنوں میں جمہوریت نہیں کہلایا جا سکتا۔ انگریزی یا دیگر جمہوریت انگلستان میں تو یقیناً جمہوریت ہے، لیکن ہندوستان کے لیے بھی اس پاکیزہ تخیل کا اسی طرح برقرار رہنا کوئی ضروری نہیں۔ مشہور ہے کہ انگلستان کے انقلاب پسند جب ہندوستان آجاتے ہیں تو رجعت پسند بن جاتے ہیں۔ انگلستان کے سابق وزیر اعظم نے کھلے طور پر اعلان کیا تھا کہ میں پہلا وزیر اعظم بننا نہیں چاہتا جس کے عہد وزارت میں برطانوی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے اور عمالی وزارت آزادی اور جمہوریت کے قیام کے سلسلہ میں ابھی تک کچھ زیادہ امید افزا ثابت نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ کیا ضروری ہے کہ جمہوریتوں ہی کی طرف سے حملے ہوں یا مغربی ممالک ہی حملہ آور ہوں۔ کمزور پڑوسی کو دیکھ کر کسی کا بھی جی چاہے گا کہ گھر میں گھس جائے اور ہو سکے تو قبضہ کر بیٹھے۔ اس لیے مدافعانہ کارروائیوں کے لیے تو ہر آن کسی ملک کو تیار رہنا چاہیئے ورنہ آزادی کمزور ہو کر رہ جائے گی۔ ہندوستان جیسے طویل ساحلی اور بری سرحدیں رکھنے والے ملک کے لیے تو مدافعت پر کافی مصارف برداشت کرنے پڑیں گے اور یہ سب مصارف غیر پیدا آور ہوں گے۔ ہمارے عدم تشدد کے تخیلات اور ہمارا صلح کل مسلک کتنا ہی اچھا اور پیغمبرانہ ہو لیکن اس کے باوجود بھی ہم کو یہ سب مصارف برداشت

کرنے پڑیں گے۔ اس سلسلہ میں ڈنمارک وغیرہ سے ہم کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

یہ تخیل جو منصوبہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مستقبل قریب میں تو کسی حملہ کا اندیشہ نہیں، اور اگر پیدا ہو جائے تو بہت جلد تیاری کی جا سکتی ہے، کچھ دُور اندیشانہ تخیل نہیں ہے۔ جنگ کے ابتدائی دور کی انگلستان کی پریشانیاں جو خود بعض صاف گو انگریزوں کے بیانات کے مطابق آزادی کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھیں، ہمارے لیے کافی سبق آموز ہو سکتی ہیں۔

اس منصوبہ کو چلانے کے لیے سرمایہ کی فراہمی کے لیے جو ذرائع آمدنی بتلائے گئے ہیں، اگر انھی کے ذریعہ تکمیل ہو سکے تو یہ بہت بہتر ہوگا، لیکن زراعت وصنعت سے آمدنی کے انتظار میں بیٹھنے سے منصوبہ کی تیز تر تکمیل میں یقیناً رکاوٹ ہوگی۔ ذرائع آمدنی میں دوسرے منصوبوں کی طرح محاصل وغیرہ کو رکھا گیا ہے، لیکن اندرونی و بیرونی قرضہ کا کہیں ذکر نہیں، حالانکہ ابتدائی اخراجات کے لیے شاید اسی کو ذریعہ بنانا پڑے گا۔ منصوبہ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ چونکہ صنعتی وزرعی ترقی کے کام طویل المدت قرضے چاہتے ہیں اور لوگوں سے اتنے انتظار کی توقع نہیں کی جا سکتی، اس لیے سب بار حکومت کو برداشت کرنا پڑے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قرضے طویل المدت ہوں اور منافع پر تحدیدات عائد کی جائیں تو پھر سرمایہ کہاں سے فراہم ہوگا۔ اندرون ملک قرضہ نہ مل سکے تو بیرون ملک سے ابتدائی منازل طے کرنے کے لیے قرضہ حاصل کرنا ہی پڑے گا، خواہ وہ اشتراکی خیالات کے کتنا ہی منافی ہو۔ منافع بازی پر قیود سے حکومت کو مستقبل میں کافی قابل شغل سرمایہ کی امید ہو سکتی ہے، لیکن ابتدائی منازل میں یہی قیود قرضہ کی فراہمی میں رکاوٹ ثابت ہوں گے۔

[illegible] دوسرے مدات آمدنی تو سب ٹھیک ہیں لیکن اسٹرلنگ محفوظ [illegible]

ملنے کی کم توقع ہے۔ ابھی سے ان کو کم کرنے یا بالکل ختم کر دینے کے مشورے ہو رہے ہیں، اور جب تک انگلستان کا ہندوستان پر سیاسی تفوق رہے گا اس قسم کے خدشات بے بنیاد نہیں ہو سکتے۔ پہلے تو ان کو مطالبات وطن وغیرہ کی ادائی کے بہانہ روکا جائے گا اور کچھ ادا بھی کیا جائے زر کی شکل میں نہ ہوگا بلکہ مصنوعات کی شکل میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس طریقہ سے ادائی ہو تو پھر ان سے سرمایہ کے فراہمی کی توقع رکھنا بے جا ہے۔

یہاں تک تو صرف معاشی مسائل کا تذکرہ و تبصرہ رہا، لیکن منصوبہ بالکلیہ معاشی منصوبہ نہیں، اور نہ منصوبے کا ایسا ہونا کوئی ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف عمرانی علوم ایک دوسرے سے اتنا قریبی اور گہرا تعلق رکھتے ہیں کہ علحدہ علحدہ ان کے مسائل کو تشفی بخش طریقے پر حل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان میں بھی سیاسیات اور معاشیات کو خاص خصوصیت حاصل ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں تو سیاسیات کو اب بھی معاشیات پر تفوق حاصل ہے لیکن اشتراکیت میں تو معاشیات کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال کوئی نظام ہو، ان دونوں علوم کا تعلق بہت گہرا ہے۔

اس منصوبے کے پیش کرنے والے حضرات تو نمایاں طور پر اشتراکی ہیں، لیکن انھوں نے اپنے منصوبے میں کہیں بھی یہ کہنے کی جرات نہیں کی کہ ان کا مقصد ملک میں اشتراکی نظام قائم کرنا ہے۔ شاید رائے عامہ کے خوف سے ایسا کیا گیا ہے۔

منصوبے میں حکومت کی ہئیت ترکیبی بدلنے پر زور بھی دیا گیا او چند تجاویز بھی پیش کی گئیں، لیکن جو پیش کردہ نظام حکومت ہے اس میں اور عام سرمایہ دارانہ جمہوری نظام میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ ان کی سیاسی تجاویز قبول بھی کرلی جائیں تو کوئی نیا نظام حکومت ملک ...

قائم نہیں ہوگا۔ لیکن دوسری معاشی تجاویز میں بہت سی باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو بالکل اشتراکی ہیں۔ مثلاً زمینات کا حکومت کی ملکیت میں لے لینا، حکومت کی طرف سے بڑے بڑے مشترکہ کاشت کے مزروعہ جات قائم کرنا، صنعتوں کا حکومت ہی کے سرمایہ سے قائم کرنا، اور جو صنعتیں پہلے ہی سے ذاتی سرمایہ سے چل رہی ہیں ان پر سخت نگرانی رکھنا اور اسی طرح شغل اصل پر بندشیں، تجارت خارجہ پر سخت قیود اور قیمتوں اور تجارت پر حکومت کی غیر معمولی نگرانی، یہ سب ایسی تجاویز ہیں جو بالکل اشتراکی کہلائی جاسکتی ہیں۔ ان معاشی تجاویز پر اسی وقت عمل ہوسکتا ہے جبکہ سیاسی نظام بھی اشتراکی ہو، ورنہ عوام کی طرف سے عوام کے لیے عوام کی حکومت کے بغیر قومی دولت کا حکومت کی ملک بنانا بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ جب تک کہ حکومت کا کوئی خاص نصب العین نہ ہو عوام کو اس سے کوئی خاص دلچسپی اور ہمدردی نہیں ہوسکتی، نا ہی خود حکومت پوری طور پر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرسکتی ہے۔ اس لیے کھلے طور پر اس کا اعلان ہونا چاہیئے کہ کس قسم کی حکومت قائم کرنا مقصود ہے۔

اشتراکی طرز کی حکومت یا اشتراکیت سے کسی کو بے وجہ بیر ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اشتراکیت کے بعض اصول اچھے ہیں اور ان کو یقیناً ملک میں رائج ہونا چاہیئے، لیکن روسی اشتراکیت کی اندھا دھند تقلید، جس میں ہندوستان بہت قدیم سے بدنام ہے، کوئی ٹھیک طریق کار نہیں، اور نہ یہ کوئی ٹھیک تخیل ہے کہ مارکس کی اشتراکیت کو ایک مسلک و مذہب کے طور پر قبول کر لیا جائے۔ مارکس نے دنیا کے تخیلات کو ایک خاص راستے پر لگایا ہے اور خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول پر

ہم کو بھی اس سے استفادہ کرنا چاہیئے ۔لیکن مارکس یا اینگل کی پیروی
یا ان کے بتلائے ہوئے اصولوں کا ہر جگہ من وعن اطلاق کسی طرح
قرین مصلحت نہیں سمجھا جا سکتا ۔ خود روس میں جہاں سب سے پہلے ان
اصولوں کو باضابطہ طور پر عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی تلخ تجربوں
کے بعد کافی ترمیم کرنی پڑی ، اور آج کل جو نظام وہاں غلطیوں اور
تجربوں کے بعد قائم ہو سکا بہ قول مؤمسانی صاحب نہ اشتراکی نظام
ہے اور نہ سرمایہ دارانہ نظام ، بلکہ ایک مینجروں کا نظام
ہے ۔

ہندوستان کا ماحول تو روس سے اور بھی مختلف ہے ۔
خواہ ہندوستان کے لوگ سختی سے مذہب کے پیرو ہوں یا نہ ہوں ،
لیکن ہندوستان کے عام ماحول کو ایک لفظ میں اب بھی مذہبی
ماحول کہا جا سکتا ہے ۔ اس ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور ملک کی
پست تعلیمی حالت اور معاشری پستی کے مد نظر یہاں ایسا نظام قائم
ہونا چاہیئے جو مذہب سے بھی قریبی تعلق رکھنے والا بھی ہو اور بے جا
قدیم رسم و رواج کی اصلاح کرنے والا بھی ۔ کیونکہ اگر آزادی بھی
حاصل ہو جائے اور جمہوریت کا قیام بھی عمل میں آ جائے تو پھر بھی
ملک میں کئی ایسے طبقات نظر آئیں گے جو باوجود سیاسی آزادی
کے ، سماجی غلامی میں جکڑے ہوئے ہوں گے ۔ زراعت کے سلسلہ میں
کاشتکاروں کو ساہوکاروں اور زمینداروں کے پنجوں سے
نکالنے کی تجویز بہترین ہے ، کیونکہ یہ غلامی سیاسی غلامی سے بھی
بدتر قسم کی غلامی ہے ۔ اس لیے سیاسی اور معاشی منصوبے کے ساتھ
باضابطہ معاشری منصوبہ ہونا بھی ضروری ہے ۔ ہندوستان میں

اس مسئلہ کی اہمیت کسی اور مسئلہ سے کسی طرح کم نہیں ۔

بہرحال یہ منصوبہ مجموعی طور پر قابل عمل اور ملک کے عوام کے لیے بہت مفید ہے ۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں اعتدال سے کام لیا گیا ہے اور محض تخیلات سے بچنے کی کوشش بھی کی گئی ہے ۔

تعمیرِ امن

از

جناب محمد تاج الدین صاحب، متعلم ام، اے (عثمانیہ)

۱۹۴۴ء نہ صرف عظیم الشان جنگی کارروائیوں کے لیے ممتاز ہے، بلکہ یہ اُن کانفرنسوں کی وجہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے جو اقوام متحدہ نے عالمی ملت کی داغ بیل ڈالنے کی خاطر فلاڈلفیا، برٹن ڈوس، شکاگو، اور ڈمبارٹن اوکس میں منعقد کی تھیں۔

منشور فلاڈلفیا:

روما کی طرف پیش قدمی شروع ہو چکی تھی اور فرانس میں اتحادی افواج کے اُترنے کے لیے ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا کہ انٹرنیشنل کانفرنس

اپنا سالانہ اجلاس ختم کیا۔ کانفرنس میں شرکت کرنے والے مندوبین نے (جو دنیا کی اکتالیس اقوام کے آجروں، مزدوروں اور حکومتوں کی نمایندگی کر رہے تھے) حسب ذیل معاشرتی مقاصد کو منظور کیا جنھیں مجموعی طور پر "منشور فلاڈلفیا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے:-

۱۔ ان تمام افراد کے لیے، جو کام کرنا چاہتے ہیں، ہر ایک پیشہ میں حفظ صحت کے انتظام کے ساتھ معقول اجرتوں اور اور مناسب شرائط کے تحت مفید اور معین روزگار کے مواقع بہم پہنچایا جائے۔

۲۔ مناسب و معقول غذا، رہایش، طبی امداد اور تقسیم کے مواقع بہم پہنچانے کے لیے معیار زندگی بلند کیا جائے۔

۳۔ اقل شرح اجرت کا تعین کر دیا جائے تاکہ اُن مزدوروں کے استحصال کی روک تھام ہو سکے جنھوں نے مجبوراً کم اُجرت قبول کر لی ہے۔

۴۔ بہبودئی اطفال کا انتظام کیا جائے۔

۵۔ وہ تمام افراد جن کا سلسلۂ روز، بیماری یا گزند، بڑھاپے یا حصولِ روزگار کے مواقع کے فقدان کے باعث منقطع ہو جاتا ہے، اُن کے لیے مستقل آمدنی کی صورت نکالی جائے۔

۶۔ آزادی اتحاد اور اجتماعی معاملت کے حق کو مؤثر طور پر تسلیم کرایا جائے۔

۷۔ مزدوروں کی تربیت اور منتقلی کا انتظام کیا جائے۔

یہ اعلان ایک ایسی صداقت کا سیدھے سادے اور واضح لفظوں میں اظہار کرتا ہے جسے مباحث تنظیم مابعد جنگ کے سلسلے میں ماہرین معاشیات و

تجارت خارجہ، سیاست کار و مدبرین، صحافت نگار اور اہل علم نے کسی نہ کسی شکل میں تسلیم کر لیا ہے۔ اعلان سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ :-

"کسی ایک جگہ بھی افلاس ہو تو یہ ہر جگہ کی خوش حالی کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔"

تجاویز برٹن ووڈس :

چوالیس اقوام کے مندوبین نے "بین الاقوامی زر اور مالیاتی کانفرنس" میں ایسی تجاویز مرتب کی ہیں جن کی نظیر بین الاقوامی معاشی تعلقات کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ان کا مقصد دنیا میں امن اور خوشحالی کو ترقی دینا اور اقوام کو باہمی کاروبار کی سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔ کانفرنس کا اجلاس یکم جولائی ۱۹۴۴ء سے ۲۲ جولائی ۱۹۴۴ء تک شمال مشرقی نیو ہمپ شائر میں برٹن ووڈس کے مقام پر ہوا۔ مبادلات خارجہ کو جدید بنیادوں پر قائم کرنے اور بین الاقوامی تعمیر اور ترقی کے لیے ایک "بین الاقوامی بنک" قائم کرنے کی تجویز کی گئی اور بنک کے لیے ایک "بین الاقوامی ذخیرۂ زر" کی سفارش کی گئی۔

یہ فنڈ جو کہ تجارت خارجہ کے فنی مسائل زر کو حل کرنے والے ادارے کی حیثیت سے قائم کیا گیا ہے ایک ایسی مرکزی ایجنسی کا کام دے گا جہاں ایک قوم کے زر کا تبادلہ کسی دوسری قوم کے زر سے مناسب شرح پر ہوگا۔ اپنے فرائض کامیابی سے انجام دینے کے لیے اس کے پاس (۸،۸۰۰،۰۰۰) ڈالر کا ذخیرہ ہوگا جسے اس میں حصہ لینے والی

اقوام ادا کریں گی ۔ اُن اقوام کے علاوہ جن کی نمایندگی کانفرنس میں کی گئی تھی دوسری اقوام کو بھی رُکنیت کی اجازت ہوگی اور تمام ارکان فنڈ کے انتظام میں شریک رہیں گے ۔

بنک اس غرض سے قایم کیا گیا ہے کہ دوران جنگ میں جو دولت کے تباہ ہوگئی ہے اُسے پھر سے بحال کرنے کے لیے اصل فراہم کرے اور پست صنعتی ممالک کو اپنے وسایل سے پوری طرح مستفید ہونے کے لیے سرمایہ بہم پہنچائے ۔ علاوہ بریں بنک انفرادی قرضوں کی ضمانت دے کر یا اُن کی فراہمی کا انتظام کرکے تجارتِ خارجہ میں انفرادی شغل اصل کو ترقی دے گا ۔ دوسرے ذرایع سے جاری شدہ قرضوں کے مقابلہ میں اپنے جاری کردہ یا اپنی کفالت کے قرضوں کا انتظام کرے گا ، اور جنگ کی معیشت کو بتدریج امن کی معیشت میں تبدیل کرنے میں مدد دے گا ۔

بنک کا جاری شدہ سرمایہ (۹۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰) ڈالر ہے جو مناسب شرایط پر طویل المدت قرضوں کی اجرائی یا اُن کی کفالت کے لیے حاصل ہوسکے گا ۔ بنک کے منیجر جو رُکنیت رکھنے والی تمام اقوام کے نمایندوں پر مشتمل ہوں گے ایسے ممالک کی ضروریات کا بطور خاص لحاظ رکھیں گے جنھیں دشمن کے قبضہ یا مخاصمانہ کارروائیوں کی وجہ سے نقصان اُٹھانا پڑا ہے ۔ اقوام مندرجہ منشور کے علاوہ دوسری قوموں کو بھی بنک نیز فنڈ کی رُکنیت کی اجازت ہوگی ۔

اس کانفرنس نے جس کی صدارت ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے وزیر خزانہ ہنری مارگن تھو نے کی تھی اس کی ضرورت کو تسلیم کیا کہ عالمی معیشت کے جملہ پہلوؤں پر بین الاقوامی مباحثے جاری رکھے جائیں ۔ مندوبین کانفرنس کی منظور کردہ تحریکات پر غور و خوض کرنے کے لیے

انھیں ان ممالک کی حکومتوں اور عوام کے سامنے پیش کیا گیا ہے جن کی کانفرنس میں نیابت کی گئی تھی ۔

بین الاقوامی تجارت اور مالیات جس کا شیرازہ زمانۂ جنگ میں مادی وسایل اور اعتباری سہولتوں کی تباہی کے باعث بکھر چکا تھا اس کی شیرازہ بندی کی ضرورت پر برٹن وڈس کے اجلاس نے اپنی توجہ مرکوز کی ہے ۔

جنگ کے ہاتھوں تباہ شدہ دُنیا میں از سرِ نو تنظیم قایم کرنے کا جو مہتم بالشان مسئلہ درپیش ہے اس کے نظری حل یہ بنک اور فنڈ پیش کرتے ہیں ۔ جملہ ارکان ممالک کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنی معیشت کو زیادہ عرصہ تک کامیابی سے چلانے کے لیے اپنی اندرونی معیشت کو منظم بنیادوں پر قایم کریں محض ایک "بین الاقوامی استحکامی ذخیرہ" کے قیام سے دُنیا کی تمام "کرسیاں" خود بخود مستحکم نہیں ہوسکتیں ۔ فنڈ کا مقصد صرف یہ ہے کہ باہمی اعتماد کی فضا پیدا کی جائے اور ایک ایسے مرکز کا کام دے جہاں مختلف ممالک کے ماہرین بین الاقوامی مسایل زر کا بلا تعصب مطالعہ کرسکیں اور جو موقتی مالی دشواریوں پر قابو پانے کے لیے مبادلات خارجہ کی سہولتیں بہم پہنچائے ۔ اگر فی الحقیقت عالمی مالیات کا استحکام مقصود ہے تو برٹن وڈس اس کا مکمل حل نہیں ہے ، بلکہ محض ایک ذریعہ ہے ۔

اجتماعی تحفظ اور انفرادی تحفظ ۔

آزادئ پیرس ، آزادئ خلا رنس اور ڈمبرٹن اوکس کی "عالمی تحفظ امن کی کانفرنس" کی افتتاح کے باعث ماہ اگست ۱۹۴۴ء کو نمایاں

حیثیت حاصل ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ سلطنت متحدہ برطانیہ، اتحاد روس اور چین کی حکومتوں نے ڈمبرٹن اوکس کے مباحث کو پیش نظر رکھ کر دُنیا کے سامنے "متحدہ اقوام" کے "عالمی تحفظی ادارے" کا ایک خاکہ پیش کیا جو دُنیا کی تمام امن پسند اقوام پر مشتمل ہوگا اور اس اصول پر مبنی ہوگا کہ:۔

"سب اقوام کی حفاظت کے بغیر ایک قوم کی حفاظت نہیں ہوسکتی۔"

مختصر یہ کہ تجاویز ڈمبرٹن اوکس کی رو سے ایک ایسے ادارہ کے قیام کی اسکیم پیش کی گئی جو ایک مجلس عمومی ایک مجلس تحفظ، ایک عدالت بین الاقوام، ایک معتمدی، ایک معاشی و معاشرتی مجلس، اور ایک فوجی کمیٹی پر مشتمل ہو۔

ڈمبرٹن اوکس کے خاکہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس تنظیم کا مقصد اقوام عالم کے باہمی دوستانہ روابط کو بڑھانا ہے، نیز اس میں موجودہ یا مجوزہ بین الاقوامی اداروں اور اقتصادی و معاشی مجلس کے مابین تعاون کی گنجایش رکھی گئی ہے۔ جہاں تک عام خاکے کا تعلق ہے امریکی رائے عامہ اس کے موافق ہے لیکن بعض امور کی وضاحت کا مطالبہ کیا گیا ہے، مثلاً مجلس تحفظ میں شریک رکن کے مفوضہ اختیارات کی وسعت کیا ہوگی یا کسی مستقل رکن کے جارحانہ اقدام کی صورت میں مجلس تحفظ کا طرز عمل کیا ہوگا۔

غذائی اور زرعی تنظیم:

اقوام متحدہ کی غذائی اور زرعی کانفرنس منعقدہ ہاٹ اسپرنگس ورجینیا

۱۹۴۳ء نے ایک عارضی کمیشن مقرر کیا تھا جس نے ڈمبرٹن اوکس کانفرنس کی افتتاح کے دوسرے ہی دن متحدہ اقوام کی غذائی اور زرعی تنظیم کے لیے ایک دستور پیش کیا۔ غذائی اور زرعی تنظیم کے وسیع مقاصد میں باشندگان عالم کے معیار تغذیہ اور معیار زندگی کو بڑھانا، عالمی معیشت کو ترقی دینا اور زرعی اشیا کی پیدائش و تقسیم کی اصلاح کرنا شامل ہیں اس کے قیام کی تحریک ایک مشاورتی اور صلاح کار ادارے کی حیثیت سے کی گئی ہے اور جب بیس (۲۰) یا اس سے زاید اقوام اس کے دستور سے اتفاق کر لیں گی تو اس کا قیام عمل میں آ جائے گا۔

شہری ہوا بازی کی کانفرنس:

تاریخ میں پہلی شہری ہوا بازی کی کانفرنس یکم نومبر کو شکاگو میں منعقد ہوئی۔ شکاگو وسطی مغربی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تجارت اور مالیات کا مرکز ہے اور مستقبل کی بین الاقوامی تجارت میں ایک ہوائی اسٹیشن کا درجہ رکھتا ہے۔
کانفرنس میں پانچ "ہوائی آزادیوں" کی تحریک کی گئی تھی۔ پہلا معاہدہ پہلی دو آزادیوں پر مشتمل تھا:-

۱۔ دنیا کی ہر کسی قوم کے متعینہ ہوائی راستوں پر پرواز کا حق۔
۲۔ فنی اسباب، مثلاً فراہمی ایندھن وغیرہ کے سلسلہ میں ہر کسی قوم کی سرزمین پر اترنے کا حق۔

بقیہ تین آزادیاں دوسرے معاہدہ کے اجزا ہیں:-

۳۔ مسافروں کو اپنے وطن سے دنیا کے کسی مقام تک جانے کا حق۔
۴۔ مسافروں کو دنیا کے کسی مقام سے ان کے وطن کو واپس

لانے کا حق۔

۵۔ تمام دُنیا میں نقل و حمل کے آزاد مقابلہ کا حق۔

کانفرنس کے اختتام پر یہ اندازہ کیا گیا تھا کہ کم سے کم چالیس اقوام پہلے معاہدہ کو، اور پچیس اقوام دونوں معاہدوں کو قبول کریں گی۔ ان دو دستاویزات کے علاوہ کانفرنس نے عبوری دور کے لیے ایک عارضی بین الاقوامی ہوابازی کی تنظیم کا معاہدہ مرتب کیا تھا۔ عارضی تنظیم کو اکیس (۲۱) نمایندہ اقوام کی ایک مجلس کی نگرانی میں دیا گیا ہے، اور جب تک "مستقل بین الاقوامی شہری ہوابازی کی تنظیم" اپنے فرائض انجام دینے کے قابل نہ ہو جائے یہ اپنی خدمات انجام دیتی رہے گی۔

کانفرنس کے اختتام سے قبل اڈلف۔ اے۔ برلے نے مختلف اجلاسوں کے فیصلوں پر نظرثانی کی۔ آپ نہ صرف امریکہ کے نایب وزیر مملکت اور امریکی مندوبین کے رہنما تھے بلکہ کانفرنس کے صدر بھی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"میں جرات کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ اس کانفرنس کی کارگذاری کو احترام کی نظروں سے دیکھے گی۔"

اُس نے تہذیب و شایستگی کی ایک نمایاں خدمت انجام دی ہے "فضائی سامراج" کا خاتمہ کر دیا ہے۔ آیندہ سے دُنیا میں جتنے "فضائی دساتیر" مرتب ہوں گے اُن سے تمام اقوام عالم واقف ہوا کریں گے۔ اس طرح خفیہ فضائی حکمت عملی کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔

(ماخوذ از "بلڈنگ فار پیس" از ہنری گراڈی)

تنقید و تبصرہ

"سیرِ افغانستان"

از سید سلیمان ندوی۔ صفحہ ۲۰۴۔ قیمت عا/۸/ کلدار۔
نفیس اکیڈمی۔ حیدر آباد (دکن)

یہ افغانستان کی سیر درہ خیبر کے خشک راستے سے شروع ہو کر چمن (کوئٹہ) کے سرسبز و شاداب حصہ پر ختم ہوتی ہے۔

سفر مختصر اور چند روزہ ہے لیکن مصنف نے راستے کی خوب تفصیلات بیان کی ہیں۔ معمولی باتوں کی تفصیلات سے جی اکتا جاتا ہے، لیکن جب تاریخی آثار سے متعلق تفصیلات پیش کی جاتی ہیں تو چونکہ فاضل مصنف مشہور مورخ اور محقق ہیں، اس لیے حقائق دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔

سفر کے حالات کے سلسلہ میں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور اسی قسم کے دیگر تفصیلات بیان کرتے ہوئے مصنف نے بار بار نماز پڑھنے کا بھی ذکر

کیا ہے۔ نماز کا ذکر اکثر منازل کی مصروفیات کے سلسلہ میں آگیا ہے۔ نماز کے بار بار ذکر کو پڑھ کر بعض بد باطنوں نے اس کو تقوے کا اظہار سمجھا ہے۔ حالانکہ یہ ہو سکتا ہے کہ انھیں لوگوں کو نماز کی ترغیب دینے کے لیے مولانا نے بار بار نماز کا ذکر کیا ہو۔ نماز ایک مسلمان کے لیے ایک ایسا وظیفۂ حیات ہے کہ اس سے کوئی گریز ہی نہیں ہے۔ اس لیے اس کا ذکر کرتے ہوے مولانا کے دل میں اس کا شبہ بھی نہیں گذرا ہوگا، ورنہ کوئی اپنی نیکی کو اپنے ہاتھوں برباد کرنے تیار نہیں ہو سکتا۔

اس سیر کی خاص بات تین ہم سفر حضرات کی شخصیات بھی ہیں یعنے مصنف کے ساتھ سید راس مسعود اور علامہ اقبال جیسے قابل لوگ تھے۔ سفر تو یقیناً پُر لطف رہا ہوگا، لیکن پڑھنے والوں کو اس صحبت سے محظوظ ہونے کا موقع نہیں ملتا، کیونکہ اس کی گفتگو کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اس کی تو ضرورت بھی نہیں تھی لیکن ایک بات کی تفصیلات معلوم کرنے کو جی چاہتا تھا۔ یعنے افغانستان کے تعلیمی حالات اور ان کی روشنی میں ان تین علما کی تجاویز۔ ان کا تذکرہ مصنف نے نہایت اجمال سے کیا ہے جس سے پڑھنے والوں کو تشفی نہیں ہوتی۔

بہر حال مجموعی طور پر کتاب ان لوگوں کے لیے دلچسپ ہے جو دل میں افغانستان کے سفر کی خواہش رکھتے ہیں، ورنہ دوسروں کے لیے سفر کی تفصیلات بجائے سیر کے تکان کا باعث بن جاتی ہیں۔ پڑھنا بھی ایسے ہی لوگوں کو چاہیے جو یا "دولت خداداد" کے سفر کا ارادہ رکھتے ہیں یا اس ملک کے حالات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور یقیناً ان لوگوں کے لیے یہ کتاب دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔

چھپائی اور جلد وغیرہ اچھی ہے جس کے لیے اکیڈمی

قابل مبارک باد ہے۔

سید معین الدین قادری

تعلیم کا مسئلہ

از۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب۔ قیمت ۸؍
اقبال اکیڈیمی۔ لاہور۔

ہمارا نظام تعلیم گہرے انقلاب کا محتاج ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ہماری تعلیم کا سرے سے کوئی نظام ہی نہیں، اس میں کوئی ایک بنیادی تصور کارفرما نظر نہیں آتا بلکہ ہم کیا چاہتے ہیں، اس کا خود ہم کو شعور نہیں۔ ایک تو یہ کہ ہماری موجودہ تعلیم کے خدوخال ہمارے اپنے نہیں ہیں بلکہ ہماری ضروریات اور ہماری ثقافت کے آئینہ دار ہونے کی بجائے دوسروں کی ضروریات اور سیاسی مصالح کی مرہون منت ہیں، لیکن آج تعلیمی مسئلہ نے قومی اہمیت اختیار کرلی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم تعلیم کے بنیادی تصوروں کا جائزہ لیں اور اس کی روشنی میں نئی تعلیم کی داغ بیل ڈالیں۔

تعلیم کی بھی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک صوری دوسری مادّی۔ مادّی نقطۂ نظر سے تعلیم کی تفصیلات اور جزویات کے متعلق ہم تجربہ کی روشنی میں بہت کچھ ردوبدل کرسکتے ہیں۔ ایسا نظام تعلیم جس میں اس قسم کے تغیرات کی گنجایش نہ ہو ناکارہ ہے۔ زندہ تعلیم نظام میں نئے نئے تطابقات پیدا کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے، لیکن بنیادی تصورات اقدار اور نصب العین کا تعین پہلے ہی ضروری ہے۔ اقدار کے مختلف عوالم ہوتے ہیں: مذہبی، جمالی، نظری، اخلاقی اور افادی اقدار، جن کے تحقق سے ثقافت بنتی ہے۔ ہر اچھے نظام تعلیم میں توجہ کے مطالب ہیں، اگر کسی نظام تعلیم کی بنیاد صرف افادی یا اخلاقی یا

مذہبی اقدار ہی پر رکھی جائے تو اس سے تعلیم کا توازن برقرار نہ رہ سکے گا، اور انسان کی ذہنی، روحانی اور جسمانی ترقی، جو یہی تعلیم کا مدعا ہے، مخصوص اقدار کے اس یکطرفہ تسلط کی وجہ سے حاصل نہ ہو سکے گی۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب نے بڑی ہمت سے تعلیمی مسایل پر قلم اُٹھایا ہے۔ آپ کے نزدیک فنونُ گو بہت قابل احترام ہیں، لیکن موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے سائنس کے مقابلہ میں یہ اتنی اہمیت کے مستحق نہیں۔ آپ کے خیال میں آج وہ قومیں ہی کامیاب ہیں جو قوائے فطرت پر قابو پاتی ہیں، اس لیے آپ نے سائنسی مضامین کی جبری تعلیم کی حمایت کی ہے۔ اسی سے ہماری صنعت کو فروغ ہوگا اور ہم ترقی کی راہ پر گامزن ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس یعنے طبعی علوم کلی طور پر توجہ کے مستحق ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم پورے ملک کو ایک ورک شاپ میں تبدیل کر دیں۔ یورپ میں بھی جہاں ایسے ممالک ہیں جنھوں نے طبعی علوم میں اور صنعت میں غیر معمولی ترقی کی ہے وہاں انفرادی اختلافات اور صلاحیتوں کی خاص طور پر رعایت بھی ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ سائنس اور فن کا یہ فرق خود غیر اصولی ہے، سائنس میں ایک طرف تو طبعی علوم شامل ہیں، اور ایسے علوم بھی جو بالکل جداگانہ نوعیت رکھتے ہیں، جیسے تاریخ عمرانیات وغیرہ، اور جن کو آرٹس کا نام دے دیا گیا ہے۔ ان تمدنی علوم پر نہ تو ریاضیاتی طریقہ سے اور نہ طبعی طریقہ سے سیر حاصل بحث ہو سکتی ہے۔ یہ علوم اپنی علحدہ دنیا رکھتے ہیں، ان کا طریق تحقیق بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے طبعی علوم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب نے اس کو تسلیم کیا ہے کہ جسمانی، ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کی مساوی طور پر آبیاری ہونی چاہئے اور اسی لئے آپ نے دینیات کی تعلیم کو بھی بہت ضروری خیال کیا، لیکن یہاں بھی ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارا دینیات کا تصور زیادہ وسیع ہو، ورنہ دینیات کی تعلیم سے روحانی

نشو و نما میں مدد ملنے کی بجائے مزید رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

ہمارے نظام تعلیم میں آرٹ اور سائنس کے غیر حکیمانہ تصور کی وجہ سے یہ غلط طریقہ بھی رائج ہو گیا ہے کہ ایک طالب علم طبعی اور تمدنی علوم کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل نہیں کر سکتا اور تخصیص کا عمل بھی بی۔ اے ہی سے شروع ہو جاتا ہے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک طالب علم حیاتیات اور عمرانیات یا فلسفہ اور ریاضیات یا نفسیات اور عضویات کی تعلیم کو ساتھ ساتھ کیوں جاری نہ رکھے اس کے تخصیص کا عمل صرف بی۔ اے کے بعد بھی شروع ہو سکتا ہے اور وہ بھی خاص حدود کے اندر۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلہ پر کافی توجہ کی ہے اور بڑی حد تک اپنے مجوزہ نظام تعلیم کی بنیادوں کو وسیع تصورات پر رکھا ہے۔

سیاسی بیداری نے آج تعلیم کے مسئلہ کو بہت نمایاں کر دیا ہے ہمارا نظام تعلیم افادی نقطۂ نظر سے، نیز علم و حکمت کے لحاظ سے بڑے سخت انقلاب کا محتاج ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش نہایت مستحسن ہے کہ انھوں نے ہماری تعلیمی مشکلات اور مسائل پر گہرے طریقہ پر سوچا ہے اور اس کا حل بھی بتلانے کی کوشش کی ہے۔ جب تک ہم اپنے نظام تعلیم کی از سر نو تعمیر نہ کریں گے ہمیں سوائے نام نہاد تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد بڑھانے کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

وحید الدین

ہمارا معاشی مسئلہ

مصنفہ واڈیا اور مرچنٹ۔ دوسرا ایڈیشن۔ ۴۷۰ صفحات قیمت ۱۲روپیہ ۸ر
ناشر نیو بک کمپنی۔ بمبئی۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن جولائی ۱۹۴۵ء میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا عنوان "اورز اکنامک پرابلم" رکھا ہے۔

اسی عنوان کے ذریعہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا سب سے اہم اور مرکزی معاشی مسئلہ صرف ایک ہے ـــــ یعنے غربت یا ادنیٰ معیار زندگی! لیکن اس ایک مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بہت سے ضمنی اور ذیلی معاشی مسائل کو حل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں ہندوستان کے چند ایسے معاشی مسائل پر بحث کی گئی ہے جن کے ذریعہ یہاں کی غربت کے مسئلہ کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ہندوستان کے قدرتی وسائل ۔ معاشری حالات ۔ ہندوستانی آبادی ۔ زراعت ۔ صنعت ۔ قومی آمدنی ۔ قومی صَرف اور قومی معاشی تنظیم اس کتاب کے بنیادی مباحث ہیں ۔

ہندوستان کے گوناگوں قدرتی وسائل پر بحث کرتے ہوئے مصنفین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ قدرت نے ہندوستان کو مختلف ذرائع معاش عطا کرنے میں فیاضی سے کام لیا ہے لیکن یہاں کے باشندوں نے ان عطیات سے پورے طور پر استفادہ نہیں کیا ـــــ اور یہی اُن کی غربت یا ادنیٰ معیار زندگی کا ایک اہم سبب ہے ۔ اگر ملک کے وسائل سے پورے طور پر فایدہ اُٹھایا جائے تو قومی آمدنی میں نمایاں اضافہ ہو سکتا ہے ۔

معاشری حالات پر بحث کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی ہے کہ معیشت اور معاشرت ساتھ ساتھ ہیں ۔ انسانی زندگی کے یہ دو اہم شعبے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے اور ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں ۔ کسی ایک شعبے کی کامیاب اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ حالات کی مناسبت سے دوسرے شعبے میں موافق تبدیلی نہ کی جائے ۔ لہذا ہندوستان کے معاشی حالات کی اصلاح کرتے وقت یہاں کے معاشری حالات اور خاص خاص سماجی خصوصیات کو کسی طرح نظر انداز نہ کرنا چاہیئے ۔

ہندوستانی آبادی کے مسائل کو کافی جگہ دی گئی ہے ۔ وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ

دولت کی پیدائش کے لئے دو عوامل خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں: (i) قدرتی وسائل اور (ii) آبادی۔ ہندوستان کے قدرتی وسائل خواہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں اگر یہاں کی آبادی کی قوت پیدا آوری اور کارگزاری ناقص ہو تو معاشی خوش حالی کا مسئلہ اچھی طرح حل نہ ہو سکے گا۔ لہذا ہندوستان میں خوش حالی کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک طرف یہاں کے قدرتی وسائل کی تحقیق ضروری ہے تو دوسری طرف آبادی کے مسائل کا حل بھی لازمی ہے۔ آبادی کے مسائل کے لئے تین ابواب وقف کئے گئے ہیں اور ان میں آبادی کی تعداد اور اُس کی کارگذاری کے مسئلہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ان ابواب کے آخری حصے میں "کثرت آبادی" کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ہندوستان میں "آبادی کی کثرت" ہے۔ مسئلہ آبادی کو حل کرنے کے لئے تین تجویزیں پیش کی گئی ہیں: (i) بیرون ہند آبادی کی ایک مقررہ تعداد کی منتقلی یا اندرون ہند آبادی کی بہتر تقسیم (ii) دولت کی پیدائش میں اضافہ اور (iii) آبادی کی تحدید۔ پہلی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے متعلق بہت ہی قنوطیت کا اظہار کیا گیا ہے، کیونکہ دنیا کا ہر ملک "قومیت" کا راگ الاپ رہا ہے اور ہندوستانی صوبوں کے سر پر "صوبہ واریت" کا بھوت سوار ہے۔ البتہ دوسری دو تجویزوں پر عمل کرنے کے متعلق بہت زور دیا گیا ہے۔ مسئلہ آبادی کو حل کرنے کے لئے آخری دو تجویزیں ایک سے زاید ہندوستانی معاشئین کی جانب سے پیش کی گئی ہیں۔ لیکن اب تک ان پر موثر طریقے سے عمل نہیں کیا گیا۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف دولت کی پیدائش میں اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری طرف آبادی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ باشندوں کا معیار زندگی بلند ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ شہروں میں متوسط اور اعلیٰ طبقوں کی حد تک تھوڑی بہت موافق تبدیلی نظر آتی ہے لیکن دیہی آبادی کا معیار زندگی اب بھی عام طور پر تقریباً ویسا ہی ہے جیسا کہ مغلیہ دور میں یا اُس سے کچھ پہلے تھا۔ ہندوستانی غربت کے مسئلہ کی اصلاح میں

یہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی بڑی رکاوٹ کا باعث ہے مصنفین نے مسئلہ آبادی کے حل کے متعلق جو تجویزیں پیش کی ہیں وہ ہماری خاص توجہ کے مستحق ہیں۔

آبادی کے مسائل کے بعد ہندوستان کے زرعی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ ہماری زراعت کا سب سے اہم مسئلہ ادنیٰ زرعی آمدنی کا ہے ہندوستانی کاشتکار کو اس قدر کم آمدنی ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنی ضروری احتیاجات کی تکمیل بھی پورے طور پر نہیں کرسکتا، لہٰذا اس کی زندگی قرض میں بسر ہوتی ہے۔ اس کتاب میں زراعت کے لئے دس ابواب مختص کئے گئے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے نظام زراعت کی گوناگوں خرابیوں پر بحث کی گئی ہے اور اُن کی اصلاح کی تدبیریں بتائی گئی ہیں تاکہ کاشتکاروں کی آمدنی میں اضافہ ہو اور اُن کی زندگی خوش حال ہوسکے۔

زراعت کے بعد آئندہ بارہ ابواب میں ہندوستان کے صنعتی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندوستان کی پچھلی صنعتی عظمت ـــــ اس کی موجودہ صنعتی حیثیت اور آئندہ صنعتی ترقی کے امکانات پر بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ مصنفین کی بحث کا وہ حصہ (صفحات ۴۸۹ تا ۵۰۳) جس میں "ہندوستان کی صنعتیت" کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ ابتداً اُس کتب کے خیال کو پیش کیا گیا ہے جو ہندوستان کو صنعتی ملک بنانے کا طرف دار نہیں۔ اس کے بعد مذکورہ کتب کے خیال کی تردید کرتے ہوئے ہندوستان میں "صنعتیت" کی حمایت کی گئی ہے۔

کتاب کے آخری تین ابواب، ترتیب وار قومی آمدنی، قومی صَرف اور قومی معاشی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان ابواب میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں فی کس آمدنی بہت کم ہے۔ اسی لحاظ سے صَرف کا معیار بھی گرا ہوا ہے، اور اس معیار کو بلند کرنے کے لئے کس قسم کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں "بمبئی پلان" اور "پیپولز پلان" پر بھی بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب کے متعلق بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے معاشی مسائل پر ابتک جتنی کتابیں تدریسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں ان میں یہ کتاب ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مواد نہایت مستند ذرائع سے اخذ کیا گیا ہے اور طرز بیان بہت سادہ ہے۔ مصنفین نے اس کی طباعت کے ذریعہ اساتذہ اور طلبائے معاشیات کے لئے بڑی سہولت بہم پہنچائی ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلہ کی دوسری جلد جس کا پیش لفظ میں ذکر کیا گیا ہے، جلد شائع ہوگی۔ ہندوستان کے جن اہم معاشی مسائل کے متعلق اس جلد میں بحث نہ ہو سکی، دوسری جلد میں شامل کئے جائیں گے۔

اگر زیر تبصرہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو تو ابواب کی موجودہ ترتیب میں تھوڑی سی تبدیلی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قومی آمدنی اور قومی صرف کے مباحث کو کتاب کے آخری حصے میں جگہ دی گئی ہے حالانکہ ان مباحث کو سب سے پہلے رکھنا چاہئے کیونکہ یہی مسائل اس کتاب کے دوسرے تمام مباحث کا مرکز ہیں۔ اگر پہلے مرکزی مسئلہ پر بحث کی جائے اور اس کے بعد اس ضمن میں جتنے ذیلی مسائل نکل آئیں ان پر علاحدہ ابواب میں سلسلہ وار بحث کی جائے تو بہتر ہے۔ اسی طرح سب سے آخری باب میں معاشی منصوبہ بندی پر جو بحث کی گئی ہے وہ اپنی موزوں جگہ پر نہیں معلوم ہوتی۔ اس بحث کو دوسری جلد (جس کے شائع کرنے کے متعلق پیش لفظ میں خیال ظاہر کیا گیا ہے) کے آخر میں رکھنا مناسب ہے۔

معاشی اور تجارتی مضامین:

مصنفہ اے۔ این۔ اگروالا اور ایس۔ این۔ اگروالا۔ دوسرا ایڈیشن۔ ۳۴۳ صفحات۔ قیمت ۳ روپے۔ ناشر کتاب محل۔ الہ آباد۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۴۱ء میں شائع کی گئی تھی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۸ء میں

شائع کیا گیا ہے۔ اس میں جملہ ۱۴ چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں جن میں ۸ معاشی مضامین ہیں اور آٹھ تجارتی۔ معاشی مضامین میں ہندوستان کے چند اہم عصری مسائل مثلاً زراعت، صنعت، آبادی، زر، بنک کاری، مالیات، معیار زندگی، بے روزگاری اور منصوبہ بندی کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ تجارتی مضامین میں چیزوں کی فروخت، اشتہار، بیمہ، تجارت کی تعلیم، علم تجارت کی اہمیت، ہندوستان میں ریلیں، ساحلی تجارت اور "مینیجنگ ایجنسی سسٹم" سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہ صرف مختصر نہیں بلکہ ان میں ہر عنوان کے متعلق ضروری مواد بہت قرینے سے پیش کیا گیا ہے۔ معاشیات اور تجارت کے طالب علم تو بہت آسانی سے ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں لیکن عوام کے لئے جو اہم عصری معاشی اور تجارتی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں، یہ مضامین خاص طور پر مفید ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں معاشیات کی تعلیم کا انتظام ہر اہم جامعہ میں ہو چکا ہے، مگر اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ اب بھی ملک میں ایسے لوگوں کی بہت کمی ہے جو معاشیات کے نظری اور عملی مسائل کے متعلق ضروری معلومات رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ دور حاضرہ کے اہم معاشی مسائل کے متعلق اہل قلم کی جانب سے چھوٹے مضامین شائع کئے جائیں۔

مصنفین نے ان مضامین کی اشاعت کے ذریعہ طلبائے معاشیات اور تجارت اور بالخصوص قارئین کے لئے بہت اچھی علمی خدمت انجام دی ہے۔

امید ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اسی قسم کی اور کتابیں شائع